خواتین

کے سلسلے میں

راہِ اعتدال

شیخ محمد الغزالی

نام کتاب:	خواتین کے سلسلے میں راہِ اعتدال
مؤلف:	شیخ محمد الغزالی
مترجم:	الیاس نعمانی ندوی
کمپوزنگ:	
صفحات:	۳۰۷
قیمت:	

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

مقدمہ	۹
باب اول: آیئے! پہلے اسلام کو سمجھیں	۱۷
سچے عقیدہ کا سرچشمہ	۱۹
مسلم خاتون کی تصویر سنواریے	۲۳
فقر و جہالت کی اسیر	۲۶
اسلام خاندان کا محافظ ہے	۳۱
علماء کی ذمہ داری	۳۳
اہل مذاہب کا غرور	۳۷
یہ کس کی خاطر بولتے ہیں؟	۴۰
نادان دوستوں کی نادانی	۴۳
عورت کا کردار گم گشتہ	۴۶
مساواتِ مرد وزن قرآن سے ثابت ہے	۴۹
کاموں کی نوعیت کا لحاظ لازمی ہے	۵۵
آیئے! معاشرہ کو پاکیزہ بنائیں	۵۹
جنسی بم کا خطرہ	۶۳
اسلام دیارِ غیر میں	۶۶
ایک مارکسسٹ سے کی گئی گفتگو	۷۰

باب دوم: فراموش کردہ ماضی ۷۳
کیسی باعزت تھی عورت؟ ۷۵
کیا اسلام نے عورت کو بے جا حقوق دیے ہیں؟ ۷۸
ماں کی آغوش ایک تعلیم گاہ ہے ۸۱
قدیم جاہلیتیں ۸۳
عرب جاہلیت دیگر جاہلیتوں سے بہتر تھی ۸۶
عورت عہد انحطاط میں ۸۹
عورت کی بابت صحیح اسلامی موقف ۹۲
اسلام کو بدنام کرنے والی روایات ۹۵
ازواج مطہرات (۱) ۹۸
ازواج مطہرات (۲) ۱۰۵
ہماری خواتین کیا کریں؟ ۱۱۲
ہزار مردوں پر بھاری ایک عورت ۱۱۸
دونادر خواتین ۱۲۳
حضرت عائشہ بطور ادیب ۱۲۶
عورت میدان علم وادب میں ۱۲۹
جھوٹے نبی کے مقابلے میں ۱۳۳
قانونِ ''حمد'' ۱۳۵
باب سوم: آیئے! گھر سے آغاز کریں ۱۴۱
شادی عبادت ہے ۱۴۳
شادی سوچ سمجھ کر کیجئے! ۱۴۶

شادی کے لازمی قواعد ۱۴۹
شادی: نشان راہ ہے منزل نہیں ہے ۱۵۲
مرد و زن کے درمیان تعلقات کا تنہا راستہ ۱۵۵
اہل خانہ پر خرچ کرنے کا ثواب ۱۵۷
خاتون کی ذمہ داری کو حقیر نہ سمجھئے! ۱۶۲
شوہر سے محروم ۱۶۶
آبرو کا تقدس ۱۶۹
گھروں کی بنیاد محبت پر ہوتی ہے ۱۷۴
مردوں اور عورتوں کی قربانیاں ۱۸۰
گھر کا کردار ۱۸۳
عصر حاضر کے والدین ۱۸۹
صلہ رحمی ایمانی اعمال میں سے ہے ۱۹۴
عمل نہ کہ تعداد ۲۰۰
ہماری طبیعتوں کے مسخ ہونے کی نوعیت ۲۰۳
دین کی بابت تھپڑ اور ہمارے نظریات ۲۰۵
ایڈز اور ہم جنسی پرستی کی آزادی ۲۰۸
نشہ کی وبا ۲۱۰
باب چہارم: قابل اصلاح غلط فہمیاں ۲۱۳
قوامیت کا مطلب غلبہ و استبداد نہیں ہے ۲۱۵
عورت اپنے شوہر کے انتخاب میں آزاد ہے ۲۲۱
عورت کا سفر ۲۲۴
چہرے کا پردہ واجب نہیں ہے ۲۲۷

عورت کی آواز کا پردہ-ایک برخود غلط پروپیگنڈہ	۲۳۰
دین داری کا مطلب رائی کو پہاڑ بنانا نہیں ہے	۲۳۳
ایک امام کی نغمہ سنجی	۲۳۶
خواتین کی فوجی تربیت اور فوج میں ان کی شمولیت	۲۳۹
گھروں کی تباہی کے خواہاں	۲۴۱
مسئلہ بیویوں کی پٹائی کا	۲۴۴
''خانۂ طاعت'' ایک غلط اجتہاد	۲۴۹
طلاق کو بہت جلد واقع قرار دینے کا رویہ	۲۵۴
طلاق: رشتۂ ازدواج کا عارضی التوا	۲۶۰
چند رسمیں جن کو چھوڑنا لازمی ہے	۲۶۴
عورتوں کے کپڑے	۲۷۰
غلط طرز فکر	۲۷۶
خواتین کو مسجد آنے سے نہ روکیے	۲۷۸
کیا یہ لوگ جاہلی شریعت کے خواہاں ہیں؟	۲۸۳
مغربی خواتین سے شادی	۲۸۶
کمزوروں کے بچے برائے فروخت	۲۸۹
مسلم یتیم بچے	۲۹۲
بھائی چارگی نہ کہ گود لینا	۲۹۵
مسئلہ جنین کی جنس تبدیل کرنے کا	۲۹۸
پڑوسی کے حقوق کا خیال رکھئے!	۳۰۲
گمراہ فن کار	۳۰۵

مقدمہ

انگلینڈ میں رہائش پذیر کچھ مسلمانوں نے وہاں کی حکومت سے خالص اسلامی اسکولس قائم کرنے کی اجازت چاہی۔ یہ ایک معقول مطالبہ تھا، عالم اسلام میں ہم دیکھتے ہیں کہ غیر ممالک سے آکر آباد ہونے والے لوگ اپنے مخصوص اسکول قائم کرتے ہیں، جن میں وہ دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ اپنے دین اور اپنی زبان کی بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں، لیکن کچھ انگریزوں نے اس مطالبہ کی مخالفت کی، اوران اسکولوں کے قیام کواس بنیاد پر غلط کہا کہ یہ لڑکوں اورلڑکیوں کے درمیان تفریق برتیں گے۔

ان لوگوں نے اسلام پرعورتوں اورحقوق نسواں کا مخالف ہونے کاالزام لگایا۔

لیکن روزنامہ Times کے مطابق: ''برطانیہ کی لیبر پارٹی نے اس درخواست کی حمایت کی، پارٹی کے امورتعلیم کے ترجمان مسٹر جیک اسٹرانے ان اسکولوں کے قیام پراعتراض کرنے والوں کو غلط اورنسل پرست کہا، انہوں نے ان لوگوں کو اسلام سے ناواقف بھی بتایا'' ....

''انگلینڈ میں اسلامی تعلیم کا مستقبل'' کے عنوان پرلندن میں ہونے والی ایک کانفرنس میں مسٹر جیک اسٹرانے کہا: عورت کے تئیں مسلم معاشرہ کے رویہ کا ایسا گہرا مطالعہ کرنا ضروری ہے جس میں اصولوں پر نظر کی جائے، میں نے اس طرح کے دعوے بہت سنے ہیں کہ اسلام عورت مخالف ہے، ایسے دعوے کرنے والوں کی اصل بنیاد یہ ہے کہ مسلم خواتین دینی دعوت میں سرگرم اور مساجد میں بطور خطیب نظر نہیں آتی ہیں، جس طرح مسلم معاشرہ میں مردوں نے سیاسی میدان پر قبضہ کررکھا ہے، اسی طرح اس (دینی دعوت کے) میدان میں بھی ان کا ہی تسلط ہے۔

انھوں نے مزید کہا: اسلام وتاریخِ اسلام میں عورت کے کردار کی بابت تقریباً مکمل ناواقفیت پائی جاتی ہے، اور غور وفکر کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ماضی میں مسلم خاتون کے حالات عیسائی ویہودی خاتون سے بہتر تھے۔............

''پھر محمد (ﷺ) نے برطانوی حکومت سے تیرہ صدیاں قبل عورت کو تمام مملوکہ اشیاء کا وارث بنایا تھا.....''

میں نے لیبر پارٹی کے ترجمان کا اس اچھے دفاع کے لئے شکریہ ادا کیا، اگرچہ برطانوی میڈیا نے اسے انتخابی ہتھکنڈا اور کنزرویٹیو پارٹی کے حامیوں میں نقب لگانے کی کوشش قرار دیا۔

میں اس موضوع پر سردست مختصر گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ میں اپنی ایک اور کتاب (مستقبل الاسلام خارج ارضہ) میں اس پر تفصیلی روشنی ڈال چکا ہوں۔

اسلام پر عورت کی توہین اور اسے حقیر قرار دینے کا الزام لگایا جاتا ہے.....تو کیا کتاب وسنت میں ایسا کچھ ہے جس کی بنیاد پر یہ اعتراض ہو؟؟ قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی صورت میں موجود ہے، اس میں ایک حرف کی بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے، اور وہ دوٹوک انداز میں یہ بتاتا ہے کہ انسانیت کے دو بازو ہیں: عورت اور مرد، ان میں سے کسی ایک بازو کے بھی ٹوٹنے کا مطلب ہے: انسانی کارواں کا رک جانا اور ختم ہوجانا۔

اب ہم سنت (حدیث) کا اس اعتبار سے مطالعہ کریں، اور اس میں جو غلط روایتیں داخل کردی گئی ہیں انہیں ہٹادیں تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ:

جس غلطی کی تہمت اسلام پر لگائی جارہی ہے وہ احادیث میں نہیں اسلام کے نام لیواؤں میں ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے وصیت کی تھی کہ عورتیں مساجد بے خوشبو لگائے اور باپردہ انداز میں جائیں، لیکن قسطلانی بخاری کی اپنی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ عورت کو مساجد ان کپڑوں

میں جانا چاہئے جنہیں پہن کر وہ باورچی خانہ کا کام کرتی ہیں اور جس میں کھانے کی بوبسی ہوئی ہوتی ہے۔

جب کہ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ عورت کبھی بھی مسجد نہیں جاسکتی، خدا جانے ان دونوں آراء کے حاملین میں سے کون اسلام کے لئے زیادہ ضرر رساں ہیں......؟

بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مردوں کو عورتوں کو سلام کرنے کی اجازت دی ہے، بخاری کی ا یک روایت میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ یہ جبرئیل تمہیں سلام کرر ہے ہیں، اور حضرت جبرئیل اس وقت ایک مرد کی صورت میں تھے۔

اس کی تاویل لوگ یہ کردیتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب فتنہ نہیں تھا، یا یہ حکم محرم عورتوں، یا بوڑھی عورتوں یا باندیوں کے ساتھ خاص ہے۔

اگر چہ متعدد احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرد عورتوں کو سلام کرسکتے ہیں اور عورتیں مردوں کو سلام کرسکتی ہیں، لیکن شراح کی پوری کوشش رہی ہے کہ کسی طرح اس پر عمل موقوف قرار دے دیا جائے، جوں جوں زمانہ آگے بڑھا ان شرحوں کے اس رجحان میں مزید طاقت آتی گئی، یہاں تک کہ اصل حکم پیچھے چلا گیا اور اس کی جگہ اس کی برخود غلط تشریح نے لے لی۔

ہر زمانہ میں کچھ ایسی نمایاں عالم وفقیہ خواتین پائی جاتی رہی ہیں، جو اپنے گھروں کو خیر سے بھری ہوئی مسجدیں بنانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

ایسی ہی ایک خاتون حضرت ام ورقہ تھیں، جن کی بابت صنعانی نے حدیث نمبر: ۳۹۲ میں نقل کیا ہے کہ ''انہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل خانہ کا امام نامزد کیا تھا۔''

وہ غزوۂ بدر میں شرکت کرنا چاہتی تھیں، لیکن آپ نے ان کی اس درخواست کو قبول نہ فرمایا، اس موقع پر آپ ﷺ نے ان کے لئے ایک مؤذن بھی مقرر کیا جو اذان دیا کرتا تھا، صنعانی کہتے ہیں: بظاہر حضرت ام ورقہ اپنے مؤذن اور اپنی باندی کی امامت فرمایا کرتی تھیں۔

عورت کے ذریعہ مردوں کی امامت کئے جانے کو ابوثور، مزنی اور طبری نے صحیح قرار دیا ہے، لیکن جمہور اس رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔

ہمارا اپنا ذاتی رجحان یہ ہے کہ یہ مخصوص صورت حال تھی، اس لئے کہ ان صحابیہ نے پورا قرآن یاد کرلیا تھا، ورنہ مساجد میں امامت کے مستحق صرف مرد ہی ہیں۔

اس موقع پر ہم ایک اہم پہلو کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہیں گے، جس کا سامنا مسلمانوں کو انگلینڈ اور دیگر ممالک میں اپنے مخصوص اسکولس قائم کرنے کے بعد کرنا پڑے گا، اور وہ یہ کہ ان اسکولوں کے ذمہ دار طالبات کو نقاب کا پابند کریں گے؟

اگر ایسا ہوا تو یہ عمل دعوت اسلامی کے خاتمہ کے مترادف ہوگا، اور پھر مستقبل میں کوئی بھی شخص اس دین میں داخل ہونا نہیں چاہے گا۔

یورپ کے باشندگان راہبات کے لباس کو اچھا لباس تصور کرتے ہیں، اور یہ لباس ہمارے شرعی حجاب سے قریب تر ہوتے ہیں۔

اگر ہم نے اس حجاب کو اختیار کیا تو ہم اپنے دین کے ساتھ انصاف کریں گے، اور حق کے جویاؤں کو اس دین میں داخل ہونے پر آمادہ کریں گے۔

دستانوں میں ہاتھ چھپانے، نقابوں کے پیچھے چہرے چھپانے اور اس طرح عورت کو دنیا سے بالکل بے تعلق کرنے کا حکم تو ہمارے دین نے دیا نہیں ہے۔

بلکہ ایسا کرنے سے وہ تمام تہمتیں ہم پر لگیں گی جن کی تردید لبیر پارٹی نے کی ہے۔

برقعہ کو واجب کہنے والوں سے ہمارا سوال ہے کہ: آپ کو معلوم ہے کہ اکثر مفسرین، محدثین اور فقہاء آپ کی رائے کی جانب رجحان نہیں رکھتے ہیں، تو پھر آپ اسلام کی اہم تر مصلحت کے حصول اور خطرناک ضرر سے حفاظت کے لئے اپنی اس رائے سے دست بردار کیوں نہیں ہوسکتے ہیں؟

میں ڈاکٹر عمر نا صیف (سربراہ رابطۃ العالم الاسلام) کو ان نہایت ممتاز وتقوی شعار داعیوں میں شمار کرتا ہوں جنہیں دعوت اسلامی کو درپیش رکاوٹوں کا بخوبی علم ہے۔

تو کیا ایسا ذہین آدمی بھی دینی مراجع کی روشنی میں زیادہ بہتر طرز عمل اختیار نہیں کرسکتا ہے، تا کہ تمام محنتیں اقامت صلاۃ، ایتاء زکاۃ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر لگائی جاسکیں؟

عصر حاضر میں کچھ ایسے تنگ ذہن وتاریک خیال نوجوان وبوڑھے پائے جاتے ہیں جو صرف اپنی رائے کو ہی صحیح تصور کرتے ہیں، ان کے نزدیک دوسرے کی رائے نا قابل قبول ونا قابل وجود ہوتی ہے، یقیناً یہ لوگ خوارج کا ایک نیا روپ ہیں۔

مجھے میرے ایک ذہین شاگرد نے ایک غالی دین دار شخص سے کی گئی اپنی گفتگو سنائی، یہ شخص (اپنے خیال میں) جماعت اہل حدیث کا ایک فرد تھا۔اس شخص نے اس سے دریافت کیا کہ: کیا تم ان لوگوں میں سے ہو جو دیواروں پر تصویریں لٹکاتے ہیں، اور اخباروں میں تصویروں کی اشاعت کو صحیح قرار دیتے ہیں؟ اس نے کہا: ہاں، یہ سن کر وہ بولا، پھر تم حدیث میں وارد اس وعید کے حق دار ہو کہ: ''قیامت کے دن سخت ترین عذاب مصورین کو ہوگا''، اس لئے کہ تم بھی مصوروں کی حوصلہ افزائی اور مدد کے مرتکب ہو۔

ہمارے شاگرد نے اس سے کہا: ہمارے نزدیک یہ حدیث اسٹیچو بنانے والوں سے متعلق ہے، کاغذ پر تصویر بنانے والوں سے متعلق نہیں، اور میں اس مسئلہ کی بابت آپ سے کوئی بحث ومباحثہ کرنا نہیں چاہتا ہوں، میں تو آپ کو بس یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بہت سے شرعی احکام وشعائر عصر حاضر میں متروک ہوگئے ہیں، ان کی جانب از سر نو توجہ کرنے پر ہم سب کا اتفاق ہے، آیئے ہم آپ کی رائے کے حاملین اس جانب توجہ کریں، اور اختلافی موضوعات میں بحث ومباحثہ کا رویہ ترک کردیں۔

اس پر اس شخص نے جواب دیا، ہم تمہارا ساتھ نہیں دے سکتے، ہمیں دینی اعتبار سے تم پر بھروسہ نہیں، بلکہ تم اور دشمنان اسلام ہماری نگاہ میں یکساں ہیں............

جب میرے شاگرد نے مجھے یہ قصہ سنایا تو میں نے کہا: یہ شخص غلط اجتہاد کا شکار ہے، اور تعصب نے اسے دوسری آراء پر غور وفکر کرنے کے قابل نہیں چھوڑا ہے، امید ہے کہ ایک دن اس کی آنکھیں کھل جائیں گی اور اسے حق کی توفیق ملے گی، لیکن ایسے لوگوں کے بارے میں مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں نادانستہ طور پر باطل قوتیں انہیں استعمال نہ کرلیں۔

ہمارے ممالک میں موجود دشمنان اسلام کے ماہر وذہین وفطین ایجنٹس جانتے ہیں کہ اگر حقیقت دین کا فہم رکھنے والے لوگوں کو میدان صاف مل گیا تو یقیناً وہ ہی فاتح ہوں گے، اس لئے وہ ہزار تدبیریں اس بات کی کرتے ہیں کہ اسلامی محاذ پر غلبہ ایسے ہی غلو پسندوں کی فکر ودعوت کا رہے، تا کہ عقل مند لوگ ایسے لوگوں کی باتیں سن کر مکمل دینِ اسلام ہی سے دست بردار ہوجائیں۔

الجزائر میں اسلام پسندی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی، اور اس کا مستقبل نہایت روشن نظر آرہا تھا، لگتا تھا کہ قدیم استعمار کے سارے اثرات ختم ہوجائیں گے، بے حیائی کی جگہ حیا لے لے گی، تہذیبی ارتقاء پر اسلام کا غلبہ رہے گا، اور اس طرح تہذیب آزادی، خیر اور تمام حقوق انسانی سے بہرہ ور ہوجائے گی۔

تبھی اچانک کچھ لوگ نقاب وجلباب کے لازمی ہونے کی مجنونانہ دعوت دینے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اسلام اور اسلامی بیداری سے ڈر محسوس کرنے لگے، وہ اس سلسلہ میں معذور تھے، اور پھر اسلام پسندی کا وہ کارواں جو سبک گامی کے ساتھ بڑھتے چلا جارہا تھا اس کے قدم پیچھے کو مڑ گئے۔

یہ تو افریقہ کی مثال تھی، ایشیا کا حال بھی کچھ دیگر نہیں ہے، اکثر غیر عرب مسلمان (جو

مسلمانوں کی اکثریت ہیں) فقہ حنفی اور فقہ شافعی کے متبع ہیں، یہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہنے والے حضرات ان دونوں مسالک پر اعتراضات کرتے ہیں، اور امام ابوحنیفہ وامام شافعی کی توہین کرتے ہیں، اور اس طرح فتنے اٹھتے ہیں، امت تفرقہ کا شکار ہوتی ہے، ایسی علمی بحثوں اور اس کردار کے ساتھ ہماری ملت کا مستقبل یقیناً تاریک ہے۔

ان نام نہاد علمبرداران سنت کو میری نصیحت ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنی امت کے سلسلے میں اللہ سے ڈریں...... امت کو جمع کریں، اسے فرقوں میں تقسیم نہ کریں، اور اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے بجائے احیاء اسلام کی کوشش کریں کہ مسلمانوں کو صدیوں سے فقہی اختلافات کا سامنا ہے۔

یہ کتاب عورت، خاندان اور چھوٹے معاشرہ سے متعلق مسائل کے حوالے سے تحریر کی گئیں چند ایسی مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے جو علم، ادب، نقد، تاریخ اور ماضی وحال کے فتووں کی جامع تھیں۔

ہمارے نزدیک یہی طریقۂ کار ہماری امت کی ثقافت کے جویا کے لئے زیادہ مفید اور اسلام کو نئے انداز میں پیش کرنے کا صحیح اسلوب ہے، اس لئے کہ خالص فقہی طرز تحریر خشک ہوتا ہے، لہذا ایسے مسائل کو اس انداز میں پیش کرنا چاہئے کہ اس میں دلچسپی کا سامان پیدا ہو۔

یہ تحریریں متعدد اخبارات میں شائع ہوئی تھیں، مناسب معلوم ہوا کہ انہیں ایک مختصر کتاب کی صورت میں پیش کردیا جائے، اللہ کی ذات سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو مفید اور راہ حق کی مؤید بنائے، نیز اسے قبولیت سے نوازے۔

محمد الغزالی

باب اوّل

آیئے ! پہلے اسلام کو سمجھیں

سچے عقیدہ کا سرچشمہ

انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی خداوند قدوس کی نشانیوں پر غور وفکر کرتے وقت میں حقیقت سے وابستہ اور خیالات سے گریزاں رہتا ہوں، اس کے نتیجہ میں جسامت کے اعتبار سے بڑی اور چھوٹی نشانیاں یکساں ہوتی ہیں، نہایت بڑی جسامت کی حامل نشانی میں اگر عظمت نظر آتی ہے تو بہت چھوٹی نشانی کا وجود بھی نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

ایک کے عدد کے داہنی جانب اگر بیس صفر لگا دیجئے تو وہ ایک بہت بڑا عدد بن جائے گا، یہی ایک کا عدد اگر (ریاضی کی اصطلاح میں) اعشاریہ اور بٹے کے نظام (decimal fraction & common Fraction) میں استعمال ہو تو نہایت حقیر عدد بن جائے گا۔

اسی لئے مجھے جراثیم میں بھی ستاروں جیسی ہی اللہ کی نشانیاں محسوس ہوتی ہیں، ایک کے لئے جہاں ایسی دوربین کی ضرورت ہوتی ہے، جو چیزوں کو بڑا کر کے دکھائے (Microseope) تو دوسرے کے لئے اس دوربین کی ضرورت ہوتی ہے جو دور کی چیزوں کو قریب کر کے دکھادے (Telescope)۔

بسا اوقات میں اللہ کی ایسی ہی کسی نشانی کو دیکھ کر یونہی گزر جاتا ہوں، پھر بعد میں اس کا خیال آتا ہے، مثلاً میں نے الجزائر میں ایک پہاڑ دیکھا جو ''الف'' جیسا تھا، اور بہت اونچا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے گر پڑے گا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد میرے ذہن میں پھر یہ پہاڑ آ گیا، میں نے خود سے پوچھا کہ کیا یہ واقعی گرا چاہتا ہے، دل نے جواب دیا: نہیں! یہ ایسے ہی اس وقت تک کھڑا رہے گا، جب تک اللہ کا حکم نہ ہو جائے، اور وہ صورت نہ پیش آ جائے جس کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے:

"یسئلونک عن الجبال فقل ینسفها ربي نسفا فیذرها قاعا صفصفا لا تری فیها عوجا ولا أمتا'' (یہ لوگ تم سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہوکہ میرا رب ان کو دھول بنا کراڑا دے گا اور زمین کو ایسا ہموار اور چٹیل بنادے گا کہ تم اس میں کوئی بل اور سلوٹ نہ دیکھوگے)۔

اسی طرح کے خیالات میرے ذہن میں اس وقت بھی آتے ہیں، جب میں فضاے بعید میں سرگرداں لاکھوں کروڑوں سورجوں اور سیاروں کے بارے میں سوچتا ہوں، یہ سورج بھی ہمارے سورج کی طرح طلوع وغروب ہوتے ہیں، ایسے اربوں سیارے ہمہ وقت سرگرم سفر رہتے ہیں، ایک لمحہ کو بھی نہیں ٹھہرتے، بالکل ویسے ہی جیسے ان کے بارے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان کیا ہے:"والنازعات غرقا والناشطات نشطا والسابحات سبحا فالسابقات سبقا فالمدبرات أمرا'' (قسم ہے ان فرشتوں کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں، اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں، اور [ان فرشتوں کی جو کائنات میں] تیزی سے تیرتے پھرتے ہیں، پھر [حکم بجالانے میں] سبقت کرتے ہیں، پھر [احکام الٰہی کے مطابق] معملات کا انتظام چلاتے ہیں)

یہ اپنے رب کے تابع ہیں، صرف اسی کے حکم سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں، اور جلد ہی وہ انہیں رکنے اور بجھ جانے کا حکم دے دے گا، ایسا کب ہوگا؟''یوم ترجف الراجفة تتبعها الرادفة'' (جس روز ہلا مارے گا زلزلہ کا جھٹکا، اور اس کے بعد ایک اور جھٹکا آپڑے گا)

خداوند قدوس کی کاریگریاں عقل کو خیرہ کردیتی ہیں، اور یہ خیرگی اس وقت بڑھ جاتی ہے جب ذہن اس حقیقت کی جانب متوجہ ہوتا ہے کہ ان وسیع وعریض فضائی مخلوقات کا نگران ونگہبان بیک وقت ان جراثیموں پر بھی نظر رکھتا ہے جو ایک سینٹی میٹر میں اربوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں، اسی طرح وہ ایک دماغ میں پائے جانے والے اربوں خلیوں (Cells) کی بھی نگہبانی کرتا ہے، خیال رہے کہ پانچ ارب انسان اس وقت زمین پر بستے ہیں۔

پھر ان کے علاوہ بھی اللہ کی بہت سے مخلوقات پائی جاتی ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**وما من دابة في الأرض ولا طائر يطير بجناحيه إلا أمم أمثالكم ما فرطنا في الكتاب من شيء ثم إلى ربهم يحشرون**'' (زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں اڑنے والے کسی پرندہ کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پھر یہ سب اپنے رب کے حضور حاضر کئے جائیں گے)۔

کیسے ہیں وہ خداوندی قوانین جو ایٹم سے لے کر کہکشاں تک کا نظام چلاتے ہیں۔

پورے جسم انسانی میں پھیلی ہوئی شریانوں کے ایک قطرہ کی بھی رگوں میں دوڑتے خون سے آمیزش نہیں ہوتی، اور یہ سب کچھ خالق کائنات کے علم، اس کی مشیت، قدرت اور حکمت کا نتیجہ ہے۔

یہ تو مادی مثالیں ہیں، ذہنوں میں آنے والے خیالات کا بھی یہی حال ہے، جس طرح کے ادراک، وجدان اور جذبات میرے اندر پیدا ہوتے ہیں، ہر ایک مخلوق کے اندر پیدا ہوتے ہیں، انسان کے دل میں آنے والا ہر خیال، اس کو حاصل ہونے والا ہر علم، خواہ اس نے اس کو لکھا ہو یا پڑھا ہو، محفوظ کیا ہو یا نہیں، خود اسے یاد ہو یا نہیں، اللہ رب العالمین کے علم میں ضرور ہے، زبان اور زمانہ کے فرق سے اس میں کچھ اثر نہیں پڑتا ہے: ''**وكل صغير وكبير مستطر**'' (ہر چھوٹی بڑی بات محفوظ ہے)، ناممکن ہے کہ اللہ کے علم اور اس کی سماعت وبصارت سے باہر نکل جائے۔

میں مسلمانوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ: تمہارا قرآن سچے عقیدہ کا اوّلین سرچشمہ ہے، اور علوم کائنات وحیات اس کے ایسے شارح ہیں کہ ان سے واقفیت رکھنا اور ان پر غور وفکر کرنا ضروری ہے، اور سائنس کے عہد میں خداوند قدوس کی عظمت مزید آشکارا ہوئی ہے، اور یہ سائنسی

ترقی ایمان کی حلیف اور الحاد کی حریف ہے۔

میں مسلمانوں کو ان نام نہاد اصحاب علم سے خبردار کرنا چاہتا ہوں، جو درحقیقت کسی ممتاز مقام ومرتبہ کے اہل نہیں ہیں، فرائڈ (Freud) یا ڈرکیم (Durkheim) اصحاب علم نہیں ہیں، بلکہ یہ تو مریض وگمراہ مفکرین ہیں، اسی طرح مارکس (Marks) اور اس کے متبعین کا حال ہے، انہیں جدید کاہن کہا جاسکتا ہے، جو کہ نفسیاتی مریض تھے، اور اگر دین داری نے میدان خالی نہ چھوڑ دیا ہوتا تو وہ کبھی بھی کسی قابل نہ جانے جاتے۔

مسلم خاتون کی تصویر سنواریے

میں اس وقت فکر اسلامی کانفرنس میں موجود تھا جب جرمنی کے سفیر نے اسلام کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سامعین سے کہا کہ: اپنے یہاں عورتوں کی صورت حال بہتر کرو، اس لئے کہ مسلم خاتون کی صورت حال اہل یورپ کو اسلام سے روکنے کا سبب بن رہی ہے۔

یہ سن کر سامعین میں سے ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اس بابت ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ میں نے جواب دیا: اگر تاجر اپنے مال تجارت کی جھوٹی خوبیاں کرے تو وہ دھوکہ باز کہلائے گا، اور اگر مال تجارت بہت سی خصوصیات اور خوبیوں سے متصف ہو، لیکن خود تاجر کو ان خوبیوں کا علم نہ ہو تو مال تجارت کی خوبیاں لوگوں کے علم میں نہیں آئیں گی، اور اس کی اس بے خبری کی وجہ سے مال تجارت کم قیمت کا رہ جائے گا۔

یہی شخص (اسلام کی توفیق سے بہرہ ور ہونے کے بعد) مسلمانوں سے کہتا ہے کہ: اپنے دین کو صحیح طریقہ سے پیش کرو، اور غلط فہمی اور غلط عمل کے ذریعہ دوسروں کو اسلام سے روکنے کا سبب نہ بنو، فرض کیجئے اگر کسی کو سارے ذخیرہ حدیث میں سے صرف حاکم کی مستدرک میں روایت کردہ اسی حدیث کا علم ہو کہ: ''عورت لکھنا نہیں سیکھے گی'' یا اسے بس زوائد کی یہ روایت معلوم ہو کہ: عورت مرد کو اور مرد عورت کو نہیں دیکھ سکتا، پھر یہ بیچارا اس حقیر سامان کے ساتھ یعنی ان موضوع ومتروک روایتوں کے ساتھ یورپ وامریکہ جا پہنچے، اور وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے لگے، تو کیا کوئی ایک شخص بھی اسلام میں داخل ہوگا؟ کیا کوئی ایک شخص بھی اسلام کو احترام کی نگاہ سے دیکھے گا؟ اور کیا کوئی ایک عورت بھی حلقہ بگوش اسلام ہوگی؟

کچھ مسلمان پہلے تو اپنے دین کی نہایت غلط تصویر پیش کرتے ہیں، اور پھر دوسروں کے

اسلام قبول نہ کرنے پر ان کی مذمت کرتے ہیں، میرے نزدیک ایسے جاہلوں کو یا تو قید کر دیا جانا چاہئے، یا ان پر کوڑے برسنے چاہییں، اس لئے کہ یہ صد عن سبیل اللہ کے مجرم ہیں، اور اس حقیقت سے لوگوں کو دور کر رہے ہیں جس کا اعلان آں حضرت ختمی مرتبت ﷺ نے کیا تھا۔

اسلام نے تمام حقوق وواجبات کے اندر مرد وزن کو مساوی قرار دیا ہے، اور جو چند فرق پائے جاتے ہیں وہ فطرت کے اختلاف اور اس کے نتیجہ میں ذمہ داریوں کے تنوع کی وجہ سے ہیں، ورنہ عام معاملات میں ان دونوں صنفوں کی بابت بنیاد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ان ارشادات پر ہے: ''**فاستجاب لهم ربهم اني لا أضيع عمل عامل منكم من ذكر أو أنثى بعضكم من بعض**'' (جواب میں ان کے رب نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو) اور ''**من عمل صالحا من ذكر أو أنثى وهو مؤمن فلنحيينه حياة طيبة ولنجزينهم أجرهم بأحسن ما كانوا يعملون**'' (جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے)۔

ہمارے یہاں کچھ ایسی اقدار وروایات چلی آرہی ہیں جو انسانوں نے وضع کی تھیں نہ کہ ان کے رب نے، اور ان اقدار وروایات نے عورت کی ثقافتی وسماجی حیثیت کو بہت نقصان پہنچایا ہے، انہوں نے اسے زمانۂ جاہلیت کی تاریکیوں کا اسیر کر دیا ہے، اور اسلامی تعلیمات کو عمل ورواج سے محروم کر دیا ہے، اس کے نتیجہ میں خواتین کی تربیت کا معیار گر گیا، اور تمام امت نے عورت کو جان بوجھ کر جاہل رکھا اور اس کے حقوق بری طرح تلف کئے......۔

میری ان باتوں کو سن کر ایک سامع نے بہت غصہ کے ساتھ مجھ سے دریافت کیا کہ کیا آپ بے نظیر بھٹو کے وزیر اعظم بننے سے خوش ہیں، میں نے اسے ہنستے ہوئے جواب دیا، ایک

انگریز مسلمان نے مجھ سے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ مسز تھیچر کے سربراہ حکومت بننے کی وجہ سے کیا برطانیہ کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہوگیا ہے، میں نے اس کے جواب میں اس سے کہا تھا: کہ وہ بڑی وسیع معلومات رکھنے والی خاتون ہے، اگر اس نے یہ کہا کہ وہ ظاہریہ کے مسلک کے مطابق سربراہ مملکت بنی ہے تو تم کیا جواب دوگے؟

پھر میں نے اس سے کہا: اسلام کے عظیم عقائد وارکان کے سامنے ان مختلف فیہ فروعی احکام کی رکاوٹ نہ کھڑی کیجئے۔......

فقر و جہالت کی اسیر

مسلم خاتون کے حقوق سے متعلق منعقد ایک مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ: اسے دعوت اِلی اللہ، اَمر بالمعروف ونہی عن المنکر ، اسلامی تعلیمات کی تدریس اور اسلامی تعلیمات پر ملحدین سے مباحثہ وغیرہ کا حق حاصل ہے...... میری یہ بات سن کر ایک صاحب اپنے ساتھی سے کہنے لگے، میں تو جنابِ محاضر کو ایک دین دار آدمی سمجھتا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ یہ تو قاسم امین سے زیادہ ملعون ہیں!۔

مجھے اس موقع پر شیخ احمد موسیٰ سالم کی وہ گفتگو یاد آ گئی جو انہوں نے قاسم امین اور نہایت تیز و تند فرانسیسی ثقافتی جنگ میں اسلام کے دفاع میں ان کے کردار کی بابت کی ہے۔

اس جنگ کا آغاز مشہور مؤرخ Ernst Ranon کے ذریعہ عرب ومسلمانوں کے خلاف حملہ سے ہوا تھا، اس کے اس حملہ کا جواب جمال الدین افغانی نے دیا تھا، اور اس کے دلائل کو غلط نیز اسے متعصب ثابت کیا تھا، نیز اسلام پر اس کے اعتراضات کا جواب دیا تھا، جمال الدین افغانی کے اس جواب کے بعد اس دشمن اسلام نے بڑی نرم روی کا اظہار کیا۔

پھر شیخ محمد عبدہ نے اس جانب توجہ کرتے ہوئے اس وقت کے فرانس کے وزیر خارجہ میسیو ہینیٹو کے اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراضات کا جواب دیا، شیخ محمد عبدہ کی وہ کتاب جو دین سے علم کے تعلق پر صرف ایک رات میں لکھی گئی تھی اس دروغ گو وزیر کا دنداں شکن جواب تھی۔

شیخ احمد موسیٰ نے کہا تھا: اس سلسلہ میں قاسم امین کا کام فیصلہ کن تھا، ان کے کام کا اساسی موضوع ''شریعت اسلامی اور خاتون'' تھا، انہوں نے اس سلسلہ میں ڈیوک ڈار کی کتاب (مصر اور مصریین) کا جواب دیا تھا، یہ کتاب ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی تھی، اور اس کے مصنف نے

اس کتاب میں عہد غلامان اور عہد ترکی میں مصری معاشرہ کے موضوع پر خامہ فرسائی کی تھی، اس عہد میں زندگی کا کارواں امت اسلامی کے طریقوں سے منحرف ہوگیا تھا، ایسی صورت میں اس مصنف کو پوری قوم کی بدترین تصویر کشی اور قلمی ایذا رسانی کا موقع ملا، اس نے بالخصوص اس عہد کی خواتین کی بابت زیادہ زہر اگلا، اور ان تمام خرابیوں کا سبب اسلام کی ترقی وتہذیب مخالف فطرت کو قرار دیا......!!

قاسم امین نے اپنے دین اور اپنی امت کا دفاع کیسے کیا؟ انہوں نے فوراً فرنچ زبان میں ایک کتاب لکھ کر اپنے مقابل کے اعتراضات کا جواب دیا، اسلام کے عطا کردہ عورت کے حقوق بتائے، اور دین میں اس کو جو عظمت دی گئی ہے اس کو بیان کیا، اور حیاء ووقار کے حامل اسلامی حجاب نیز جدید تمدن کے چھچھورے پن اور اس میں عورت کی بے حیائی وبد چلنی کے درمیان موازنہ کیا۔

قاسم امین کے اس کام کے دو پہلو تھے، (۱) اپنے بنیادی مصادر (کتاب وسنت) سے ماخوذ اسلام کا دفاع، اور (۲) مسلم معاشروں میں عورت کی پسماندگی کا سبب خداوندی ہدایات سے منحرف ان اقدار وروایات کو قرار دینا جو لوگوں کی غلطیوں کے نتیجے میں وجود میں آئی تھیں۔

اسلام کے دفاع کی اس کے علاوہ کوئی صورت ہے بھی نہیں! بالفرض اگر کوئی امریکی یا یورپی شخص اسلام پر یہ تہمت لگائے کہ اس نے عورتوں کو مسجد جانے سے روکا ہے، لہذا وہ ایک شاذ دین ہے کہ کوئی بھی دوسرا دین عورتوں کو عبادت گاہ آنے سے نہیں روکتا ہے، ایسے شخص کو میں کیا جواب دے سکتا ہوں؟ کیا میں اس تہمت کو صحیح تسلیم کرلوں؟ یا اس سے کہوں: یہ ممانعت اسلام کی تعلیم کردہ نہیں ہے، یہ تو چند معاشروں کی روایات ہیں، میں کیا کروں؟ حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے اسلام کا دفاع کروں، یا جھوٹ بول کر اسلام کے نام لیواؤں کا؟

بعض اسلام پسندوں کو دیکھا کہ وہ قدیم زمانہ سے چلی آرہی ان روایات کے دفاع میں نہایت ناسمجھی کا ثبوت دیتے ہیں، جن کی بابت اللہ نے کچھ بھی حکم نہیں دیا ہے، ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آباء واجداد سے چلی آرہیں روایات کی حفاظت کے لئے اللہ ورسول کی جانب غلط باتیں منسوب کی جائیں۔

کچھ لوگ ایسی غلط باتوں کے محافظ کا کردار ادا کرتے ہیں، جب بھی کوئی ان غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے یہ لوگ اس کے خلاف زمین آسمان ایک کردیتے ہیں، شروع میں میں اس شور وہنگامہ کی بالکل پرواہ نہیں کرتا تھا، لیکن پھر میں نے دیکھا کہ یہ طوفان بدتمیزی مصلحین کے تئیں سینوں میں کدورت کا سبب بن رہا ہے، اور ان کی عزتوں کو خاک میں ملایا جارہا ہے، تو پھر ان باتوں پر خاموشی کی کوئی گنجائش نہیں رہی، اس لئے کہ اس خاموشی سے خود دین کا نقصان ہوگا، اور حقائق کو باطل سمجھا جانے لگے گا۔

خود میں نے لوگوں کو جمال الدین افغانی، محمد عبدہ اور رشید رضا کو برا بھلا کہتا سنا، بلکہ یہ منظر بھی ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ کل کے بچے امت کے عظیم ترین ائمہ کو بے عزت صرف اس لئے کررہے ہیں کہ ان کی آراء ان اقدار وروایات نیز افکار کے خلاف ہیں جو ان لوگوں نے اپنے آباء واجداد سے حاصل کئے تھے، اور غضب تو یہ ہے کہ یہ آباء واجداد بھی ان سے کم بڑے جاہل نہیں تھے۔

میرے لئے نہایت حیرت کی بات ہے کہ کچھ دین پسند لوگ میرے اوپر اتنی سخت تنقید کرتے ہیں کہ اتنی سخت تنقید مجھ پر صہیونیوں اور عیسائیوں نے بھی کبھی نہیں کی ہے، اس موقع پر مجھے شیخ عصام عطار کا یہ قول یاد آ گیا کہ: داعیان اسلام نے اللہ کے نیک بندوں کے خلاف جیسی جنگ لڑی ہے اگر وہ اس کی عشر عشیر بھی اسلام کے دشمنوں اور باطل پسندوں کے خلاف لڑ لیتے تو بہت پہلے اسلام غالب آ گیا ہوتا، لیکن کچھ لوگ ناحق محاذوں پر حق کے محاذوں سے زیادہ سرگرم نظر آتے ہیں، اور اپنی خواہشات نیز اپنی دنیا کے لئے وہ جذبات رکھتے ہیں جو آخرت اور رضائے خداوندی کے لئے نہیں رکھتے۔

پھر موصوف لکھتے ہیں: کتنے ذلیل ہیں وہ لوگ جو بلند کرداروں کو اپنی گندی خواہشات سے آلودہ کرتے ہیں۔''

یہ کلام اس تلخ تجربہ کا نتیجہ ہے جس سے سنجیدہ مزاج داعیوں کو گزرنا پڑتا ہے، ہم وحی کے پابند ہیں، اور اس سے سر مو انحراف نہیں کر سکتے، اسی طرح ہم عہد نبوت وخلافت راشدہ کے اسوہ کے پابند ہیں، لیکن امت اسلامی کی مکمل تاریخ کے پابند نہیں ہیں، اس لئے کہ تاریخ حکمرانوں کے افعال اور قوموں کے موقفوں سے عبارت ہے، اور یہ چیزیں معصوم طرز عمل نہیں ہیں، بلکہ ان میں صحیح وغلط دونوں پائے جاتے ہیں، یعنی ہمیں شریعت کی روشنی میں ان کی صحت وخطا کا فیصلہ کرنا چاہئے، نہ کہ اس فیصلہ میں ان سے مدد لینی چاہئے، اس لئے کہ معصوم میزان (حجت) صرف کتاب وسنت ہی ہیں، زمانۂ جاہلیت کے آخری عہد میں اور اسلامی عہد کے آغاز میں ہمیں عورت بلا کسی اعتراض کے بیعت عقبہ میں شریک نظر آتی ہے، بیعت رضوان میں وہ موت یا میدان چھوڑ کر نہ بھاگنے کی بیعت کرتی ہے، لیکن تاریخ اسلامی کے آخری عہد میں عورت کو یہ اجازت نہیں مل سکتی، آخر اس کا کیا مطلب ہے؟

بیعت اور مسلمانوں کے عظیم امور سے صرف نظر، میری ابتدائی عمر میں جب لوگوں کے سامنے یہ بات آئی کہ ڈاکٹر طٰہ حسین نے کلیۃ الآداب میں (جس کے وہ عمید تھے) داخلہ لینے کی چند طالبات کو اجازت دے دی ہے، تو پورا ایک معرکہ بپا ہوگیا۔ ایمان یا (صحیح تعبیر کے مطابق) مؤمنین کا موقف یہ تھا کہ یہ ناجائز ہے، جب کہ دوسرا فریق جسے ملحدین کا نام دیا جاتا تھا اس نے عورت کی اعلیٰ تعلیم کی حمایت کی۔

یہ مہمل معرکہ اسلام کے ساتھ کیا انصاف کر رہا تھا؟ کیا دین جہالت کا اور الحاد علم کا حامی ہوسکتا ہے؟ کب تک ہم لوگوں کو دین کے نام پر جھوٹ بولنے کی اجازت دیں گے۔

میں نے الجزائر کی وزارت برائے دینی امور سے کہا تھا کہ بڑی مسجدوں میں مخصوص

اوقات میں صرف عورتوں کے لئے وعظ وتربیت کے اجتماعات کئے جائیں، جس میں گفتگو جامعہ اسلامیہ کی فارغ التحصیل خواتین ہی کریں، خدا جانے ہمیں کامیابی ملی، یا پھر وہ جاہل نام نہاد فقہاء کامیاب ہو گئے جو مسلسل عورت کی آواز کا بھی پردہ لازمی قرار دیتے رہتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ عیسائی مشنریز میں مسیحی راہبات کی کامیابیوں کے بعد بھی ان لوگوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔

ان کا صرف ایک کام ہے، اور وہ ہے عورت کو فقر و جہالت کا اسیر رکھنا، نیز اس زمانہ میں بھی پوری امت کو ثقافتی وسیاسی طور پر پسماندہ بنائے رکھنا۔

اسلام خاندان کا محافظ ہے

انگلینڈ میں معاشرہ کی سلامتی سے متعلق ذمہ داران نے بتایا ہے کہ وہاں طلاق کا تناسب بڑھ کر ۳۳% تک جا پہنچا ہے، جب کہ والدین کی بیک وقت نگہداشت سے محروم بچوں کا تناسب ۴۰% ہے، اسی طرح پرورش کا حق مانگنے کے کیسوں میں بھی زبردست اضافہ دیکھا گیا ہے، باپ اپنی اولاد لے کر الگ ہوجانا چاہتا ہے، تو ماں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ طلاق کے بعد باپ بچوں سے محروم ہوجائے، اور بیچاری نوخیز نسل کا مستقبل ان جھگڑوں کی نظر ہورہا ہے۔

طلاق ایک مبغوض چیز ہے، خاص طور پر جب زوجین والدین ہوجاتے ہیں تو پھر ان کے درمیان علاحدگی کا ضرر صرف ان تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ دیگر بے گناہوں تک بھی جا پہنچتا ہے۔ میرے نزدیک پرہیز علاج سے بہتر ہے، اور ازدواجی زندگی کا تسلسل اسے ختم کرنے اور پھر طلاق کے برے نتائج کا سامنا کرنے سے بہتر ہے۔

ازدواجی زندگی کا یہ تسلسل سچے ایمان، پاکیزہ اخلاص اور اس بات پر منحصر ہے کہ شوہر اپنی اس بیوی پر قناعت کرے جو اسے تقدیر نے دی ہے، اور اسی طرح بیوی اپنے شوہر سے راضی رہے اور اسی کے لئے اپنے آپ کو خالص کرے۔

یہ عناصر اس ارشاد باری سے مستفاد ہیں جو "عباد الرحمان" کی صفات کے ذیل میں بیان ہوا ہے: "والذين يقولون ربنا هب لنا من أزواجنا وذرياتنا قرة أعين......" (اور جو یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہماری بیویوں اور اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے)۔

رفیق حیات کا آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا گھر کی بقاء میں نہایت اہم بلکہ سب سے اہم ہے۔

کیا تہذیب نو کی روایات اس کی ضمانت دیتی ہیں؟ اس سوال کا بالکل واضح جواب

ہے: نہیں ......! بلکہ یہ ضمانت مردوں اور عورتوں سے بھری ہوئی اس محفل رقص میں بالکل معدوم ہو جاتی ہے جس میں مرد و زن ایک دوسرے کی آغوش میں ہوتے ہیں، اور ان دونوں کے اندر کا شیطان جاگ جاتا ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ عورت سونے کے کپڑوں میں تقریباً برہنہ ہوتی ہے۔

اگر اس کے نتیجہ میں میاں بیوی کے تعلقات فوراً ختم نہیں ہوتے ہیں، تو بہر حال کچھ عرصہ بعد ان تعلقات کا خاتمہ یقینی ہوتا ہے، پھر یہاں تو وہ مطلق اختلاط پایا جاتا ہے جس کے زمان و مکان کی تحدید سے وحی الٰہی کو دور رکھا گیا ہے، اور عورت اس کے لئے طرح طرح کے سنگار کرتی ہے، کیا اس اختلاط کے ساتھ خاندان اور اس کی عزت کا تسلسل ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔

اسلام اپنی دقیق تعلیمات کے ذریعہ خاندان کے حاضر و مستقبل کی حفاظت کرتا ہے، اور طلاق کو نہایت خطرناک چیز قرار دے کر اس کے امکانات کو نہایت کم کرتا ہے، لیکن بہت سے اسلامی معاشروں میں طلاق کا تناسب بڑھ رہا ہے، اس لئے کہ مغربی تہذیب کی بے راہ روی کے ہم بھی شکار ہو رہے ہیں، اور اس کے جراثیم نے ہمارے یہاں بھی حملہ بول دیا ہے۔

مغربی تہذیب کو ہمارے معاشروں میں ملنے والی کامیابی کا اصل سبب ہماری جانب سے کمزور مقابلہ اور دفاع کرنے والوں کی ناسمجھی ہے، میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ جب طٰہٰ حسین نے یونیورسٹی میں طالبات کو داخلہ دیا تو دینداروں نے اسے حرام قرار دیا، بلکہ لڑکیوں کے لئے خاص اسکولوں میں بھی لڑکیوں کی تعلیم مصر پر برطانیہ کے قبضہ کے بعد ہی شروع ہوئی، کہ اس وقت کی رائج روایات اسلام کے نام پر عورت پر جہالت تھوپتی تھیں۔

عصر حاضر میں جب کہ عورت خلا کا سفر کر رہی ہے کچھ ہمارے لوگ اسے مسجد میں نماز پڑھنے سے روک رہے ہیں۔

اسلامی ممالک میں جب تک یہ طرز فکر باقی رہے گا تہذیب نو کی بے حیائی کا مقابلہ ناممکن رہے گا۔

علماء کی ذمہ داری

کسی فقہی مسئلہ کی بابت جب دلائل متعارض ہوتے ہیں، اور فقہاء کے یہاں مختلف آراء پائی جاتی ہیں، تو میں فتوے کے اندر ان آراء میں سے ایک رائے کا انتخاب اپنا حق سمجھتا ہوں، یہ انتخاب کبھی دلیل کے راجح ہونے کی بنیاد پر ہوتا ہے، کبھی لوگوں کی سہولت اس کا سبب بنتی ہے، اور کبھی درپیش مسئلہ کو آسانی کے ساتھ حل کرنے کے پیش نظر مختلف آراء میں سے کسی ایک رائے کو میں منتخب کرتا ہوں۔

ابھی حال ہی میں مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ ایک بیوی کے شوہر کی اچانک وفات ہوگئی ہے، جس کا اس پر بہت اثر ہے، یہاں تک کہ اہل خانہ کو ڈر ہے کہ کہیں غم کی شدت اس کے لئے مہلک نہ ہوجائے، اس لئے وہ لوگ اسے بیت اللہ لے جانا چاہتے ہیں، تاکہ عمرہ کی ادائیگی اس کے اندر ایمانی جذبہ پیدا کرکے اس کی ڈھارس بندھائے۔

اس سوال کے جواب میں میں نے کہا: بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے ہی گھر میں عدت گزارے، ان لوگوں نے کہا: ہمیں اس کی صحت اور اس کے ذہنی توازن کی بابت ڈر ہے۔

اس صورت حال کے سامنے آنے کے بعد میں نے اس مسئلہ میں بہت غور وفکر کرکے حضرت عائشہؓ کی رائے کے مطابق فتویٰ دے دیا، ان کے نزدیک عدت کا تعلق مدت سے ہے، مقام سے نہیں، مؤلف فقہ السنۃ شیخ سید سابق فرماتے ہیں: حضرت عائشہ اس عورت کو عدت میں گھر سے نکلنے کی اجازت دیتی تھیں جس کا شوہر وفات پا گیا ہو، ان کی بہن ام کلثوم کے شوہر طلحہ بن عبیداللہ کا انتقال ہوا تو وہ انہیں مکہ عمرہ کرنے لے گئیں۔

امام عبدالرزاق نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ: اللہ سبحانہ وتعالیٰ

نے چار مہینے دس دن عدت گزارنے کا حکم دیا ہے، یہ نہیں کہا ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہی عدت گزارے، لہذا وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے۔

بعض فقہاء کے نزدیک رات میں تو معتدہ خاتون کو اپنے گھر میں رہنا ہوگا، لیکن مثلاً اگر وہ ملازم ہے تو اپنے کام پر جا سکتی ہے، ہاں سوگ منانا اور زینت سے مکمل اجتناب کرنا لازمی ہے۔

اس جیسے مسائل میں معاملہ آسان ہے، لیکن مجھے اس وقت بہت غصہ آتا ہے جب میں اسلام کی عزت کو داغدار کرنے والی کوئی بات سنتا ہوں، ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ انہوں نے ایک اسلامی کتاب میں پڑھا ہے کہ حضرت عمر نے عورتوں کو لکھنا سیکھنے سے روکا تھا، گویا کہ وہ ان کے لئے "امیت" کو پسند کرتے ہوں، میں نے ازراہ مذاق ان سے کہا: یہ "امیت" صرف عورتوں تک ہی کیوں محدود رہے گی؟ حدیث نبوی: "نحن أمة أمية" (ہم امی امت ہیں) کے غلط فہم کی بنیاد پر "امیت" تو مرد وزن دونوں کے لئے لازمی ہونی چاہئے۔

برادرم! عورتوں کو لکھنا سیکھنے سے منع کرنے والی روایت موضوع ہے، زمین وآسمان کی موجودات کا علم حاصل کرنے کو حقیر بتانے والی ہر روایت ناقابل اعتماد ہے، "امیت" کتاب وسنت میں ان عربوں کا وصف قرار دی گئی ہے جن میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تھی، کہ یہ بات مقامی اور عالمی پیمانہ پر معروف تھی، لیکن یہ صورت حال قرآن مجید کے نازل ہونے اور اس کی آیات سے علوم ومعارف کی برسات ہونے کے بعد یکسر تبدیل ہوگئی تھی: "**ولئن اتبعت أهواء هم بعد الذي جاء ک من العلم مالک من الله من ولی ولا نصير**" (اور اگر تم نے علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی تو تمہارے لئے اللہ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہے۔) "**بل هو آيات بينات في صدور الذين أوتوا العلم وما يجحد بآياتنا إلا الظالمون**" (دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں

کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے، اور ہماری آیات کا انکار صرف ظالم ہی کرتے ہیں)۔

مردوں اور عورتوں سب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے علم میں اضافہ کریں، اور حاصل شدہ علم پر اکتفاء نہ کریں۔

ہم تک جو روایات پہنچی ہیں وہ سب تجزیہ وتنقید کی محتاج ہیں، کہ بسا اوقات کوئی فقیہ ایک روایت نقل کرتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا ہے، اس لئے کہ متعلقہ مسئلہ کی بابت کوئی دوسری زیادہ قوی اور زیادہ قابل اتباع دلیل پائی جاتی ہے۔

اس موقع پر میں امام احمد بن حنبل اور ان کی مسند کا حوالہ دینا چاہوں گا، امام موصوف نے متعدد ایسی احادیث پر عمل نہیں کیا ہے جنہیں انہوں نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے، ابن جوزی نے اپنی کتاب "صید الخاطر" میں لکھا ہے: ایک محدث نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا مسند احمد میں کوئی غیر صحیح حدیث ہے، میں نے کہا: ہاں۔

میرا یہ جواب بعض حنابلہ کو بہت شاق گزرا، میں نے یہ سوچ کر کہ یہ عوام ہیں ان کے رویہ پر توجہ نہیں دی، لیکن پھر بعض حضرات نے، جن میں کچھ اہل خراسان بھی تھے، اس بابت فتاویٰ لکھے اور اس بات کو نہایت غلط بتاتے ہوئے اس کی تردید کی، ان حضرات میں سے ایک ابوالعلاء ہمدانی بھی تھے، یہ دیکھ کر کے تو میں حیرت میں رہ گیا، اور میں نے سوچا: تعجب ہے! اب علماء بھی عوام ہو گئے، ان کے اس رویہ کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے حدیث سنی، لیکن یہ تحقیق نہیں کی کہ یہ صحیح ہے یا ضعیف، اور انہوں نے میرے قول کو امام احمد کی روایت کردہ حدیث پر اعتراض گمان کیا، حالانکہ ایسا حقیقت میں ہے نہیں، امام احمد نے اپنی مسند میں مشہور، صحیح وغیر صحیح ہر طرح کی روایتیں ذکر کی ہیں، پھر انہوں نے اپنی روایت کردہ بہت سی روایتوں پر خود عمل نہیں کیا ہے، اور ان کے مطابق اپنا مسلک بیان نہیں کیا ہے، کیا انہوں نے نبیذ سے وضوء کرنے والی حدیث کو مجہول نہیں کیا ہے۔

ابوبکر خلال کی کتاب العلل میں بہت سی مسند کی ایسی روایات موجود ہیں جن کو امام احمد نے غیر صحیح قرار دیا ہے۔

قاضی ابویعلی محمد بن الحسین فراء کا مسئلۂ نبیذ سے متعلق جو مخطوطہ پایا جاتا ہے، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ: امام احمد نے اپنی مسند میں مشہور حدیثیں ذکر کی ہیں، صحیح و غیر صحیح کا کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

اس کی ایک دلیل امام احمد کے صاحب زادے عبداللہ کا یہ قول بھی ہے: میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ ربعی بن خراس عن حذیفہ کی روایت کے بارے میں ان کا کیا کہنا ہے؟ انہوں نے پوچھا کیا وہ روایت جو عبدالعزیز بن ابوداود نے روایت کی ہے، میں نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا متعدد حدیثیں اس کے خلاف ہیں، میں نے کہا کہ آپ نے تو یہ روایت مسند میں نقل کی ہے۔

امام احمد نے فرمایا: میں نے مسند میں مشہور حدیثیں ذکر کی ہیں، اگر میں صرف وہی روایتیں ذکر کرتا جو میرے نزدیک صحیح ہیں تو میں اس مسند میں بہت کم روایتیں ہی ذکر کرتا، لیکن بیٹے تم میرا یہ طرز عمل جانتے ہو کہ میں ضعیف حدیث کی اس وقت تک مخالفت نہیں کرتا جب تک متعلقہ مسئلہ سے متعلق کچھ اور حدیثیں اس کو رد نہ کرتی ہوں۔

قاضی کہتے ہیں: اس جواب سے امام احمد نے مسند کے سلسلے میں اپنا طریقۂ عمل بتا دیا ہے۔

عصر حاضر کے علماء بھی علمی کم مائیگی کی بنا پر عوام ہو گئے ہیں، ان کے سامنے کوئی موضوع حدیث آتی ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ اسے فلاں نے روایت کیا ہے، اس دون ہمتی پر رونے کو جی چاہتا ہے، مسند احمد کی حدیثوں کے بارے میں یہ کلام مشہور حنبلی فقیہ ابن جوزی کا ہے، لیکن کچھ لوگ ''بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کے وفادار'' ہوتے ہیں۔

اہل مذاہب کا غرور

ادیان ومذاہب کے لئے سب سے خراب چیز اس کے پیرووں کا غرور ہے، بعض لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ صرف کسی دین کی جانب نسبت سے سارا کام بن جاتا ہے، اور جنت ان کے لئے پکی ہو جاتی ہے، ایسا کیسے ممکن ہے؟

کیا یہ لوگ اپنی خواہشات پر قابو پالیتے ہیں؟ اخلاقی برائیوں سے نجات پا جاتے ہیں؟ کیا اپنی تمام تر صلاحتیں اللہ کی عبادت اور بندوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں، نہیں، وہ ایسا نہیں کرتے، ان کے دل میں بس یہ خیال بیٹھا ہوتا ہے کہ ان کا اللہ کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے، حالانکہ ایسے تعلق کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

اسی لئے ایسا ''دیندار'' شخص ہر ممکنہ طریقہ سے اپنے اغراض حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے بالکل یہ فکر نہیں ہوتی کہ وہ جس طریقہ کا استعمال کر رہا ہے وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے کیسا ہے؟ ماضی میں بنی اسرائیل ایسی حرکتوں میں بہت ماہر تھے۔

لیکن وہ ان حرکتوں کو اپنے لئے روا سمجھتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ حضرت یعقوب نے اپنے بھائی عیصو سے منصب نبوت دھوکہ وغیرہ کے ذریعہ اچک لیا تھا۔

لیکن کیوں کر؟ اس لئے کہ وہ اپنے نزدیک اس کے زیادہ اہل تھے، لہذا اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایسی چالوں میں کوئی حرج نہیں تھا، اور ان کی نسل ان کے بارے میں جو روایت کرتی تھی یا جو بات ان کی جانب منسوب کرتی تھی اس کی تقلید میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتی تھی۔

بنو اسرائیل کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ایک ظالم وجابر سے نجات حاصل کرنے

کے لئے اپنی بیوی کو اس کے چنگل میں دے دیا تھا، اسی طرح ان کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیم کی نیت ایک مرتبہ مال غنیمت پر بگڑ گئی، اور آخر کار انہوں نے اسے ناحق لے لیا۔

سچی بات یہ ہے کہ حضرت مسیح کی بعثت سے پہلے یہودی معاشرہ گناہوں سے لبریز تھا، اور اولین یہودی غلبہ کے زمانہ میں بیت المقدس کو نہایت دلدوز واقعات اور شرفاء کی جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔

بیت المقدس سے مشرق میں واقع جبل زیتون پر حضرت مسیح نے یہودیوں کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''اے یروشلیم! اے یروشلیم! تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتا ہے، کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کرلوں، مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو! تمہارا گھر تمہارے لئے ویران چھوڑا جاتا ہے۔

انجیل یوحنا میں ہمیں یہ مکالمہ بھی پڑھنے کو ملتا ہے، یہودیوں نے حضرت مسیح سے کہا: ہمارا باپ تو ابرہام ہے، یسوع نے ان سے کہا: اگر تم ابرہام کے فرزند ہوتے تو ابرہام کے سے کام کرتے، لیکن اب تم مجھ جیسے شخص کے قتل کی کوشش میں ہو۔......ابرہام نے تو یہ نہیں کیا تھا، تم اپنے باپ کے سے کام کرتے ہو، جو کہ ابلیس ہے۔

ایک اور موقعہ پر حضرت مسیح نے اپنی قوم کی جھوٹی دینداری کی قلعی کھولتے ہوئے ان سے کہا: تم نے اللہ کے گھر کو ڈاکوؤں کا نشانہ بنا رکھا ہے۔

حقیقی دین (جو اللہ نے نازل کیا تھا اور جو داعیوں کی زندگی میں نظر آتا ہے) نیک اعمال، پاکیزہ اخلاق اور منصفانہ احکام سے عبارت ہے، اس کے پیرو حکمراں ہوتے ہیں تو عوام کے سلسلے میں اللہ سے ڈرتے ہیں، عوام ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے ہیں، آپس میں رحم دلانہ تعلق رکھتے ہیں، اور نیکی وغمگساری کی روایات پروان چڑھاتے ہیں۔

قرآن کریم نے آسمانی کتابوں کے تمام مخاطبین (مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں) کوحقیقت دین سے صرف نظر کر کے صرف ظاہر سے وابستہ ہونے سے روکا ہے،'' **وللّٰہ ما في السماوات وما في الأرض ولقد وصينا الذين أوتوا الكتاب من قبلكم وإياكم ان اتقوا اللّٰہ وإن تكفروا فإن للّٰہ ما في السماوات وما في الأرض وكان الله غنيا حميدا** '' (آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے، تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انہیں بھی یہی ہدایت کی تھی، اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو، لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے، اور وہ بے نیاز اور ہر تعریف کا مستحق ہے)

کیا اس ہدایت کو ان یہودی وعیسائی پیشواؤں نے سمجھا جو یہودیوں کو بیچارے فلسطینیوں کے خلاف برانگیختہ کرتے ہیں؟

کیا اس ہدایت پر ان سرگشتہ مسلمانوں نے کان دھرا جو اپنی ذمہ داری سے صرفِ نظر کئے ہوئے ہیں، اور فقہ واخلاق میں اس کو بالکل نہیں برتتے۔

اور کیا ہم اس وقت کے منتظر ہیں جب آوارۂ وطن یہودی کی جگہ آوارۂ وطن عربی لے لے۔

یہ کس کی خاطر بولتے ہیں؟

اس وقت متعدد مذاہب کے درمیان اپنے آپ کو زیادہ بہتر ثابت کرنے کا ایک مقابلہ چل رہا ہے، لیکن بڑی حیرت کی بات ہے، بعض مسلمان اس صورت حال سے صرف نظر کرتے ہوئے ایسی حماقتیں کررہے ہیں، جن کا نقصان ان کے دین کو اٹھانا پڑتا ہے، یہ حماقتیں لوگوں کو دین سے روکتی ہیں۔ ایسے لوگ نفسیاتی طور پر یہ سوچ کر مطمئن رہتے ہیں کہ اسلامی عقائد وتعلیمات برحق ہیں، لہذا لوگوں کو ہر حال میں ان پر ایمان لے آنا چاہئے۔

یہ آخری درجہ کی نادانی اور خام خیالی ہے، بہترین مال بری طرح پیش کئے جانے اور اشتہار میں کمی کرنے کی وجہ سے بازار میں بے حیثیت وکم قیمت ہوجاتا ہے، اور دوسری وہ چیزیں بازار میں اس سے سبقت لے جاتی ہیں جن کے مالکوں نے ان کا اچھی طرح اشتہار کیا ہوتا ہے، اورانہیں جاذب نظر بنایا ہوتا ہے۔

عصر حاضر کی تہذیب نے انسانیت کو اپنا شعار اور حقوق انسانی کو بین الاقوامی تعلقات کی اساس قرار دیا ہے، اس نے اجتماعی انصاف اور اچھی صحت وثقافت کو نمایاں اہمیت دی ہے۔

یہ تہذیب اس سلسلہ میں دھوکہ باز یا کوتاہ عمل ہوسکتی ہے، لیکن ان باتوں کو کہنے سے ان چیزوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا جن پر اور جن کے احترام پر عالمی مجلسیں متفق ہیں۔

وہ حضرات جو اسلام کی بابت ایسی گفتگو کرتے ہیں جس سے اسلام فطرت کے اصولوں اور انسانی احساسات کی رعایت سے محروم معلوم ہوتا ہے، ان کی اس گفتگو سے کس کو فائدہ پہنچتا ہے؟

آخر کس کے کہنے پر ثانوی درجہ کے مسائل میں تو اسلام کی آواز بہت پر جوش انداز

میں سنائی پڑتی ہے، لیکن اساسی نوعیت کے مسائل میں اس کے سننے کو کان ترس جاتے ہیں؟

آخر کس کی خاطر بعض لوگ مختلف آراء میں سے ایک اختیار کر کے یا مختلف اقدار میں سے کسی ایک کا احترام کر کے وسیع اسلام کو اپنی تنگ رائے سے ہی عبارت بتاتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ان کے معاشرے کے رواج ہی خداوندی ہدایات اور آسمانی ہدایات ہیں۔

ایسے ہی ایک صاحب سے میں نے کہا: اسلام کا دامن بڑا حسین ہے، لیکن وہ تم لوگوں کی گفتگوؤں سے داغدار نظر آتا ہے، تمہارے لئے بہترین کارِعبادت یہ ہے کہ تم بالکل خاموش رہو، اور ایسے مسائل میں ایک حرف زبان سے نہ نکالو، ہر وہ گفتگو جس سے سیاسی استبداد کو مدد ملے یا جو سماجی ظلم، ثقافتی وتہذیبی پسماندگی کو مدد دے اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے اور اسلام نفسیاتی وعقلی صحت سے عبارت ہے۔

میں کنیڈا کے ایک شخص سے گفتگو کر رہا تھا، اس نے مجھ سے عورت کے تئیں اسلام کے ''تنگ موقف'' کی بابت سوال کیا تھا، اس گفتگو کے دوران میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ: اسلام نے عورت کو شوہر کے انتخاب کا حق دیا ہے، اسے کسی ایسے شخص کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا جسے وہ ناپسند کرتی ہو، اسے نکاح کا عقد خود کرنے یا دوسرے کو اپنا وکیل بنانے کی اجازت ہے۔

ایک صاحب اس گفتگو کو سن رہے تھے، وہ میری اس بات پر ناراض ہوئے، لیکن الحمدللہ خاموش رہے، جب یہ گفتگو ختم ہوگئی تو وہ میرے پاس آئے اور بڑے سلیقہ سے بولے: عورت خود نکاح کا عقد نہیں کرسکتی ہے، اسلام اس کے خلاف ہے۔

میں نے ان صاحب سے کہا: آپ کی رائے اس کے خلاف ہے، آپ نے اس مسئلہ میں چند فقہی مسالک کا اتباع کیا ہے، اور میں نے دوسرے نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے، میرے نزدیک دوسرا نقطۂ نظر ہی ان امریکیوں ویورپیوں کے لئے زیادہ قابل قبول ہے، متعدد قابل

احترام اسلامی حلقوں میں اس پر عمل چل رہا ہے، اور اسلام کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ یہ دائرہ مزید وسیع ہو۔

اسلام کو اس وقت ایک بہت بڑی مصیبت یہ درپیش ہے کہ اس کے بعض متبعین چند فروعی اختلافی فقہی آراء سے چمٹے رہتے ہیں، اور ان کے اس رویہ سے اسلامی عقائد و عظیم اقدار کی تبلیغ کو نقصان پہنچتا ہے، ظاہر ہے جو شخص کسی ایک دوکان کو دوسری دوکان پر یا کسی ایک ایجنٹ کو دوسرے ایجنٹ پر ترجیح دینے کی وجہ سے پورا بازا کھو دے وہ تاجر نہیں کہلائے گا۔

نادان دوستوں کی نادانی

اگر عصر حاضر میں کوئی ایسا اسلامی معاشرہ وجود میں آئے جو عورت کے مقام، اس کے میدان عمل اور اس کی سرگرمیوں کی بابت واضح موقف اختیار کرے تو دنیا سے بڑا فساد ختم ہو جائے گا، فطرت سلیمہ رکھنے والے بہت سے لوگ مغربی تہذیب کے حدود نا آشنا اختلاط، اس کی بے حیائی، خاندانی نظام کے عدم وجود اور بغیر کسی پابندی کے نفسانی جذبات کی تکمیل کو ناپسند کرتے ہیں، وہ کسی بہتر متبادل کی تلاش میں بھی ہیں، لیکن وہ انہیں نہیں ملتا۔

اس لئے کہ غلو پسند مسلمانوں نے ان کے دل میں یہ خیال بیٹھا دیا ہے کہ اسلام عورت کو قید کر دیتا ہے، اور اس کی انسانی تکمیل کا دشمن ہے، اس نے جدید تمدن کے دباؤ میں عورت کو تعلیم کی اجازت دے تو دی ہے، لیکن بس مجبوری میں دی ہے، اسی طرح جمعہ کے دن مسجد جانے کی اجازت بھی خوش دلی سے نہیں دی گئی ہے۔

عالم اسلام کے بعض حکمرانوں نے مغرب کی نقل کرتے ہوئے عورت کو انتخابات میں شرکت اور مجلس شوریٰ کی رکنیت کا موقع فراہم کیا ہے، لیکن ان حکمرانوں کو دین پسندوں کی ناراضگی کا سامنا ہے۔

اور اگر دین پسند حکومت پر غالب آ گئے تو پھر عورتیں گھروں کی اسیر ہو جائیں گی، اور ان میں سے کسی ایک کا بھی چہرہ دکھائی نہیں دے گا۔

اسلام کو ناپسند کرنے والے اور اس کے احیاء سے خائف یہ لوگ معذور ہیں، کہ انہوں نے اس کی یہی بدنما صورت دیکھی ہے۔ اور سطور بالا میں جن غلو پسندوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ان اہل کتاب جیسے ہیں جن سے بعثت محمدی کے وقت اللہ تعالیٰ نے کہا تھا: ''یا أهل

الکتاب قد جاء کم رسولنا یبین لکم کثیرا مما کنتم تخفون من الکتاب‘‘(اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے، اور وہ تمہارے لئے بہت سی وہ چیزیں بیان کر رہا ہے جو تم کتاب میں سے چھپایا کرتے تھے)

یہ غلو پسند بھی عمداًاس بات کو چھپاتے ہیں کہ مسلم خواتین مسجدوں میں پنج وقتہ نمازوں میں شریک ہوتی تھیں، جنگوں میں حصہ لیتی تھیں، بڑی بیعتوں میں شامل ہوتی تھیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بجا لاتی تھیں، عورت مکمل مادی ومعنوی حقوق سے بہرہ ور انسان تھی، وہ گری پڑی چیز نہیں تھی جیسا کہ ان جاہلوں کا خیال ہے، اور جیسا انہوں نے اسلام کی بابت بتا کر لوگوں کو دین سے نفور اور گریزاں کر دیا ہے، شیخ احمد موسیٰ سالم کہتے ہیں: ’’خالق کی حکمت وانصاف کی وجہ سے شریعت عورت کی معاون، اس کے ساتھ انصاف کرنے والی اور اس کو وہ تمام حقوق دینے والی ہے جو مردوں کو حاصل ہیں، ان حقوق نے عورت کو مرد کے ساتھ اپنے تعلق اور معاملہ میں آزادئ ارادہ سے نواز ہے‘‘۔ اس بات کو قاسم امین نے اپنی کتاب ’’تحریر المرأة‘‘ میں مزید زوردار انداز میں یوں کہا ہے: ’’شریعت اسلامی نے تمام دیگر شریعتوں اور قانونوں سے پہلے عورت کو مرد کے مساوی قرار دیا ہے، جب عورت ہر قوم میں نہایت بے حیثیت تھی تب اسلام نے اس کی آزادی اور اس کے مستقل وجود کا اعلان کیا تھا، اور اسے مکمل انسانی حقوق سے نوازا تھا، اور تمام سول معاملات میں اس کو مرد کے برابر قانونی اختیارات دیے تھے، اس کے تصرف کو اس کے والد یا شوہر پر موقوف نہیں چھوڑا تھا، یہ خصوصیات اب تک متعدد مغربی خواتین کو بھی حاصل نہیں ہوئی ہیں۔

ہاں اس سے کچھ استثناءات بھی ہیں، لیکن وہ شذوذ کے قبیل سے ہیں، اور ان کا سبب عورت کی توہین نہیں ہے، بلکہ ایسا عورت کی فطرت اور اس کی سماجی ذمہ داری کے پیش نظر ہے، ورنہ عام اصول تو وہی ہے جو اس آیت قرآنی سے معلوم ہوتا ہے: ’’ومن یعمل من الصالحات

من ذكر أو أنثىٰ وهو مؤمن فأولئک يدخلون الجنة ولا يظلمون نقيرا ''(اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مؤمن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اوران کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی)۔

دنیا کو اسلام کی شدید ضرورت ہے، جب کہ کچھ جاہل اور جوشیلے لوگ اس بات سے ناواقف ہیں، اور واقف کاروں کو ناپسند کرتے ہیں، وہ نہ خود عمل کرتے ہیں اور نہ عمل کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں، وہ اس عہد میں اسلام کی راہ کے روڑے ہیں، انہوں نے اسے ایسا آلودہ کردیا ہے کہ لوگ آنا نہیں چاہتے، یہ قوموں کو اسلام سے دور رکھنے کے مجرم ہیں۔

دین خداوندی کے یہ نادان دوست اس کے شدید دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہیں، اور کمال یہ ہے کہ ان کی آواز ہر چہار جانب گونج رہی ہے، ایسا لگتا ہے، کہ جیسے کچھ پوشیدہ شیطان اس آواز کو بلند کرتے ہوں، کیا یہ شیطان مغربی استعمار کے کارندے ہیں۔

عورت کا کردار گم گشتہ

امریکی میں باری باری حکومت کرنے والی دونوں سیاسی پارٹیاں یہودیوں کو راضی کرنے، ان کی مدد کرنے اور ہر میدان میں ان کے قدم جمانے کی خدمت انجام دینے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کررہی ہیں۔

امریکی سیاست داں وحکمراں یہ کام کرتے ہوئے شرافت، انصاف اورحقوق انسانی کے تقاضوں کا خون کرتے ہیں، بلکہ جب وہ عربوں پر یہودیوں کو ترجیح دیتے ہیں، اور محض دس ملین یہودیوں کی خاطر ایک ارب مسلمانوں کی حمایت سے محروم ہوتے ہیں تو خود اپنے ملک کے مصالح کا خون کرتے ہیں۔

اور یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ عربوں اور مسلمانوں کی زبردست اقتصادی حالت بھی امریکیوں کو ان حرکتوں سے باز نہیں رکھتی اور نہ ہی انہیں راہ اعتدال پر گامزن ہونے پر مجبور کرتی ہے۔

نہایت حیرت کی بات ہے کہ ایک عظیم امریکی قائد نے دوصدی قبل اپنی قوم کو یہودیوں کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''اگر امریکی دستور نے اگلے سو برسوں میں ان یہودیوں کو یہاں سے بھگانے کا کام نہیں کیا تو یہ اس ملک میں بڑی تعداد میں آجائیں گے، امریکی معاشرہ کو تباہ کردیں گے، اور جن انسانی اقدار پر یہ ملک قائم ہے انہیں بدل کر رکھ دیں گے۔''

اس مخلص خیرخواہ کا نام ہے: بینجامن فرینکلن، لیکن اس کی اس نداء پر کان نہیں دھرے گئے، اور نادان اکثریت کو اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب موقعہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

آج امریکہ کی صدارت کے امیدواران ایک دوسرے سے زیادہ یہودیوں سے وعدے کررہے ہیں، ایک کہتا ہے: پورا قدس اسرائیل کا ابدی دارالسلطنت ہے، دوسرا کہتا ہے فلسطینیوں کا کوئی ملک نہیں ہے، کوئی اور کہتا ہے کہ اسٹاروار کا پروگرام امریکا و اسرائیل کی حفاظت کے پیش نظر ہے۔

لیکن ایک غیر معمولی خبر نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کی ہے، اور میری خواہش ہے کہ عرب قارئین بھی اپنی توجہ اس پر کریں۔ یہ خبر یہ ہے کہ صدارت کے ڈیموکریٹک امیدوار کی بیوی اسرائیل کی زبردست حامی ہے، وہ اسرائیل کے ساتھ اپنے ظاہری و باطنی تعلق کا برسر عام اعلان کرتی ہے، اس کا کہنا ہے کہ اگر جوانی کے ایام وہ حملہ آور صہیونیوں کے ساتھ نہیں گزار سکی تو بقیہ پوری عمر وہ اسرائیل میں گزارے گی، یہ خبر ایک کثیر الاشاعت عربی روزنامہ نے اس عنوان کے ساتھ شائع کی ہے: ''وہائٹ ہاؤس کی اسرائیلی ملکہ''۔

خدا جانے کیوں یہ خبر پڑھ کر مجھے پانچ صدیوں پیشتر، سقوط اندلس کے دو ہیروؤں ''ایزابیلا اور فرڈینینڈ'' کا قصہ یاد آگیا، یہ بہت اہم قصہ ہے، لیکن ہم عربوں کا حافظہ ختم ہوگیا ہے۔

ہمارے یہاں عورت کا کوئی ثقافتی اور سیاسی کردار نہیں ہے، تربیت، و معاشرہ کی تنظیم میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، اور مسجد کے صحنوں سے لے کر جہاد کے میدانوں تک کے دروازے اس کے لئے بند ہیں۔

اس کا نام لینا عیب، اس کا چہرہ دیکھنا حرام، اور اس کی آواز کو مستحق پردہ کہا جاتا ہے، اس کی کل ذمہ داری دسترخوان سے لے کر بستر تک محدود ہے۔

جب کہ یہودی خاتون قیام اسرائیل میں فوجی و غیر فوجی طریقوں سے اپنا کردار نبھا رہی ہے، قریب ہے کہ وہ وہائٹ ہاؤس کی ملکہ بن کر ہمارے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دے،

اور ہمارے یہاں اب تک کچھ نام نہاد دیندار مسجد جانے اور جماعتوں میں شرکت کرنے کے عورت کے حق کی بابت لڑ رہے ہیں، ہم خود ہی اپنی موت کا آپ سامان کر رہے ہیں، کیا ہم ہوش کے ناخون لیں گے۔

مساواتِ مرد و زن قرآن سے ثابت ہے

مغربی یورپ کے ممالک اپنی ایک ایسی یونین بنانے جارہے ہیں، جو اقتصادی، سماجی اور سیاسی امور پر حاوی ہو، ہم اس وقت اس یونین پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ہماری اس گفتگو کا محور اس یونین کو وجود میں لانے والے فکری وروحانی تعلقات ہیں۔

اس موضوع پر گفتگو کرنے والوں نے یونانی فلسفہ کی میراث اور روم کی دینی میراث کو معاصر یورپ کی بنیاد قرار دیا ہے، اگرچہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے عہد میں ان دونوں میں کافی تبدیلی آچکی ہے۔

اور یہ بھی ہمارا موضوع گفتگو نہیں ہے، ہم اس وقت عورت سے متعلق چند پہلوؤں پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں، اس لئے کہ یہ پہلو اب تمام عالم میں پہنچ گئے ہیں، کہ یورپی تہذیب ہی عصر حاضر کی قائد ہے۔

یونانی فلاسفہ نے عورت کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار نہیں کیا تھا، اور نہ ہی اسے باعزت مقام ومرتبہ دیا تھا، بلکہ ان فلاسفہ کی تاریخ نہایت گھنونی ہے، جنسی شہوتوں کی تکمیل میں وہ صحیح وغلط کی بالکل تمیز نہیں کرتے تھے۔

رومیوں کی تاریخ بھی یونانیوں کی تاریخ سے بہتر نہیں ہے، حکمرانوں کی جنسی شہوتیں حدود نا آشنا تھیں، شاہی محل آزاد وغلام خواتین سے بھرے رہتے تھے۔

نصرانیت نے اس حدود نا آشنا رجحان کا مقابلہ رہبانیت سے کرنا چاہا، اور نتیجہ وہ سامنے آیا جس کی جانب اشارہ شاعر نے اپنے اس شعر میں کیا ہے:

إذا استشفيت من داء بداء   فاقتل ما أعلك وما شفاكا

(جب تم ایک مرض سے شفاء دوسرے مرض کے ذریعہ حاصل کرو تو مرض اور ذریعہ شفا دونوں کو قتل کردو)

ان دین داروں (راہبوں) کی حرکتیں دنیاداروں جیسی بلکہ ان سے بڑھی ہوئی ہی تھیں۔ میں نے عورت کی جانب میلان پر غور کیا تو پایا کہ درویشوں کو بادشاہوں کے یہاں لذت اندوزی کے لئے بے شمار خواتین پر حسد تھا، وہ چاہتے تھے کہ یہ یا ان جیسی خواتین ان کے پاس بھی ہوں۔ انہیں اس کی تکلیف نہیں تھی کہ حضرت سلیمان کے پاس (عہد نامۂ قدیم کے بیان کے مطابق) ایک ہزار عورتیں تھیں، انہیں اس بات پر بھی افسوس نہیں تھا کہ ان ایک ہزار عورتوں سے سیکڑوں کو اپنے حقوق نہیں مل رہے ہیں، یا وہ ایک ایسے مرد سے محروم ہیں جو ان کا اور یہ اس کا خیال رکھیں، ہرگز وہرگز انہیں اس کا ملال نہیں تھا، انہیں تو بس یہ غم تھا کہ لذت اندوزی کا یہ خزانہ صرف ایک شخص کی ملکیت میں کیوں ہے؟ اسی لئے جب بادشاہت ختم ہوئی تو انہوں نے ایک شخص کے لئے مخصوص خواتین کو سب کے لئے عام کردیا، یا بقول شیخ احمد موسیٰ سالم:
''ریسٹورینٹس، ہوٹلوں، فٹ پاتھوں اور پارکوں میں درختوں کے نیچے سب کے لئے دروازہ کھول دیا گیا، اسی طرح رقص کی محفلوں اور نائٹ کلبوں میں ان کو متاعِ عام بنادیا گیا، کہ اب جو چاہے، جس کے ساتھ چاہے، جیسی چاہے حرکتیں کرے، اخلاق، پاکدامنی، تناسل کے ضابطوں اور خاندان کی بابت خداوندی احکام سے صرف نظر کرنے کا یہ عجیب وغریب نمونہ ہے:''

''قدیم محدود حریم کا یہ بدل ہے، یہ ایک نئی قدر ہے جو ہر ایک شخص کے لئے روا ومہیا ہے، اور 'آتش زنِ ہر خرمن' ہے''۔

حیوانی شہوتوں کو بے لگام کرنے والی اس خدا بیزار تہذیب کو ہر مسلمان اپنے دین اور اپنی امت کے لئے خطرہ محسوس کرتا ہے۔

اس مہلک وبا کے علاج کے طور پر ہم جس اسلام کو پیش کرتے ہیں اس کی حقیقت ان

لوگوں کے کلام سے معلوم نہیں کی جاسکتی جو عورت کو اسیر رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ بیچاری اپنے گھر سے صرف سسرال اور قبر کے لئے ہی نکل سکتی ہے، بلکہ اس اسلام کو ہم کتاب وسنت کی واضح اسلامی تعلیمات سے ہی اخذ کریں گے۔

اسلام کے لئے ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس کے بعض نام لیوا معنوی تحریفیں کرتے ہیں، موضوع یا معلول حدیث کی بنیاد پر واضح قرآنی آیات واحادیث کو بے اعتبار کردیتے ہیں۔

قرآن مجید پر غور وتدبر کرنے والا ہر شخص اس میں مردوزن کے درمیان عام مساوات پائے گا، اس نے اگر مرد کو زیادہ حق دیا ہے تو صرف اس لئے کہ اس کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داری ہے، ایسا محض مرد کو برتر ثابت کرنے کے لئے نہیں ہے۔

گھریلو معاملات میں مرد کی قوامیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مساوات کا اصل حکم ختم ہوگیا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے عوام کی حکومت کے تئیں اطاعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عوام بے حیثیت ہیں، دراصل اجتماعی نظاموں کے اپنے فطری تقاضے ہوتے ہیں، ان کی تشریح میں مبالغہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

بعض لوگ خواتین کے بارے میں نہایت مہمل باتیں کرتے ہیں، ایسے ہی ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ بیوقوف بچے اور عورتیں ہی ہیں، میں نے ان سے پوچھا: آپ یہ کس کا قول روایت کررہے ہیں، کسی معزز شخص کا یا کسی دیہاتی کا؟ ایسے ہی ایک صاحب کہنے لگے عورت اس آیت قرآنی کا مصداق ہے: ''**كل على مولاه أينما توجهه لا يأت بخير**'' (اپنے آقا پر بوجھ ہے، آپ اسے جہاں بھیجیں خیر لے کر نہیں لوٹے گا) میں نے ان سے کہا یہ صفت بہت سے انسانوں کی ہے اس میں مردوزن کی کوئی تمیز نہیں ہے، بلکہ ہر وہ مرد اور عورت اس کا مصداق ہے جو بیچارا عقلی طور پر کم ہو، اور کچھ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ صفت پورے عالم کے ان اکثر مسلمانوں کی

ہے جنہوں نے اپنی ذمہ داری کو فراموش کیا، قرآن مجید سے صرف نظر کیا اور اب غالب تہذیب کے خوشہ چیں بن کر رہ رہے ہیں۔

میں اسلام کے لئے دو طرح کے لوگوں کو خطرناک سمجھتا ہوں: ایک اس کو غلط قرار دینے والے اس کے دشمن، اور دوسرے اس کے نادان دوست، میں پھر اپنی وہی بات کہوں جو میں نے اوپر کہی تھی کہ: مجھے جیسی دشمنی وبائی امراض سے ہے ویسی ہی نقلی دواؤں سے بھی ہے۔

ثقافتی محاذ پر اسلام کے دشمن ہماری جس غلطی اور کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ خواتین کی بابت ہمارے بعض حضرات کا غلط موقف ہے، یہ لوگ عورت کو اسلام کے عطا کردہ ہر حق کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر کے اس کو معطل کرنا چاہتے ہیں۔

خود میں اس زمانے کا گواہ ہوں جب ازہر یونیورسٹی میں خواتین کی تعلیم کے مخالف تھا، اسی طرح یہ بات بھی مجھے معلوم ہے کہ بہت بڑی تعداد میں بدوؤں نے ریاض جا کر گرلس اسکولوں کی مخالفت کی تھی۔

اگر چہ اب حالات بڑی حد تک بدل گئے ہیں، لیکن دونوں صنفوں کے درمیان تعلق اور ان کے عام وخاص حقوق کی بابت صحیح صورت حال وجود میں نہیں آسکی ہے، اس لئے کہ کچھ لوگ قرآنی نہج پر آنے کو تیار نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويقيمون الصلاة ويؤتون الزكاة ويطيعون الله ورسوله**'' (مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے، اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکاۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں)، دونوں صنفوں کے درمیان حق کی مدد، باطل کی مخالفت، نماز کے قیام، زکاۃ کی ادائیگی اور اطاعت خداوندی کا تعلق ہے، یہ وہ تعلق ہے جس کے ذریعہ پورا

معاشرہ ایک نہج اور ایک مقصد کی حامل اکائی بن جاتا ہے۔

ایک مومن مرد اور عورت کے درمیان عقد ہونے سے یہ تعلق مزید پختہ ہوکر ایک ایسے نئے تعلق کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو ایمانی اخوت، ذمہ داریوں کے اشتراک، رفاقت زندگی، اور اتحاد مقصد سے عبارت ہے۔

وہ معاشرہ نہایت گھٹیا معاشرہ ہے جو شادی کے عقد کو ایک جسم سے نفع اٹھانے کا عقد سمجھے، یا جو نکاح کی تعریف یہ کرے کہ وہ مال کے بدلے شرمگاہ خریدنے کا عقد ہے، یا جو شادی کو مرد و زن کے درمیان ایسا تعلق قائم کرنے کا عقد سمجھے جس کے مطابق مرد تو فیلڈ مارشل ہو جاتا ہے اور عورت کو چپراسی کی حیثیت ملتی ہے، اس خام تصور میں محبت، جذبہ رحم، پاکیزگی اور وفا شعاری کا کیا گزر؟؟

جب میں یہ پڑھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحب زادی حضرت فاطمہ کے ہاتھ پر چکی چلاتے چلاتے ورم آجاتا تھا، اور مشکیزہ بھر کے پانی لانے سے کندھے شل ہو جاتے تھے، تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ محض مرد کی خادم عورت نہ تھیں، انہوں نے اپنا سب کچھ اپنے شوہر اور اپنی اولاد کی نذر کر دیا تھا۔

اس گھر کا حال یہ نہیں تھا کہ مرد گھر کا مالک ہو اور اپنے احکام چلاتا ہو، اور بیچاری عورت ان حکموں کو چار و ناچار بجالاتی ہو، بلکہ یہ مرد و زن یہاں خوشی اور غم کے شریک تھے، اور اس طرح یہ دونوں دو معاملات میں کامیابی حاصل کرتے تھے: دینی زندگی اور ان دونوں کی اپنی مخصوص زندگی۔

ایسی ہی بات مجھے حضرت اسماء بن ابی بکر (حضرت زبیر بن عوام کی اہلیہ) کے اس قول میں بھی محسوس ہوتی ہے: "میں زبیر کی ہر گھریلو خدمت کرتی، ان کے گھوڑے کی فکر رکھتی، اس کو چارا دیتی، اس کے لئے گھاس کاٹ کر لاتی، ڈول بناتی، پانی لاتی اور ان کی اس جائداد سے اپنے

سر پر لاد کر گھٹلیاں لاتی جو دو تہائی فرسخ دور تھی۔

جمہور فقہاء کے نزدیک عورت شوہر کی خدمت کی مکلّف نہیں ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ وہ مقام نہیں ہے جہاں قانونی فیصلے ہوں، بلکہ اس سلسلے میں تو مومن شوہر و بیوی کے درمیان قائم ازدواجی تعلقات و ذمہ داریوں کا فیصلہ ہی معتبر ہوگا۔ یہ جذبۂ ایثار کا میدان ہے اپنے حقوق جتانے کا نہیں۔

مرد یقیناً اپنے گھر کا ذمہ دار ہے، لیکن یہ ''قوامیت'' عزت افزائی سے زیادہ ذمہ داری اور مقام ومرتبہ میں اضافہ سے زیادہ قربانی ہے۔ پریشانی یہ ہے کہ مسلم زوجین میں ناواقفیت عام ہے، دونوں صنفوں کے درمیان تعلق پر صرف شہوت کے پہلو سے ہی غور کیا جاتا ہے، رہی اس دنیا میں امت کی عظیم ذمہ داری تو اس کا علم والدین میں سے کسی کو نہیں ہے، شادی ان کے نزدیک بس عقد نکاح کا نام ہے جس میں زیادہ طاقتور کی حکمرانی چلتی ہے۔

کاموں کی نوعیت کا لحاظ لازمی ہے

ہر میدان میں مرد وزن کی مساوات کے جنون کا ایک ایسا قصہ سننے میں آیا ہے جسے ریکارڈ میں لانا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ بعض لوگ تمام میدانوں میں عورت کی شرکت کے قائل ہیں۔

قاہرہ کی بسیں سواریوں سے اتنی بھری ہوئی ہوتی ہیں کہ ان میں ایک توانا مرد کا چڑھنا بھی کارے دارد ہے، تو پھر لڑکیوں کے لئے کیا حال ہوگا؟

میں نے ایک عرب ملک کی راجدھانی میں ایک خاتون ٹریفک پولس دیکھی، مجھے خیال ہوا کہ یہ ایک مشکل کام ہے، اس میں عورتوں کو نہیں لگانا چاہئے، عورتوں کو مثلاً عورتوں ہی سے تفتیش کرنے جیسے مخصوص اعمال کی ذمہ داری دے دینی چاہئے، تیز سردی اور گرمی میں سڑکوں پر کھڑے ہونے اور گاڑیوں و پیدل چلنے والوں پر نظر رکھنے کا کام ان سے نہیں لینا چاہئے۔

ایسے ہی میرے نزدیک ہوائی جہازوں میں کام کرنے کی استطاعت مردوں میں عورتوں سے زیادہ ہے، ''ایر ہوسٹس'' کا منصب ختم ہو جانا چاہئے، بالخصوص ان لمبے سفروں میں تو اس کی بالکل گنجائش نہیں ہونی چاہئے، جن میں راتوں میں ہوٹلوں میں سونا اور کئی دن گھر سے دور رہنا پڑے۔

میرے ایک دوست ماسکو سے آئے، تو انہوں نے بتایا کہ وہاں عورتیں صبح سویرے سڑکیں دھوتی ہیں، اور تمام کام کرتی ہیں۔ اور ڈیوٹی کی سختیاں نسوانی نزاکت کو ختم کیا چاہتی ہیں، انہوں نے مجھ سے یہ بھی ذکر کیا کہ ایک دن شام کے وقت انہیں ایک عورت گھر واپس ہونے کے لئے گاڑی پر سوار ہوتی نظر آئی، اس کا حال نہایت برا تھا، خدا جانے وہ نشہ میں تھی، یا تھکن نے

اسے توڑ دیا تھا۔

کاموں میں اس مساوات کو میں غلط سمجھتا ہوں، اپنی جوانی میں میں نے اپنے گاؤں میں ایک مرد اور اس کی بیوی کو رہٹ چلاتے ہوئے دیکھا، وہ دونوں سینچائی کر رہے تھے، میں نے سوچا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے، اسے میں نے چلایا تھا تو تھک گیا تھا، اس لئے کہ اس کے ہر چکر میں انسان کو کئی گیلن پانی کھینچنا پڑتا ہے، (گیلن عام طور پر ساڑھے چار لیٹر کا ہوتا ہے۔مترجم) کسان خاتون بوائی جیسے کام کر سکتی ہے، مامتا اور نسوانیت کو مشکل کاموں میں مبتلا نہیں کرنا چاہئے۔

اسی لئے میں ولڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی اس حالیہ تجویز سے مطمئن اور متفق ہوں کہ: عام حالات میں عورت کو اپنی فطرت کے لئے ناموزوں اور نہایت محنت والے کاموں کو انجام نہیں دینا چاہئے، اس لئے کہ ایسے بھی بہت سے میدان ہیں جن میں عورت اچھی طرح کام کر سکتی ہے اور وہ اس کی فطرت کے لئے موزوں ہیں، مثلاً تعلیم، طب، نرسنگ، خدمت خلق، تصنیف و تالیف اور بھی دیگر آسان و کم محنت طلب کام، اس کے علاوہ وہ باعزت طریقہ سے بازار میں خرید و فروخت کر سکتی ہے۔

لیکن اگر عورت مردوں جیسے تمام کام کرنے کی کوشش کرے، مثلاً پولس کے کام کرنا چاہے، میکینک، کارخانوں میں مزدوروں، سڑکوں کی صفائی اور ٹرک وغیرہ چلانا چاہے تو یہ سارے کام اس کے لئے مناسب نہیں ہیں، اور انہیں انجام دینا اس کے لئے جائز نہیں ہے، کہ ان میدانوں میں شاذ و نادر عورتیں ہی مردوں کے مساوی ہو سکتی ہیں۔

صنعتی میدان میں فوقیت رکھنے والے ممالک بھی عورت کے کام کو مرد کے کام کے برابر نہیں سمجھتے ہیں، اسی لئے عورتوں اور مردوں کی تنخواہوں میں فرق پایا جاتا ہے، عالمی پیمانے کے بعض اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ایک ہی کام سے متعلق عورتوں کی اجرت مردوں سے ۵۹%

سے ۹۷% تک ہی ہوتی ہے۔

اس موقع پر مشہور اخبار ہیرالڈ ٹریبیون کے شمارہ ۳۲۶۵۰ بابت ۱۶ر فروری ۱۹۸۸ء میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کا تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ہارورڈ یونیورسٹی میں جنرل ہیلتھ کی استاذ ڈاکٹر روز فریشن نے ۲۱ر سے لے کر ۸۰ر برس تک کی ۵۳۹۸ خواتین پر ایک مطالعہ کیا، اور اس کے نتائج انہوں نے امریکی انجمن برائے ترقی علوم کے سالانہ جلسے میں پیش کئے، وہ اپنے مطالعہ کے نتیجہ میں مندرجہ ذیل نتائج تک پہنچے تھے۔

۱- سرگرم کھلاڑی خواتین کو نظام حیض میں خلل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور وہ جتنے عرصہ یہ سرگرمیاں جاری رہتی ہیں بچوں کی پیدائش کے قابل نہیں رہتی ہیں، ہاں ان سرگرمیوں کو روک کر وہ اس فطری صلاحیت کو دوبارہ حاصل کرسکتی ہیں، موصوفہ نے عورتوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: عورت ہر کام نہیں کرسکتی ہے، تم میں سے ہر ایک بہترین کھلاڑی اور مشہور اولمپین بن سکتی ہے، لیکن اگر اسے ماں بننے کی خواہش ہو تو پھر اسے کھیل چھوڑنا ہوگا۔ اس لئے کہ معمولی پریکٹس بھی عورت کے نظام ولادت کو زبردست نقصان پہنچا سکتی ہے۔

۲- جن خواتین پر یہ مطالعہ کیا گیا ان میں سے ۲۶۲۲ کھلاڑیوں میں پستان کے کینسر، شوگر یا رحم مادر کے کینسر کے Symptoms دیکھے گئے، جب کہ دیگر ۲۷۷۶ خواتین میں یہ Symptoms نظر نہیں آئے۔

۳- ہارورڈ یونیورسٹی کی اس تحقیق کی طرح البرٹا یونیورسٹی (Alberta مغربی کینیڈا کا ایک ضلع ہے۔ مترجم) کی تحقیق بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ اس طرح کے اعمال میں عورت کی شرکت اسٹروجین (Oestrogen) نامی اس ہارمون کو بہت نقصان پہنچاتا ہے جو عورت کے نظام ولادت میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

۴- کنیڈین یونیورسٹی کی ایک تحقیق بھی اس تحقیق کی طرح یہ ثابت کرتی ہے کہ ایسی

محنت کرنے والی خواتین کا حیض کا نظام اگر صحیح بھی ہو تب بھی ان کے ولادت کے نظام کو نقصان پہنچتا ہے۔

ان تجربوں اور تحقیقات کے بعد ہمارے نزدیک عورت کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے فطری حدود کا پاس کرے، اور ان سخت محنت طلب میدانوں میں مرد کے ساتھ مطلق مساوات کی کوشش نہ کرے۔

آیئے! معاشرہ کو پاکیزہ بنائیں

ایک سنگین مسئلہ یہ ہے کہ انسانوں کے یہاں جنسی شہوت کا آغاز عمر کی اس منزل (تقریباً ۱۵/سال کی عمر) میں ہوتا ہے جب عقل کامل نہیں ہوتی، ازدواجی وخانگی زندگی کی ذمہ داریاں اٹھانے کی استطاعت نہیں ہوتی، اور ایک دوسرے کے ساتھ منصفانہ وباعزت سلوک کرنے پر بھی قدرت نہیں ہوتی ہے۔

شادی محض ایک بدنی تقاضہ کی تکمیل نہیں ہے، بلکہ وہ ایک مادی، اخلاقی اور سماجی بندھن ہے جو متعدد صلاحیتوں کا متقاضی ہے، ان صلاحیتوں کے پائے جانے تک اسلام نے لڑکوں اورلڑکیوں کے لئے ایسے احکام دیے ہیں جوان کی زندگی پاکیزہ اور بااخلاق بنائے رکھیں۔

میرے نزدیک دن میں پنج وقتہ نمازوں کی ادائیگی کا برے وسوسوں سے محفوظ رہنے میں بڑا کردار ہے، پھراس کے علاوہ اسلام نے پوشیدہ جنسی خواہشات کو بھڑکانے والے امور کو ممنوع بھی قرار دیا ہے۔

شرعی حجاب، جھکی نگاہیں، زینت کو ظاہر نہ کرنے، حدود نا آشنا اختلاط سے مرد وزن کو دور رکھنے اور خالی وقتوں میں علمی، سماجی اور بوقت ضرورت عسکری جہاد کی مشغولیت اچھے اخلاق وصفات پر معاشرہ کی تعمیر میں بہت اچھا کردار ادا کرتے ہیں۔

پھر وہ شادی ہوجاتی ہے جسے جلدی کرنا اور بے جا دکھاوے، اسراف اور تکلفات سے دور رکھنا ضروری ہے، ان چیزوں کے ذریعہ انسان ہی اپنے آپ کے لئے پریشانیاں کھڑی کرتا ہے، وہ پہلے خرافات کی باتیں ایجاد کرتا ہے اور پھر ان کو مقدس جانتا ہے۔

متعدد ممالک کے مسلمانوں نے حلال (شادی) کو نہایت مشکل بنا رکھا ہے، اور شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے وسائل کا دروازہ کھولدیا ہے، تاکہ پرسکون جذبات بھڑک اٹھیں، یہاں تک کہ ٹیلی ویژن پر مختلف چیزوں کا اشتہار نہایت بے حیا لباس پہنے نوجوان خواتین کرتی ہیں، بلکہ بعض پروگرام ایسی لڑکیاں پیش کرتی ہیں جو مغرب کے جدید ترین ہیر اسٹائل Hairstyle میں نظر آتی ہیں، بلکہ بسا اوقات تو یہ لڑکیاں ایک دن کے اندر کئی طرح کے Hairstyles میں پردہ پر آتی ہیں۔

مشہور مؤرخ ول ڈیورنٹ نے اپنی کتاب ''مباھج الفلسفة'' میں لکھا ہے:

شہری زندگی شادی کی راہ میں ہر رکاوٹ ڈالتی ہے، وہ لوگوں کے سامنے جنسی تعلق کا ہر سبب پیش کرتی ہے، اس تعلق کو قائم کرنے کی تمام مشکلات کو آسان کر دیتی ہے۔ جنسی شہوت کا نشو نما اب ماضی کے مقابلے کم عمری میں ہو جاتا ہے، جب کہ اقتصادی نشو ونما میں تاخیر ہوتی ہے، زراعتی اقتصادی نظام میں شہوانی جذبات کو قابو میں کرنے کو عملی و صحیح طریقہ سمجھا جاتا تھا تو اب وہ نہایت مشکل ہو گیا ہے، اور اس صنعتی تہذیب میں غیر فطری نظر آنے لگا ہے جس نے مردوں کی شادی کی عمر بھی بڑھا دی ہے، اب شادیاں تیس سال کی عمر میں ہوتی ہیں، اب جسم کو شہوانی جذبات کی رو میں بہنے سے بچانے اور زمانہ ماضی کی طرح نفس کو قابو میں رکھنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ہے، وہ پاک دامنی جو پہلے شرافت کی دلیل سمجھی جاتی تھی اب مذاق کا سبب بن گئی ہے، اور وہ حیاء جو حسن کو دوبالا کرتی تھی ناپید ہے۔

اب مرد غلطیوں میں مبتلا ہونے پر فخر کرتے ہیں، اور عورتیں مردوں کے ساتھ مساوات چاہتے ہوئے غیر محدود تعلقات کا حق طلب کرتی ہیں، شادی سے پہلے جنسی تعلق کا قیام ایک عام بات ہے، ماضی کے اخلاقی قانون کی دھجیاں اڑادی گئی ہیں اور متمدن دنیا اس قانون کا اعتبار نہیں کرتی ہے۔

شادی کی تاخیر کے نتیجہ میں جو سماجی بگاڑ وجود میں آتا ہے ہم اس کی مقدار کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے، ہمارے نزدیک اس بگاڑ کا اصل سبب عہد حاضر میں ازدواجی زندگی کے آغاز میں ہونے والی غیر فطری تاخیر ہے، شادی کے بعد جو حرکتیں پائی جاتی ہیں وہ عام طور پر شادی سے پہلے کی عادت کا شاخسانہ ہوتی ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ بھی کم دردناک نہیں ہے، اس لئے کہ ہر وہ شخص جو شادی تاخیر سے کرتا ہے سڑکوں پر بے حیائی کا لباس پہنے لڑکیوں سے پینگیں بڑھاتا ہے، مرد شادی کی تاخیر کے عرصہ میں اپنے مخصوص جذبات کی تسکین کے لئے جدید ترین فیشن کے حامل اس عالمی نظام سے فائدہ اٹھاتا ہے جسے باقاعدہ ایک فن کا نام دیا جاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ دنیا نے جذبات بھڑکانے اور ان کی تسکین کا ہر ممکن طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔

ول ڈیورنٹ اپنی کتاب میں آگے لکھتا ہے۔

''پھر جب شہری لڑکی انتظار سے اوپ جاتی ہے تو پھر وہ بدترین صورت حال سے مدد لیتی ہے، اظہار محبت، انٹرٹینمنٹ، کپڑوں کے ہدیے اور چیمپین کی مجلسوں کے ذریعہ اس کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں، بسا اوقات اس کی آزادروی اس کی اقتصادی آزادی پر غلط اثر ڈالتی ہے، وہ معاش کے سلسلے میں مرد پر اعتماد نہیں کرتی ہے، بسا اوقات مرد اس کی جیسی فنون محبت میں ماہر خاتون سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے، لیکن اس عورت کی اچھی کمائی کی وجہ سے وہ تردد چھوڑ دیتا ہے، ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ دونوں جس طرز معیشت کے عادی ہوتے ہیں اکیلی مرد کی حقیر آمدنی اس کے تکفل کے لئے کافی نہیں ہوتی ہے''۔

یہ بدترین حال اب سے ساٹھ سال پہلے کا ہے، اور اس کا اصل سبب وحی الٰہی سے کنارہ کشی، خواہشات نفس کا اتباع اور انسانوں کا اپنی خواہشات کے پیچھے ایسا اندھا ہو جانا ہے کہ پھر انہیں نہ دین روک پاتا ہے اور نہ ہی آخرت کے عذاب سے وہ ڈرتے ہیں۔

حقیقی اسلام نہایت مفید علاج ہے، پاکیزہ معاشرہ کے قیام کے لئے اس نے مختلف عناصر پیش کئے ہیں، وہاں آبروئیں محفوظ ہوتی ہیں، پاکدامنی کا چلن ہوتا ہے، نمازیں اس معاشرہ کے چھوٹے بڑے تمام افراد کو نظام کا پابند کرتی ہیں، نمازوں کی ادائیگی پر بڑی باریک بینی اور ہوشیاری کے ساتھ نظر رکھی جاتی ہے، کھانے، لباس، سونے، گھروں میں جانے سے پہلے اجازت لینے اور دوستوں ورشتہ داروں کی مہمان نوازی میں شعائر اسلام کی رعایت کی جاتی ہے۔

راستہ کے اسلامی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر بیٹھنے والے اور وہاں سے گزرنے والے بری باتوں، غلط نظروں اور بے حیائی کے ہر منظر کو تا حد امکان ختم کرنے کی کوشش کریں۔

اگر ہر شخص دوسرے شخص کو رضائے خداوندی والی راہ پر جمائے رکھے تو سڑکوں پر کوئی بے حیا نہ بچے گا، اور بے حیائی جائے پناہ نہ پائے گی۔

میڈیا کی ذمہ داری ہے کہ وہ نافع ثقافت کا دائرہ وسیع کرے، اور پاکیزہ اور اچھے مقصد والا انٹرٹیمنٹ مہیا کرائے۔

معاشرہ متعدد پہلوؤں کا حامل ہے، گھروں کی حفاظت، پاکیزگی کا فروغ اور اگلی نسلوں کو راہ راست پر رکھنا اس کی ذمہ داری ہے۔

جنسی بم کا خطرہ

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (شرق اوسط) کے ایک پروگرام میں شرکت کا اتفاق ہوا، جس سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا، اور متعدد انسانی حقائق کا علم ہوا، اس وقت انہی کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

جارج ہارفٹ اپنی کتاب ''جنسی انقلاب'' میں لکھتا ہے: اب جب کہ ہم ایٹم بم کے ڈر سے مامون ہوگئے ہیں، اور دنیا کی بڑی طاقتوں کے درمیان صلح ہو جانے سے ہمیں اس جانب سے بے فکری ہوگئی ہے، عالم انسانیت کے سامنے ایک بہت قابل فکر مسئلہ یہ کھڑا ہوگیا ہے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں جنس (Sex) نہایت اہمیت حاصل کرتی جارہی ہے۔

کیا ہم جنسی شہوتوں کی ٹھاٹے مارتی موجوں اور بے حیائی کے سیلاب سے ڈر محسوس نہیں کرتے ہیں؟ اس بے راہ روی کے ممکنہ خطرات کی بابت سنجیدگی سے سوچنا چاہئے۔

دنیا کے مستقبل کی جانب سے فکرمند لوگوں کا احساس ہے کہ ہر دن ہزاروں ٹن جنسی بم پھٹتے ہیں، اور زبردست تباہی مچاتے ہیں۔

''سچی بات یہ ہے کہ نوخیز نسلوں کا مستقبل نہایت پرخطر ہے، آج کے بچوں کو اگر جنسی جذبات بھڑکانے والے نت نئے اسباب ملتے رہے تو وہ وحشی ہو جائیں گے اور پوری انسانیت مسخ ہو کر رہ جائے گی......''

جیمس رسٹن نے نیویارک ٹائمس میں لکھا ہے: جنسی بے راہ روی کا نقصان بالآخر ایٹم بم سے زیادہ ہوگا۔

مشہور مؤرخ آرنلڈ ٹوینبی کا کہنا ہے کہ انسان کے طرز زندگی پر جنسیات کا غلبہ

تہذیبوں کو ہلاک بھی کرسکتا ہے۔

حرام تعلقات کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں رہ گیا ہے، بلکہ اس نے کینسر کی شکل اختیار کرلی ہے، اور بہت عام ہوگیا ہے، شیطان نے اسے زبردست ترقیوں سے ہم کنار کیا ہے۔

اب جنس سے مراد میاں بیوی یا غیر قانونی طور پر دو لوگوں کے درمیان معروف حسی تعلق نہیں رہ گیا ہے، بلکہ اس نے اپنی پوری ایک دنیا آباد کرلی ہے، جس کے اپنے طریقہ اور اپنے وسائل ہیں۔

آج یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان کسی بڑے شہر میں جنسی بے راہ روی کے مظاہر کا حقیقی سامنا کئے بغیر کہیں آجا سکے، ...... ہر وقت نگاہوں کے سامنے مختلف سائزوں کے اشتہارات، مجلّات، باتصویر کور، سینیما، نائٹ کلبس کے دروازوں پر لگی ہوئی تصویریں اور ہزاروں لڑکیاں وخواتین ایسے لباسوں میں نظر آئیں گی جنہیں اب سے کچھ پہلے تک حقیر لباس سمجھا جاتا تھا۔

مردوں اور عورتوں کے ہم جنس تعلقات، اجتماعی جنسی اعمال، تجرباتی شادی، مادر زاد برہنوں کی مجلسیں، فحش رسالے، بے حیا جنسی فلمیں اور بے حیا تصویریں وغیرہ متعدد معاشروں کی نمایاں خصوصیت بن گئی ہیں۔

اسلام نے اللہ سے غفلت اور غلبۂ شہوت یا نماز سے غفلت اور اتباع شہوات کو لازم وملزوم قرار دیا ہے...... اسی لئے اسلام نے جب مسجدوں میں عورتوں کو آنے کی اجازت دی تو انہیں مردوں کے ساتھ نہیں کردیا، بلکہ ان کے لئے الگ مخصوص صفیں بنوائیں اور انہیں یہ حکم دیا کہ وہ باحیاء لباس زیب تن کرکے اللہ کے تئیں خضوع کا رویہ اختیار کرتے ہوئے آئیں۔

اور دونوں صنفوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا، اور بالخصوص عورتوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی زینت کا مظاہرہ نہ کریں، ہاں چہرے اور ہتھیلیاں کھولنے کی اجازت ہے۔

''اورشادی کی عام ترغیب دیتے ہوئے اسے نصفِ دین قرار دیا۔''

غلو پسندوں نے ان ساری چیزوں سے صرف نظر کرلیا، اورعورتوں کو گھروں میں قید کردیا، اورشادی کے لئے ایسی رسمیں بنالیں جنہوں نے اسے نہایت مشکل کام بنادیا ہے۔

ہم اس غلو سے اسلام اور مسلمانوں کی عالمی ومقامی طور پر بننے والی تصویر پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔

عرب جب مغربی ممالک جاتے ہیں تو ان کی یہ روشیں ان کے لئے عار کا سبب بنتی ہیں، اور ہر مقام پر ان کی سامانِ شہوت کی تلاش سے حیرت ہوتی ہے۔

کیا ہم اپنے ممالک میں اسلامی ہدایات کی تنفیذ کے مناسب ترین طریقہ کی بابت سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر نہیں کریں گے؟

اسلام دیارِ غیر میں

لاکھوں فرانسیسیوں نے اسلام قبول کیا ہے، یقیناً یہ ہدایت یافتگان اللہ تعالیٰ کی اس توفیق کو اپنی خوش بختی جانتے ہیں، اوراس راہ میں قدم قدم پر آنے والی پریشانیوں کی چنداں فکر نہیں کرتے۔

فرانس زمانۂ قدیم سے ہی اسلام کے سخت ترین دشمنوں میں سے رہا ہے، پہلی صلیبی جنگ کا آغاز اس نے ہی کیا تھا، اور پچھلی دوصدیوں میں اس نے الجزائر کے خلاف خالص مذہبی جنگ لڑی، اور اسے بری طرح تباہ کردیا، جنرل ڈی گاؤلی (De Gaulle) نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ صرف اس کے عہد میں فرانسیسی قوم نے الجزائر کو عیسائی بنانے کی مہم میں مدد کرنے کے لئے ڈیڑھ سوٹن سونا دیا تھا۔

اکثر فرانسیسی کیتھولک ہوتے ہیں، جب پروٹسٹنٹس نے ملک میں اپنے فرقہ کی تبلیغ کرنی چاہی تو اکثریت نے اس فرقہ پر نہایت ظلم کئے، کہ ۴۰ ہزار افراد قتل کردیے اوراس طرح ان کی تحریک کو ختم کردیا۔

ان تاریخی حقائق کا ذکر میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ لوگوں کو اندازہ ہوجائے کہ جن فرانسیسیوں نے اسلام قبول کیا ہے وہ بڑی رکاوٹوں کو پار کرکے داخل اسلام ہوئے ہیں، انہوں نے نہایت پریشانیاں اٹھائیں اور بہت خطرات مول لئے ہیں، پھر بات شاید صرف اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ شاید فرانس میں اسلام کی داغ بیل ان مسلمانوں کے ہاتھوں پڑی تھی جو افریقہ او ربعض ایشیائی ممالک سے وہاں گئے تھے، وہ عقلی اور اخلاقی طور پر بلند معیار کے لوگ نہیں تھے، ان کا دینی حال بھی اچھا نہیں تھا، ان کی اکثریت نہایت معمولی پیشوں سے وابستہ تھی، اور یہودیوں کا حال بہر اعتبار ان سے بہتر تھا۔

اس بات کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب فرانس کو الجزائر پر قبضہ کرنے

کے بعد وہاں زبردست دینی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے سوچا کہ وہ لبنانی موارنہ کو اس شورش زدہ علاقہ میں بھیج دے، لیکن ایسا اس لئے نہیں ہوسکا کہ فرانس کو ان لوگوں کی شرق اوسط میں ضرورت تھی، اور ان کا کوئی اور بدل تھا نہیں۔

پہلے میں سمجھتا تھا کہ صرف لاطینی قومیں ہی اسلام کے ساتھ ایسا بغض رکھتی ہیں، لیکن ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں ہزاروں کمزور مسلمانوں کی ہلاکت کے بعد اندازہ ہوا کہ اس شدید آزمائش کے پیچھے انگریزوں کی سیاست کارفرما ہے۔

اسلام کی بابت یورپ کے موقف اور اسلام کے خلاف اس کی سیاست (دونوں) کے بہت گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے، عسکری استعمار کا عہد تقریباً ختم ہوگیا۔ لیکن اب مذہبی جنگ کا ایک نیا عہد شروع ہوا ہے، اس جنگ کا ہمیں ہر جگہ سامنا ہے، اس لئے ہمیں اس پر توجہ دینی چاہئے۔

ڈاکٹر حسان حتوت لکھتے ہیں: دوسری عالمی جنگ میں اپنے لاکھوں افراد گنوانے کے بعد یورپ نے معاشی حالات خراب ہونے کے ڈر سے یا اپنی خوش حالی کو یقینی بنانے کے لئے تحدید نسل کی تحریک چلائی، اس کے نتیجہ میں اسے مزدوروں کی کمی پڑی تو اس نے بیرونی ممالک سے مزدوروں کی آمد کا سلسلہ شروع کیا، اور کم تنخواہوں پر ان مزدروں کو حاصل کرکے یورپ بہت خوش بھی ہوا۔

یہ مزدور فقر واستبداد کے اسیر ممالک سے آئے تھے، یہاں کی نئی زندگی انہیں بہت اچھی لگی، اس لئے انہوں نے یہیں قیام کا فیصلہ کیا اور ان ممالک کی شہریت حاصل کرلی، رفتہ رفتہ ان ممالک میں ان کی ایک حیثیت ہوگئی، اور وہ معاشرہ جو اب تک ایک نسل اور ایک مذہب کے وابستگان پر مشتمل تھا متعدد نسلوں اور مذاہب کا معاشرہ بن گیا۔

اس کے بعد موصوف نے جو بات لکھی ہے وہ بہت غور سے پڑھنے کی ہے، موصوف لکھتے ہیں: بروسل جو اپنے آپ کو یورپ کی راجدھانی سمجھتا ہے وہاں ۱۹۹۵ء سے پیدا ہونے والے ہر دو بچوں میں سے ایک مسلمان ہوگا، برطانیہ میں ہندوستان زبانیں بولنے والے لوگ

ویلس زبان بولنے والوں سے زیادہ ہیں۔فرانسیسی مسلمانوں کی تعداد سات لاکھ ہے، یہ تعداد ۱۹۷۴ء کے صدارتی انتخابات میں جیت وہار کے فرق سے دوگنی ہے، مغربی برلن میں تین ٹیلی ویژن چینل ترکی زبان کے ہیں، بعض یورپی شہروں میں مساجد کی تعداد کلیسوں سے زیادہ ہے، اور حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کا سلسلہ ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتا۔

ان تمام حقائق کا کیا تقاضہ ہے؟ یہ ہم پر یہ فرض کرتے ہیں کہ ہم دیگر قوموں اور ملتوں کے ساتھ اپنے تعلقات پر نظر ثانی کریں، اور فقہ اسلامی ودعوت اسلامی میں اپنے ابتدائی عہد کے اصولوں پر چلیں، اوراس سے پہلے اسلام پر اچھی طرح عمل کریں، اوراس کے احکام کا اتباع کریں۔

غیر مما لک میں آباد مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسجدیں آباد کریں، تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے مسجدوں کے دروازے کھولدیں، روحانی وثقافتی طور پر اس سے وابستہ رہیں، آپسی تعلقات کو گہرے قلبی تعلقات بنائیں، کہ محض جسموں کا ملنا لا حاصل ہے۔

اسی طرح ان کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ متعدد سماجی سرگرمیوں کے لئے ایسی اچھی مجلسیں منعقد کریں جن میں پاک دامنی وحیا سے متعلق اسلام کے احکام پر عمل کیا جائے، اور وہ شراب ونشہ آور اشیاء وہاں نہ ہوں جنہوں نے مغرب کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

ان مجلسوں اور مسجدوں میں عربی زبان میں گفتگو کرنی چاہیئے، اور ہر اس بات کا ذکر ہونا چاہیئے جس سے اسلامی تشخص کی حفاظت ہو اور لوگوں کے درمیان محبت کے رشتے مستحکم ہوں۔

خاندانوں کو ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا چاہیئے، خاص وعام معاملات پر معلومات کا تبادلہ کرنا چاہیئے، اور بر وتقویٰ پر تعاون کرنا چاہیئے۔

ان مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسا ماحول پیدا کریں جس میں شادی اللہ کی شریعت کے مطابق ہو سکے، تا کہ ہماری خوبیاں وہاں کے شہوانی سیلاب میں بہہ نہ جائیں۔

ہمیں اس بات کا بھی خیال ہونا چاہیئے کہ ہمارے دین اور ہماری امت کو مؤمن عقل کی ضرورت ہے، نہ کہ ان لوگوں کی جو احتجاج میں تو ماہر ہوں لیکن کسی مثبت کام کے نہ ہوں۔

ان کے وطنوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ہجرت کر چکے، باشندگان کو بھول نہ جائیں، بلکہ ان وطنوں کو اپنے ایسے لوگوں کے پاس اپنے لوگ، اپنی کتابیں اور اپنے اخبارات وغیرہ بھیجتے رہنے چاہیں۔

ہمارے نزدیک یورپ وامریکا جاکر بس جانے والے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرنے اور محبت کے رشتے قائم کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہئے، ہنس کر ملنے میں اپنے پاس سے کچھ جاتا نہیں۔

جو لوگ ہماری حقیقت سے واقف نہیں ہیں وہ اپنی غلط فہمیوں کے سلسلہ میں معذور ہیں کہ ہزاروں کاہن ایک مدت تک رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتے رہے، اور آپ کے بارے میں جھوٹ پھیلاتے رہے۔ پھر ہمارے نادانوں نے بھی اسلام کی نہایت رسوا کن تصویر پیش کی ہے، اور ناواقفوں اور سادہ لوحوں کو اس کے بارے میں نہایت غلط فہمی میں مبتلا کیا ہے، ان دونوں باتوں کا تقاضہ ہے کہ ہم غلط باتوں کی تصحیح اور غیر ملکوں میں آباد مسلمانوں کی اصلاح کے لئے نہایت استقامت کے ساتھ کام کریں۔

مغربی یورپ ایک ہوا چاہتا ہے، مشرقی یورپ بھی اس سے قریب آرہا ہے، اور وہاں رہنے والے مسلمانوں اپنے دین اور اپنے آپ کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

اسلام کے خلاف جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ اسلامی عقائد وعبادات سے متعلق نہیں ہوتے ہیں، اسلام کے دشمن جاہل مسلمانوں کے (بالخصوص عورت سے متعلق) اقوال وافعال کا اپنے مدعا کے لئے خوب استعمال کرتے ہیں۔

اسی لئے میں ان نام نہاد مفتیوں پر فتوی دینے کی پابندی لگانے کی اپیل کرتا ہوں جن کا آج کل کام بس برقعہ کو لازم قرار دینا، تصویر کو حرام کہنا اور بے کار کی باتوں میں مشغول رہنا ہے۔

ایک مارکسسٹ سے کی گئی گفتگو

بعض نوجوان طالبات میرے پاس آئیں، اور انہوں نے کہا کہ فلسفہ کا استاذ انہیں دین مخالف افکار کا قائل کرنا چاہتا ہے، وہ اس کا جواب نہیں دے پا رہی ہیں، اور انہوں نے اس سے یہ کہا ہے کہ وہ مجھ سے مل کر اپنی بات کہے۔

میں نے ان سے کہا کہ اسے کسی وقت بھی لے آؤ! وہ استاذ آیا تو میں نے اس سے پوچھا کیا تم کمیونسٹ ہو؟ بولا: مارکسسٹ! تو میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم مارکس کے صرف اقتصادی رجحانات کے متبع ہو یا اس کے الحاد کا بھی اتباع کرتے ہو؟

وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر بولا: میں پہلے نمبر پر اس کے الحاد کا متبع ہوں، میں کسی خدا کو نہیں مانتا ہوں، اور مادیت (Materialism) کا قائل ہوں۔

میں نے اس کے لمبے چوڑے جسم پر نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ: جب تم پیدا ہوئے تھے تمہارا جسم محض چند رطل کا تھا، اب دو سو رطل سے زیادہ کے ہو، یہ اضافہ کس نے کیا: اس نے جواب دیا: فطرت نے، میں نے پوچھا: کیا فطرت نے تمہارے ذریعہ کھائی گئی اشیاء کو اس زندہ وجود میں تبدیل کر دیا؟ یہ اشیاء تو بے جان تھیں، جاندار گوشت پوست کیسے بن گئیں؟ روٹی کو چھری سے کاٹو تو اسے تکلیف نہیں ہوتی ہے، اور اسی کو کھا لینے کے بعد وہ تمہارے جسم کا ایک حصہ بن جاتا ہے، اب اس میں پن چبھاؤ تو اسے تکلیف ہوتی ہے، اس بے جان چیز سے جان دار چیز کس نے بنائی؟ بہت اطمینان کے ساتھ بولا: میں نے کہا نا! یہ سب فطرت کا کھیل ہے۔

میں نے کہا: اچھا، یہ فطرت تو بڑی عالم وقادر ہے، اچھا یہ بتاؤ فطرت نے یہ صرف تمہارے ساتھ کیا یا وہ ایسا اس مادر گیتی پر بسنے والے پانچ ہزار ملین انسانوں کے ساتھ بھی کرتی

ہے؟ وہ کچھ گھبراتے ہوئے بولا: تمام باشندگان عالم کے ساتھ۔ میں نے کہا: پھر تو یقیناً یہ فطرت بڑی عالم، قادر، حکیم وعظیم ہے، کہ اربوں لوگوں کا بچپن سے بڑھاپے تک کے تمام مرحلوں میں خیال رکھتی ہے۔

اور وہ ان تمام مرحلوں میں ہاضمہ، غذاؤں سے ضروری اجزاء حاصل کرنے اور پھر انہیں اعضاء پر تقسیم کرنے کے مناسب آلے مہیا کرتی ہے، اور شب وروز کے ہر لمحے میں ہر وقت پھیپھڑے چلاتی ہے اور خون کو رگوں میں جاری رکھتی ہے۔

یعنی یہ زندہ فطرت ہے، جو تمام چیزوں کی نگرانی کرتی ہے، کیا تمہارا ابھی یہی خیال ہے! اس کے چہرے پر پریشانی کے اثرات نمایاں تھے، اسی حال میں اس نے کہا یہ فطرت عقل رکھتی ہے، اس کا یہ جواب سن کر میں نے اس سے کہا: یہ ذہانت تو ایک صفت ہے، اس کے لئے ایک موصوف کی بھی ضرورت ہے، اور ابھی تم نے یہ اعتراف کیا ہے کہ تم اور تمام تمہارے جیسے جانداروں کی پیدائش اور ان کی پرورش، علم، قدرت، حکمت اور عظمت سے متصف طریقہ سے وجود میں آتی ہے، کیا مٹی اور ہوا میں یہ صفات پائی جاتی ہیں یا پھر کوئی اور ذات ہے جو ان تمام صفات کا موصوف ہے؟

اس نے کہا: زیادہ گھما پھرا کر بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے آپ سے کہا نا کہ یہ سب فطرت کے کھیل ہیں، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے نزدیک فطرت اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے؟ ہماری یہ دنیا ہر دم نیا رنگ اختیار کرنے والی زندگی سے بھری ہوئی ہے۔ اور اس کی رفتار (خود ابھی تم نے کہا کہ) وسیع علم، آخری درجہ کی حکمت، زبردست قدرت اور بے پناہ عظمت پر دلالت کرتی ہے، تو یہ تمام صفات کس موصوف کی ہیں، اس لئے کہ صفات تو کسی موصوف سے ہی وابستہ ہوتی ہیں۔

اس موقع پر اس نے کہا: آپ ایک ایسے ملا معلوم ہوتے ہیں جس کی دوڑ بس مسجد تک

ہوتی ہے، میں نے اس سے کہا: یہ سب باتیں چھوڑو، میں کیا ہوں تمہیں اس سے کیا غرض؟ تم ایک لمبے چوڑے آدمی ہو، اور یہ صفت تمہاری ذات سے وابستہ ہے، اسی طرح جن صفات کو ہم اس عظیم کائنات کے پیچھے کارفرما مانتے ہیں یقیناً وہ ایک عظیم خدا کی صفات ہیں۔

اس پر وہ بولا: یہ رجعت پسندانہ سوچ ہے، میں نے اس سے ازراہ مذاق کہا کہ: اگر بیدار عقل رجعت پسندی کہلائے اور بے وقوفی ترقی یافتہ مانی جائے تو اے بے وقوف مارکسسٹ پھر میں رجعت پسند ہوں۔

باب دوم

فراموش کرده ماضی

کیسی باعزت تھی عورت؟

جب بھی میں سیرت نبوی کا مطالعہ کرتا ہوں مجھے اس عہد کی خاتون کے مقام ومرتبہ نیز اسلام میں عورت کو حاصل حقوق کا مزید علم حاصل ہوتا ہے، اس وقت عورت ایک باعزت شخصیت کی حامل تھی، اور اس کی اپنی ایک حیثیت تھی، محدثین کا بیان ہے کہ جب اللہ سبحانہ وتعالی نے رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ: "وأنذر عشيرتك الأقربين" (اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے) تو رسول اللہ ﷺ نے صفا کے اوپر چڑھ کر آواز لگائی: "اے عبدالمطلب کی اولاد! اللہ سے اپنا سودا کرلو، اے رسول اللہ کی پھوپھی صفیہ! اور اے رسول اللہ کی بیٹی فاطمہ! اللہ سے اپنا سودا کرلو، کہ میں تم دونوں کو اللہ کے یہاں نہیں بچا سکتا، ہاں میرا جتنا مال چاہو، لے لو"۔

اس قدر بلند آواز میں عورت کو بلانا ہمارے زمانے میں برا سمجھا جاتا ہے، ہم نے اس کے نام کو بھی اس کے جسم کی طرح "قابل ستر" بنادیا ہے، جس کا لوگوں کو معلوم ہونا جائز نہیں ہے، ہمارا کہنا ہے: ان معاملات سے عورتوں کا کیا تعلق، یہ کافی ہے کہ مرد دینی باتیں سن لیں اور اہل خانہ کو سنادیں، بھرے مجمع میں اس پکارنا بری بات سمجھا جاتا ہے۔

لیکن آغاز اسلام میں عورت نے اپنی حیثیت پہچان لی تھی، اور جب اس نے اللہ کے منادی کو ایمان کی دعوت دیتے سنا تو فوراً اس کی نداء پر لبیک کہا، مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ سے پہلے ان کی بہن حلقہ بگوش اسلام ہوئی تھیں، اور جب انہیں اس کا علم ہوا تھا تو انہوں نے بہن کے ساتھ نہایت دردناک معاملہ کرتے ہوئے ان کے چہرہ کو خون آلود کردیا تھا، اس حال میں انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا: اے عمر! تمہارا دین صحیح نہیں ہے، اور میں تو اللہ کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتی ہوں۔ پھر تھوڑی دیر بعد حضرت عمر اسلام لے آئے تھے۔

عورتوں اور مردوں دونوں نے اسلام قبول کیا، اور سب نے ہی حق کو قبول کرنے، اس پر عمل اور اس کی حفاظت کرنے کا عہد کیا تھا، مسجد نبوی کی صفیں مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے تھیں، امام مسلم نے ام ہشام بنت حارثہ بن نعمان کا یہ قول نقل کیا ہے: ''مجھے سورۂ ق رسول اللہ ﷺ سے سن کر یاد ہوگئی تھی، آپ ہر جمعہ کو خطبہ میں اسے پڑھتے تھے''۔ یعنی چونکہ وہ خطبہ بہت غور سے سنتی تھیں اس لئے انہیں یہ پوری سورت زبانی یاد ہوگئی تھی، خطبہ میں رسول اللہ ﷺ (کبھی کبھی) صرف قرآن مجید کی ہی تلاوت کرتے تھے، افسوس کہ یہ سنت بھی دیگر سنتوں (مثلاً عورتوں کی جمعہ و جماعت میں حاضری) کی طرح متروک ہوگئی ہے۔ کیا یہ نہایت حیرت ناک بات نہیں ہے؟

اسی عہد کا واقعہ ہے کہ ایک خوش حال وفراخ دل خاتون جمعہ کی نماز کے بعد ایک دعوت عام منعقد کرتی تھیں، جس میں جو چاہتا شریک ہوتا، امام بخاریؒ حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: ایک خاتون اپنے کھیت میں چقندر بویا کرتی تھیں، اور جمعہ کے دن اس کو اکھاڑ کر ایک پتیلی میں پکایا کرتی تھیں، اور اس پر ایک مٹھی پسے ہوئے جو ڈال دیا کرتی تھیں، اور چقندر اس جو کے لئے گویا کہ سالن ہوتا تھا، حضرت سہل کہتے ہیں، ہم نماز جمعہ پڑھ کر ان کے یہاں جاتے، ان کو سلام کرتے وہ ہمیں کھانا کھلاتیں، اور ہم اس کھانے کے لئے جمعہ کا انتظار کیا کرتے تھے، اس کھانے میں نہ گوشت ہوتا تھا اور نہ چکنائی......''۔

یہ ایک مومن فراخ دل خاتون تھیں، جو اللہ کی جانب سے ملی ہوئی نعمتوں سے لوگوں کو خوش کرتی تھیں، اگر کوئی عورت آج یہ کرنے لگے، تو سخت مزاج دیندار لوگ اس پر تنقید کریں گے، اور ہر نام نہاد مفتی کہے گا کہ اسے سلام کیوں کیا گیا؟ اس نے اس سلام کا جواب کیوں دیا؟ اور وہ مہمان مردوں سے کیوں کر ملی، عورتوں کے سلسلے میں مسلمانوں کا موجودہ رویہ کتاب وسنت کی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عہد حاضر کی پڑھی لکھی خواتین پورے دینی

ذخیرہ کو عورتوں کے ساتھ نا انصاف اور ان حقوق کا مخالف سمجھتی ہیں جو عورت کو فطرت نے دیے ہیں، اور جن کی تاکید وحی ربانی نے کی ہے، اور جو ہمارے عہد عروج میں اسے حاصل تھے، لیکن رفتہ رفتہ ختم ہوتے چلے گئے۔

کیا اسلام نے عورت کو بے جا حقوق دیے ہیں؟

ایک خاتون نے مجھ سے کہا: اسلام نے مرد کو یہ اختیار دے کر وہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے عورت پر زبردست ظلم کیا ہے، یہ اختیار مرد کے ہاتھ میں کھلی تلوار جیسا ہے، اور اس کے ذریعہ وہ عورت کو اپنی دھمکی میں رکھتا ہے اور ذلیل کرتا رہتا ہے۔

میں نے کہا: اس کے بالمقابل کوئی مرد یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے عورت کو اپنی مرضی خلعہ کرنے اور گھر چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت دے کر اس کو بے جا حقوق دیے ہیں، اور اس کے لئے سرکشی کی راہ کھولی ہے۔

درحقیقت اسلام کے عائلی قوانین کی تشریح نہایت سخت وخراب صورت حال کے اعتبار سے نہیں کرنی چاہئے، غالبًا اس فکری غلطی کے پیچھے ہماری مشرقی اقدار اور روایات کارفرما ہیں۔

مرد گھر کا سربراہ اور خاندان کا ذمہ دار ہے، لیکن ہم لوگ عام طور پر اس سربراہی کو ایک طرح کی فرعونیت اور استبدادیت خیال کرتے ہیں، جس میں باہمی مفاہمت ومشورہ کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا ہے، اور سربراہ کسی دوسرے کی رائے اور خواتین کو درخور اعتناء نہیں جانتا ہے۔

سربراہی کے اس فہم نے مشرق کو سیاسی وسماجی طور پر نہایت نقصان پہنچایا ہے، گھروں سے لے کر ممالک تک سب ہی اس کے ضرر رسیدہ ہیں۔

اپنے صحیح مفہوم کے اعتبار سے سربراہی ایک زائد وگراں تر ذمہ داری ہے، اور اسلامی گھرانہ کی سربراہی درحقیقت اس کے افراد کی باہمی ذمہ داریوں اور ان کے حقوق کا تتمہ ہے، دیکھئے قرآن مجید فرماتا ہے: "**ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة**" (اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں معروف کے مطابق،

اور مردوں کو ان پر یک گونہ برتری حاصل ہے)۔

باہمی معاملہ کی اساس پاکیزہ اخلاق، بے پناہ محبت اور عدل وانصاف ہی نہیں بلکہ ایثار وقربانی نیز چھوٹی باتوں کی پرواہ نہ کرنا ہے، عربوں کے یہاں اخلاق وحسن معاملہ کی اہمیت کا اظہار کیا خوب شاعر نے ان اشعار میں کیا ہے:

ولا خير في حسن الجسوم ونبلها   إذا لم تزن حسن الجسوم عقول
ولم أر كالمعروف، أما مذاقه   فحلو، وأما وجهه فجميل
ذريني فإن الشح يا أم هيثم   لصالح أخلاق الرجال سروق
لعمرک ما ضاقت بلاد بأهلها   ولكن أخلاق الرجال تضيق

(اگر جسم کے حسن اور اس کی خوش قامتی کے ساتھ عقل کی نعمت نہ حاصل ہو تو پھر یہ حسن وخوش قامتی لا حاصل ہے، میں حسن سلوک جیسی خوش ذائقہ وخوب رو کوئی چیز نہیں دیکھی، اے ام ہیثم! مجھے چھوڑ دو کہ کنجوسی مردوں کے اخلاق کی قاتل ہے، تمہاری قسم زمین کسی پر تنگ نہیں ہوتی ہاں لوگوں کے اخلاق تنگ ہو جاتے ہیں)۔

سورۃ الطلاق کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام قانون سازی کو اخلاقی تربیت اور عملی احکام کو نفسیاتی تعلیمات کے ساتھ ساتھ رکھنا چاہتا ہے، یہ آیات ملاحظہ ہوں: ’’سيجعل الله بعد عسرا يسرا‘‘ (اللہ تنگی کے بعد جلد ہی وسعت دے گا)، ’’من يتق الله يجعل له من أمره يسرا‘‘ (جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے معاملہ کو آسان کردے گا) ’’من يتق الله يكفر عنه سيآته ويعظم له أجرا‘‘ (جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے گناہ معاف کردے گا اور اس کو اجر عظیم سے نوازے گا) برا ہو ان گھروں کا جو دین واخلاق کا نقطۂ نظر چھوڑ کر قانون وقضاء کا نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں۔

مشرقی ومغربی معاشروں کو تسلیم ہے کہ طلاق بسا اوقات نفسیاتی وسماجی مجبوری بن جاتی

ہے، وہ مرد کے ہاتھ کا کوڑا نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات عورت کی پریشانیوں کا حل ہو جاتی ہے۔

میں ایسے بہت سے اسلامی خاندانوں کو جانتا ہوں جن کے افراد کو دین نے یک قالب بنا دیا ہے، وہاں طلاق کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتی، ان خاندانوں کے افراد کا باہمی ربط نہایت مضبوط و پاکیزہ ہوتا ہے۔

لیکن اپنے ذہنی ونفسیاتی عہد زوال میں امت اسلامیہ نے خاندان کے کردار، بچوں کی تربیت اور حال سے مستقبل کی تعمیر کو فراموش کر دیا ہے، بعض لوگ تو اپنے گھروں کا مستقبل ایک رطل گوشت کی خریداری پر موقوف کر دیتے ہیں، اور یہ قسم کھا لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہوسکا تو ان کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی، ایسی مثالوں کے بارے میں ہم بس وہی کہہ سکتے ہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۃ الطلاق کے آخر میں فرمایا ہے: ''**وکأین من قریة عتت عن أمر ربها ورسله فحاسبناها حسابا شدیدا وعذبناها عذابا نکرا فذاقت وبال أمرها وکان عاقبة أمرها خسرا**'' (کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا، اور ان کو بری طرح سزا دی، انہوں نے اپنے کئے کا مزا چکھ لیا، اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی ہے۔)

ماں کی آغوش ایک تعلیم گاہ ہے

اسلام کے آغاز اور اس سے کچھ پہلے کے عہد میں خاتون کی ثقافتی حالت جاننے کا مجھے خیال پیدا ہوا۔

اچھی ثقافت سے آراستگی مرد وزن دونوں کے لئے معاملات کے فہم، حقائق کے ادراک اور بچوں کی اچھی تربیت میں مفید ہوتی ہے۔

مجھے خیال ہوا کہ اس سلسلہ میں میں ان مصادر سے صرف نظر کروں جن پر کچھ لوگوں نے طعن وتشنیع کی ہے، اور عربوں کے اشعار کے ذریعہ اس عہد میں عورت کی زندگی، اس کے اخلاق، معاشرہ میں رائج روایات کے تئیں اس کے موقف اور تمام انسانی خوبیوں میں اس کی کیفیت کو معلوم کروں۔

بلا اختیار میرا ہاتھ ابوتمام کے دیوان حماسہ پر پڑا، اور میں نے باب الرثاء پڑھنا شروع کیا، اس میں مجھے ایسے متعدد مرثیے ملے جن میں عورتوں نے اپنے اعزہ واقارب کا نوحہ کیا تھا، اس موقعہ پر میں پہلے **عمرہ الخثعمیہ** کے وہ اشعار درج کرنا چاہتا ہوں جو اس نے اپنے دو بیٹوں کی وفات پر کہے تھے، ان دونوں کے مناقب بیان کرتے ہوئے وہ کہتی ہے:

هما أخوا في الحرب من لا أخاله　　إذا خاف يوما نبوة فدعا هما

هما يلبسان المجد أحسن لبسة　　شحيحان ما اسطاعا عليه كلاهما

شهابان منا أوقدا ثم أخمدا　　وكان سدا للمدلجين سناهما

إذا نزلا الأرض المخوف بها الردى　　يخفض من جا شيهما منصلاهما

(جب کوئی بے سہارا کسی پریشانی کے وقت انہیں پکارتا تو وہ دونوں جنگ میں اس کے

بھائی ثابت ہوتے، وہ بہترین اخلاق سے متصف تھے، اور جب تک ممکن ہوتا حسن اخلاق کا دامن نہیں چھوڑتے تھے، خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود، اور ان کی آگ راتوں کو سفر کرنے والوں کا سہارا تھی، جب وہ کسی ایسی جگہ جاتے جہاں تباہی کا راج ہوتا تو ان کی تلوار اس خوف کو کم کردیتی)۔

ایک ماں اپنے دو جگر کے ٹکروں کی وفات کے بعد ان کی مردانگی پر فخر کررہی ہے، اور ان کے بلند مقام و مرتبہ نیز ان کے اچھے اخلاق کا تذکرہ کررہی ہے۔

کسی ماں کے دو بیٹوں کا ایک ساتھ انتقال نہایت تکلیف دہ حادثہ ہے، کیسی عجیب بات ہے کہ ایسی ماں اپنے بیٹوں کی صفات حمیدہ کو سلام کررہی ہے، اور غم سے زیادہ اسے ان باتوں کا خیال ہے۔ کیا آج کی عرب خاتون ایسے کردار اور ایسی ہمت کی حامل ہے؟

جدید استعمار سے پہلے تک عورت جاہل تھی، اور افسوس کہ یہ جہالت اس کے اوپر اسلام کے نام سے تھوپی گئی تھی، پھر جب ہمارے ممالک پر معاصر مادی تہذیب کا غلبہ ہوا تو اسکولوں کے دروازے عورت کے لئے کھلے، لیکن ان تعلیم گاہوں میں اسے قرن اول کی عورت کی خوبیاں اور عظیم دینی ورثہ کی حقیقتیں نہیں پڑھائی گئیں، بلکہ اس کی عقل پر یورپی فکر و اخلاق کا وار کیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے آپ کو غلط روایات اور مضر افکار میں گھرا پایا۔

اس کا اصل سبب درحقیقت عورت کی بابت اسلام کا موقف بیان کرنے والے بعض اسلام پسندوں کی وہ علمی تہی دامنی ہے جس نے جہل مرکب کی صورت اختیار کرلی ہے، یہ لوگ چیخ چیخ کر کہتے رہتے ہیں کہ: نہ عورت کسی کو دیکھ سکتی ہے اور نہ اسے کوئی دیکھ سکتا ہے، وہ شوہر کے یہاں جانے اور قبر میں دفن ہونے کے لئے ہی گھر سے نکلے گی، حافظ ابراہیم نے کیا خوب کہا ہے:

الأم مدرسة إذا أعددتها   أعددت شعبا طيب الأعراق

(ماں ایک مدرسہ ہے، اگر آپ نے اس کی اچھی تربیت کردی تو گویا کہ آپ نے نیک فطرت خاندان تیار کردیا)۔

قدیم جاہلتیں

عرب، یونان اور روم کی قدیم جاہلیتوں نے عورت نے عورت پر بے شمار ظلم کئے، انہوں نے عورت کے تمام حقوق تلف کرڈالے، عربوں میں تو چند لوگ بچی کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کردیتے تھے، یہ نہایت وحشیانہ اور ظالمانہ طریقہ تھا۔

لیکن یہ صرف چند لوگوں کا انفرادی عمل تھا، ورنہ عقل مند لوگ اسے نہایت غلط اور اس کے مرتکبین کو نہایت برا جانتے تھے، عام طور پر عربوں کا بچیوں کے سلسلہ میں جو موقف تھا اس کا اندازہ شاعر کے ان اشعار سے ہوتا ہے:

لو لا بنيات كزغب القطا ردَدن من بعض إلى بعض
لكان لى مضطرب واسع في الأرض ذات الطول والعرض
وإنما أولادنا بيننا أكبادنا تمشي علىٰ الأرض

(اگر میری کمزور اور نازک بیٹیاں نہ ہوتیں، تو میں پوری دنیا میں گھومتا پھرتا، ہماری اولاد ہمارے چلتے پھرتے کلیجے ہیں)۔

ایک اور شاعر اپنی بیٹی امیمہ کے بارے میں کہتا ہے:

لو لا أميمة لم أجزع من العدم ولم أقاس الدجى في حندس الظُّلَمِ
وزادني رغبة في العيش معرفتي ذل اليتيمة يجنوها ذو الرحم
أحاذر الفقر يوما أن يلم بها فيهتك الستر عن لحم على وضم

(اگر امیمہ نہ ہوتی تو مجھے فقر وفاقہ کا بالکل خوف نہ ہوتا، اور میں یوں راتوں کو مارا مارا نہ پھرتا، یتیم بچی کی کس مپرسی اور رشتہ داروں کی جانب سے اس کے ساتھ غلط سلوک کا تصور میری

زندہ رہنے کی خواہش کو بڑھادیتا ہے، میں اس سے فقر کو دور کرتا ہوں کہ کہیں فقر اسے بے سہارا نہ بنادے)۔

حقیقت تو یہ ہے کہ عام طور پر عرب عورتوں کے سلسلے میں بڑے غیرت مند ہوتے تھے، اوران کے دفاع میں خون ریزی کو معمولی بات سمجھتے تھے، اسے باعزت ہونے کے مواقع دیتے تھے۔ حیرہ کے بادشاہ منذر اللخمی کی ایک بیٹی حُرَقَہ نامی تھے، اور ایک بیٹا تھا جس کا نام تھا حُرَیق۔

ایک وقت ایسا آیا کہ منذر اقتدار سے محروم ہوگیا، اور خاندان کے حالات یکسر تبدیل ہوگئے، اس پر حُرَقہ نے کہا:

فبينا نسوس الناس والأمر أمرنا إذا نحن فيهم سوقة نتنصف

فأف لدنيا لا يدوم نعيمها تقلب تارات بنا وتصرف

(ہم لوگوں کے حکمراں تھے، اور ہمارا حکم چلتا تھا، کہ اچانک ہم رعایا میں شامل ہوگئے، اور دوسروں سے انصاف کی درخواست کرنے لگے، برا ہو اس دنیا کا کہ اس کی نعمتیں دائمی نہیں، اور کبھی کے اس کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں بڑی)

حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایران فتح کیا، تو حرقہ بنت نعمان ان کے پاس چند باندیوں کے ساتھ مدد کی طلب میں آئی، حضرت سعد نے ان کو دیکھا اور پوچھا: تم میں حرقہ کون ہے؟ انہوں نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا: یہ! حضرت سعد نے اس سے کہا: تم حرقہ ہو، وہ بولی: ہاں، لیکن یہ تم بار بار کیوں پوچھ رہے ہو؟ دنیا کی کسی چیز کو قرار نہیں ہے، یہاں کی کوئی حالت دائمی نہیں ہے، تم سے پہلے ہم اس علاقہ کے فرماں روا تھے، یہاں کا خراج ہمارے پاس آتا تھا، اور ہمارے عہد حکومت میں یہاں کے باشندگان ہماری اطاعت کرتے تھے۔

لیکن جب ہماری حکومت ختم ہوئی اور حالات تبدیل ہوگئے تو یہ سب کچھ قصۂ پارینہ

بن گیا، اے سعد! زمانہ کی یہی روش ہے، جس قوم کو بھی خوشی کے دن ملتے ہیں بعد میں اس پر حسرت کا زمانہ آتا ضرور ہے، اور اس موقعہ پر اس نے اپنے مذکورہ بالا دو اشعار پڑھے۔

حضرت سعد نے اس کے ساتھ اکرام کا معاملہ کیا اور اسے انعام سے نوازا، پھر جب جانے لگی تو اس نے حضرت سعد سے کہا: میں آپ سے رخصت ہوتے وقت وہ کلمات کہتی ہوں جو ہمارے یہاں بادشاہوں سے کہے جاتے ہیں: ''اللہ کبھی کسی بدفطرت شخص سے آپ کی کوئی ضرورت نہ وابستہ کرے، اور کریم مسلسل آپ کا محتاج رہے، اور جس کسی نیک بندے سے بھی اللہ کوئی نعمت سلب کرے آپ کو اس نعمت کی واپسی کا سبب بنائے۔

پھر جب وہ ان کے پاس سے نکل کر باہر آئی تو علاقہ کی خواتین اس سے ملیں اور انہوں نے اس سے دریافت کیا: امیر نے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا، اس نے کہا: اس نے مجھے امان دی، میرا اکرام کیا اور کریم کا اکرام کریم ہی کرتا ہے۔

اس سابق شاہزادی کی عقل، ادب اور حکمت پر غور کیجئے، اس نے فاتح و غالب قائد سعد بن ابی وقاص سے کس طرح گفتگو کی کہ ان کے اکرام کی حق دار ٹھہری۔

کاش ہماری تعلیم یافتہ عرب خواتین بھی ایسی ہوتیں کہ عشرہ مبشرہ میں سے ایک صحابی کی جانب سے ان کی ہمت افزائی کی جاتی۔

عورت وسیع علم، پرحکمت کلام اور پاکیزہ زندگی سے بہت عظیم ہو جاتی ہے۔

عرب جاہلیت دیگر جاہلیتوں سے بہتر تھی

بعض حضرات کو میرے یہ کہنے پر بہت تعجب ہوا ہے کہ: عرب جاہلیت یونان وروم کی جاہلیت سے بالخصوص عورت کی سماجی صورت حال میں بہتر تھی، ان حضرات کے تعجب کی وجہ ہماری اپنی بابت، اپنے حال اور اپنے ماضی کی بابت وہ غلط فہمی ہے جو ہمیں قریبی زمانہ میں تہذیبی شکست کے بعد لاحق ہوئی ہے، اس سلسلہ میں ہم اس محاورہ کے مصداق ہیں کہ: جب کسی کا اقبال بلند ہوتا ہے تو دوسروں کی خوبیاں بھی اس کی سمجھی جاتی ہیں، اور جب دن برے آتے ہیں تو اپنی خوبیاں بھی کسی اور کی ہو جاتی ہیں۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ ان تمام جاہلیتوں میں شرک قدر مشترک کی حیثیت رکھتا تھا، اگر عربوں نے ''ہبل'' کو خدا مان رکھا تھا تو یونانیوں نے بھی اوبولو کو خدا مانا ہوا تھا، اور دونوں یکساں درجہ کے مجرم تھے۔

لیکن عورت کی بابت نظریے، اس کی حفاظت کو اپنا شرف جاننے اور اس کی خاطر جان تک کی بازی لگا دینے کے مسئلہ میں عربوں کی اخلاقیات رومیوں اور یونانیوں سے کہیں فائق تھیں۔ ذرا عمرو بن کلثوم کے معلقہ کے ان دو شعروں کو پڑھئے:

علىٰ آثارنا بيض حسان نحاذر أن تُقَسّم أو تهونا

إذا لم نحمهن فلا بقينا لشئٔ بعدهن ولا حيينا

(جنگ میں ہمارے پیچھے پیچھے خوبرو خواتین ہیں، ہم انہیں ذلت اور تقسیم ہو جانے سے بچاتے ہیں، اگر ہم ان کی حفاظت نہ کر سکیں تو پھر کسی چیز کے لئے زندہ نہ رہیں)

یہ ایک عرب جاہلی شاعر کا قول ہے، جب کہ مشہور یونانی شاعر سائمنڈس کہتا ہے:

’’اللہ نے مختلف عورتوں کی فطرت مختلف مخلوقات سے بنائی ہے، بعض عورتوں کی فطرت خنزیر سے نکالی گئی محسوس ہوتی ہے، بعض ایسی چالاک ہوتی ہیں کہ گویا ان کی فطرت لومڑی سے نکالی گئی ہو، کچھ عورتوں کے کام کتوں جیسے ہوتے ہیں، وہ گھر کے ایک ایک کونے میں چیزیں ڈھونڈا کرتی ہیں، اوران کے نہ ملنے پر بدکلامی کرتی ہیں۔‘‘

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک پاگل شاعر ہے، اس کی بنیاد پر عام حکم نہیں لگایا جاسکتا، لیکن پھر ہم کہیں گے کہ اچھا چلئے یہ اور اس کے جیسے بہت سے شاعروں کو چھوڑ یے، لیکن آپ مشہور فلسفی افلاطون اور اس کے مثالی معاشرہ کے بارے میں کیا کہیں گے، اس نے عورتوں کو معاشرہ کا سب سے گیا گزرا طبقہ قرار دیا ہے، اور انہیں حکام کے لئے ’’عام چارا‘‘ بتایا ہے، اگر یہ حال مثالی معاشرہ کا ہے تو پھر برے معاشرہ کا حال کیا ہوگا؟

رومیوں کے نزدیک عورت فطری اعتبار سے گھٹیا تھی، اور مردوں کے حقوق اسے حاصل نہ تھے، چونکہ یورپی قوانین اپنا نسب ماضی کے رومن لاء سے ملاتے تھے اس لئے انیسویں صدی تک انگریزی قانون مرد کو بیوی بیچنے کی اجازت دیتا تھا، اور کمال یہ ہے کہ اس مایہ ناز قانون نے بیوی کی کم سے کم قیمت بھی متعین نہیں کی تھی۔

اور آج بھی فرانسیسی قانون بیوی کے مالی تصرفات کو شوہر کی مرضی کے تابع رکھتا ہے، صرف اسلام ہے جس نے عورت کی مکمل حفاظت کی اور اس پر ہونے والی ہر زیادتی کو روکا، اس لئے کہ اس کا قاعدہ ہے: ’’**لا أضيع عمل عامل منكم من ذكر أو أنثى بعضكم من بعض**‘‘ (میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت کہ تم سب ایک دوسرے کی جنس سے ہی ہو)۔

نہایت تکلیف دہ بات ہے کہ ہمارے معاشرے کے اکثر دینداروں نے یونانی و رومی جاہلیتوں کے اصولوں کو اپنا کر انہیں اپنا اصول زندگی بنالیا ہے، اور پھر ان لوگوں نے اتنے ہی پر

بس نہیں کیا بلکہ یہ حضرات ان کو اسلامی اصول سمجھ کر ان کی دعوت بھی دینے لگے۔

اسلام کے ان نادان دوستوں سے اس کی حفاظت کیسے کی جائے؟ کہ یہ تو اس کے بدترین دشمنوں سے زیادہ اس کے لئے ضرر رساں ہیں۔

عورت عہد انحطاط میں

بعثت نبوی سے عین پہلے اور دعوت اسلامی کے آغاز میں عرب معاشرہ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس وقت خاتون کی صورت حال پچھلی صدیوں کے عہد انحطاط کی بنسبت کہیں بہتر تھی۔

چند قبائل کے شاذ ونادر لوگوں کے ذریعہ بچی کو زندہ درگور کرنے کے چند واقعات کو چھوڑ دیجئے، اور عورت کے عام ذہنی مستوی، اس کی شخصیت کی پختگی، جنگ وصلح میں اس کی شرکت، اور عظیم ترین تاریخی واقعات میں اس کی نہایت سرگرم شرکت کے پہلو سے دیکھئے، تو نہایت قابل ذکر صورت حال سامنے آتی ہے۔

بیعت عقبہ دوم اور بیعت رضوان میں خواتین شریک تھیں، اس موقعہ پر یہ بات ذہن میں رکھئے کہ قریبی زمانہ میں عورتوں کو ان جیسی بیعتوں میں شرکت سے روک دیا گیا اور کہا گیا: اپنے گھر میں رہو۔

امام احمد حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ نے اسلام لانے سے قبل حضرت ام سلیم کو پیغام دیا، وہ اسلام لا چکی تھیں، اس نیک خاتون نے کہا: اے ابوطلحہ! کیا تم نہیں جانتے کہ جس معبود کو تم پوجتے ہو وہ مٹی کا بنا ہوا ہے، انہوں نے کہا: ہاں! ام سلیم نے پوچھا: تمہیں درخت کی عبادت کرتے شرم نہیں آتی؟ اگر تم اسلام لے آؤ تو پھر میں تم سے کوئی اور مہر نہیں مانگوں گی، اس پر حضرت ابوطلحہ نے ان سے کہا: اچھا! مجھے غور کرنے کی مہلت دو۔

وہ چلے گئے اور پھر آ کر انہوں نے اللہ کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت کی گواہی دی، تو ام سلیم نے اپنے بیٹے حضرت انس سے کہا: اے بیٹے! ابوطلحہ سے میری شادی کردو،

انہوں نے کردی۔

یہ کیسا معاشرہ تھا؟ مجھے جس قدر تعجب عورت کی ذہانت اور اس کے ذریعہ دینی احکام کی رعایت پر ہوتا ہے، اتنا ہی سلیم فطرت، شک نہ کرنے اور حلال کی سہولت کے ساتھ فراہمی پر ہوتا ہے۔

حضرت ام عطیہ کی روایت کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ آئے تو انہوں نے انصاری خواتین کو ایک گھر میں جمع کیا اور ان کے پاس حضرت عمر کو بھیجا، حضرت عمر نے دروازہ پر کھڑے ہوکر انہیں سلام کیا، جس کا جواب خواتین نے دیا، پھر حضرت عمر نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے مجھے آپ کی جانب نمائندہ بنا کر بھیجا ہے، ہم خواتین نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ اور ان کے نمائندہ کو خوش آمدید! حضرت عمر نے کہا کہ کیا آپ اس بات پر بیعت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، کوئی بے جا بہتان کسی پر نہ لگائیں گی، اور کسی معروف کے سلسلہ میں نافرمانی نہ کریں گی؟ سب خواتین نے کہا ہاں! حضرت عمر نے دروازہ کے باہر سے اپنا ہاتھ پھیلایا اور خواتین نے اندر سے اور پھر حضرت عمر نے کہا: اے اللہ! گواہ رہنا۔

حضرت عمر نے بیعت میں ہاتھ سے مصافحہ نہیں کیا، اور یہی سنت ہے، تاکہ دینی امور ان شکوک وشبہات کی زد میں نہ آئیں جو دیگر ادیان کے پیرووں کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

عیسائیوں کے مذہبی راہ نماؤں کے یہاں اس طرح کے معاملوں میں نہایت گھنونی حرکتیں پائی جاتی ہیں، اسلام کو ان سے محفوظ ہی رکھنا چاہئے، ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے یہاں ریسپوٹین (Rasputin) جیسے لوگ پائے جائیں۔

حضرت عمر کی مندرہ بالا روایت نقل کرتے وقت مجھے یاد آیا کہ ایک ذمہ دار عالم ایک مرتبہ مجھ پر اس بات پر بگڑ گئے کہ میں جب طالبات کو پڑھانے کے لئے جاتا ہوں تو انہیں سلام

کرتا ہوں، میں نے ان سے دریافت کیا کہ کسی استاد کے ذریعہ اپنی طالبات کو سلام کیئے جانے میں اعتراض کی بات کیا ہے؟ انہوں نے کہا: یہ ناجائز ہے، میں نے ذکر کیا کہ امام بخاریؒ نے اس کا جواز اور اس کے واقعات ذکر کیئے ہیں، یہ سن کر وہ بولے: لیکن علماء نے ان کی اس روایت کو معمول بہ قرار نہیں دیا ہے، میں نے پوچھا کون سے علماء؟ وہ لوگ جاہل ہیں جو اسلام کے بارے میں بے علم کے باتیں کرتے ہیں، اور اپنی نسلی روایات کو اسلامی روایات پر ترجیح دیتے ہیں؟

عورت کی بابت صحیح اسلامی موقف

ایک طویل عرصہ سے عورت اس آبشار رحمت کے بڑے حصہ سے محروم چلی آ رہی ہے، جسے لے کر آں حضرت ختمی مرتبت کو مبعوث کیا گیا تھا، عہد نبوی وعہد خلافت راشدہ عورت کے لئے سنہری عہد تھے۔

ذرا غور کریے حضرت جمیلہ بن اوسؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے کیسا معاملہ فرمایا تھا۔ انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے آ کر یہ عرض کیا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہیں، اور اس کا سبب صرف یہ بتایا تھا کہ وہ اس شوہر کو ناپسند کرتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: تمہیں تمہارے شوہر نے بطور مہر اپنا باغ دیا تھا، کیا تم اسے اس کا باغ واپس کر دوگی، انہوں نے کہا ہاں! تو آپ ﷺ نے ان کے شوہر سے انہیں طلاق دلوائی۔

خاندان ایسی عورت کے ساتھ نہیں چل سکتا جو شوہر سے بغض رکھتی ہو اور اس سے علاحدگی کی خواہاں ہو، اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به**..........'' (اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں احکام خداوندی کا پاس نہیں رکھ پائیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علاحدگی حاصل کر لے)۔

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ یہ خلع طلاق ہے یا فسخ؟ ہمیں تو بس اس غلط فتوے یا مصر کے موجودہ غلط قانون کا تذکرہ کرنا ہے، یہاں شرعی عدالتیں شوہر کو ناپسند کرنے والی بیویوں کی بابت یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ پولیس اسے طاقت کے زور پر شوہر کے گھر میں ہی رہنے پر مجبور کرے گی، تا کہ وہ اپنے مبغوض شخص کے ساتھ ہم آغوش ہو!!

اس روش کا ردعمل یہ ہے کہ شریعت کے نام پر ہی ایک اور قانون یہ بنایا گیا ہے کہ طلاق دینے کی صورت میں مرد کو گھر سے نکال دیا جائے گا۔

دین کے فہم اور اس کی تطبیق میں یہ اضطراب کیوں پایا جاتا ہے، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس قول پر کوئی توجہ کیوں نہیں دی جاتی ہے، کہ: ''**إمساک بمعروف أو تسریح بإحسان**'' (یا تو اچھے طریقے سے رکھو ورنہ مناسب طریقہ سے چھوڑ دو) خلع وطلاق کی بابت مسلمانوں کے فہم میں ایسی بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور ان کا سبب ایک وسیع افق کے حامل فہم شریعت کا نہ ہونا ہے۔!!

نہایت افسوس کے ساتھ ایک اور واقعہ کا تذکرہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، چند خواتین نماز پڑھنے کے لئے ایک مسجد گئیں، اور بالکل آخری صف میں ایک کونے پر بیٹھ گئیں، یہ دیکھ کر امام صاحب نہایت غصہ میں ان کے پاس آئے اور فرمانے لگے: مسجدیں صرف مردوں کے لئے تعمیر ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**في بیوت أذن الله أن ترفع ویذکر فیها اسمه یسبح له فیها بالغدو والآصال رجال**..........'' ([اللہ کے نور کی طرف ہدایت پانے والے] ان گھروں میں پائے جاتے ہیں، جنہیں بلند کرنے کا اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے حکم دیا ہے، ان میں ایسے لوگ [مرد] صبح وشام اس کی تسبیح کرتے ہیں..........)

یہ عورتیں نہایت شکستہ دل مجھے ملیں، تو میں نے ان سے کہا: یہ آدمی جاہل ہے، دیکھو اللہ نے ایک اور موقع پر ''رجال'' (مردوں) کا لفظ استعمال کرتے ہوئے کہا: "**من المؤمنین رجال صدقوا ماعاهدوا الله علیه**......'' (مومنین میں کچھ لوگ [مرد] ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا) تو کیا عہد کرنے، اس کو پورا کرنے اور دین پر آخر تک جمے رہنے کی صفات صرف مردوں ہی میں ہیں؟ (یعنی ایسے موقعوں پر اس لفظ سے مراد مرد اور عورت دونوں ہوتے ہیں، اگر ایسا نہ ہو) تو پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا: ''**فاستجاب**

لهم ربهم إني لا أضيع عمل عامل منكم من ذكر أو أنثى بعضكم من بعض“
(جواب میں ان کے رب نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو)۔

لیکن جہالت کا جادو ہے کہ لوگوں کی اکثریت کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے، ان کے نزدیک عورتوں کا مسجد جانا نہایت بری بدعت ہے، اور اس کا متعدد علوم کو حاصل کرنا غیروں کا طریق ہے، اور عام معاملات کی اس کی سمجھ نا قابل اعتبار بچکانا ہے۔

ایسی محدود عورت کیسے کسی گھر کی ذمہ دار، خاندان کی نگہباں اور اچھی نوخیز نسل کی مربیہ ہوسکتی ہے؟ پچھلی صدیوں میں امت اسلامی کے زوال کا بڑا سبب عورت کے تئیں اسلام کے موقف کو صحیح طریقہ پر نہ سمجھ پانا ہے۔

اور جدید مغربی تمدن کے عروج کا سبب بھی اسلامی موقف کو نہ سمجھ پانا ہی ہے، اس صورت حال کے لئے مناسب علاج ذہین وانصاف پسند فقہاء ہی تجویز کرسکتے ہیں، نام نہاد فقہاء وعلماء نہیں۔

اسلام کو بدنام کرنے والی روایات

افسوس کہ ہمارے نفیس ترین فقہی ذخیرہ میں بعض ایسے احکام بھی پائے جاتے ہیں جن کی بنیاد کتاب وسنت یا کتاب وسنت سے ماخوذ کسی ثانوی درجہ کی دلیل پر نہ ہوکر انسانوں کی باتوں پر ہوتی ہے۔

اس کی ایک مثال یہ خیال ہے کہ جنین اپنی ماں کے پیٹ میں کئی سال زندہ رہ سکتا ہے، اس لئے حاملہ کی عدت بہت لمبی بھی ہوسکتی ہے۔

میڈیکل سائنس نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ حمل رحم مادر میں خون کا لوتھڑا بننے کے بعد نو مہینے سے زیادہ نہیں رہ سکتا ہے، اور ولادت نہ ہونے کی صورت میں ایک سال کی مدت سے پہلے ہی رحم مادر پھٹ جاتا ہے۔ کتب فقہ میں مذکور اس حکم کی کوئی دلیل شرعی نہیں ہے، لہذا اگر کوئی اسے غلط ٹھہراتا ہے تو وہ بس لوگوں کے خود ساختہ و بے حیثیت کلام کی تردید سے زیادہ کسی بھی چیز کا مرتکب نہیں ہوگا۔

ایسے متعدد فقہی اقوال ہمارے یہاں پائے جاتے ہیں، مثلاً یہ کہ مرد کے سامنے سے کتے یا عورت (!) کے گزر جانے سے اس کی نماز ٹوٹ جاتی ہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعیؒ نے اس کو قبول نہیں کیا ہے، ان حضرات کے نزدیک اس طرح کی کسی چیز سے نماز نہیں ٹوٹتی ہے۔

لیکن ابن حزم نے ان ائمہ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے: ''نمازی کی نماز کتے، گدھے اور عورت کے گزر جانے سے ٹوٹ جاتی ہے'' .... اور اس کے آگے مزید حیرتناک کلام ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں: ...... '' الا یہ کہ عورت سامنے عرض میں سیدھی لیٹی ہوئی ہو تو ایسی

صورت میں نماز نہیں ٹوٹتی ہے''۔

یعنی نمازی کے سامنے سے عورت گزر جائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے، لیکن اگر وہ سامنے سیدھی (چت) لیٹی ہوئی ہے، تو کوئی حرج نہیں ہے، کیسا کمزور اور غیر معقول کلام ہے یہ!!

لیکن ابن حزم نے یہ رائے کیوں اختیار کی ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ صحاح میں ام المؤمنین حضرت عائشہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے ہوتے اور وہ ان کے سامنے سیدھی لیٹی ہوتیں۔

لیکن پھر ابن حزم نے اس روایت کی بنیاد پر دیگر معارض روایات کو رد کرتے ہوئے دیگر ائمہ کی طرح ان کے باطل ہونے کا حکم کیوں نہیں لگایا؟ ابن حزم کی اس غلط رائے کا اتباع ان کے ان متبعین نے بھی کیا ہے جنہیں تفقہ کی نعمت نہیں ملی ہے اور جو اسلام کو بدنام کرنے والی روایات کے گرویدہ ہیں۔

ابن حزم کی اس رائے جیسی ان کی ایک اور بھی رائے ہے، اور وہ بھی ہمارے نزدیک کسی عقل مند کے لئے قابل قبول نہیں ہے، ان کے نزدیک زہر کھلا کر قتل کرنے والے کو شریعت کی نگاہ میں قاتل نہیں کہا جائے گا اور اس سے قصاص بھی نہیں لیا جائے گا۔

ان کی دلیل یہ قصہ ہے کہ ایک یہودی خاتون نے ایک بکری کے گوشت میں زہر ملا کر آپ ﷺ کو اسے ہدیہ میں دیا، جب آپ نے اسے کھانا شروع کیا تو اس کا ذائقہ بدلا ہوا پایا اور اس لئے اپنے ہم نشینوں کو اس کے کھانے سے روک دیا۔

اس یہودی خاتون کو لایا گیا اور اس نے یہ اعتراف کیا کہ اس نے اس طرح رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی، اور اس کا یہ خیال تھا کہ اگر آپ نبی ہوں گے تو آپ کو اس کا علم ہو جائے گا اور آپ اس کو تناول نہ فرمائیں گے، آپ ﷺ نے اس کو معاف کر دیا اور اسے کوئی سزا نہیں دی۔ لیکن ایک صحابی نے اس کی زیادہ مقدار کھالی تھی، تو وہ اس زہر کے نتیجہ میں

انتقال فرما گئے، اوران کے انتقال کے بعد آپ ﷺ نے اس عورت سے قصاص لیا۔

اس قصہ کے بعض راویوں نے یہ ذکر کیا ہے آپ ﷺ نے اسے معاف فرما دیا اور بعض نے قتل کئے جانے کا حکم روایت کیا ہے، اس اختلاف روایت کا سبب وہی ہے جو ابھی ہم نے اوپر ذکر کیا تھا، لیکن ابن حزم نے معاف کرنے والی روایات کو ترجیح دی، اور المحلّٰی کی گیارہویں جلد میں اپنی یہ رائے ذکر کی ہے کہ ایسے شخص سے قصاص لیا جائے گا نہ دیت۔

گدھے اور عورت سے نماز کے فاسد ہونے کی روایت بھی زہر کے ذریعہ لوگوں کو قتل کرنے والے سے قصاص نہ لئے جانے کی روایت جیسی ہی نا قابل قبول غلط فہمی پر مبنی ہے، لہذا اے مسلمانوں اپنے اندر شانِ تفقہ پیدا کرو۔

ازواج مطہرات (۱)

یہ بے دلیل بات اہل یورپ کے یہاں بہت عام ہو کر تقریباً یقینی سمجھ لی گئی ہے کہ: محمد (ﷺ) کی نو بیویاں تھیں، جن سے وہ ہم آغوش ہوتے رہے تھے اور اپنے جوان جنسی جذبات کو تسکین پہنچاتے رہتے تھے، ایک سے اکتاتے تو جنسی شہوت دوسرے کے پاس لے جاتی...... یورپیوں کا کہنا ہے: کہ یہ کردار کسی اور کو زیب دے تو دے لیکن کسی ایسے شخص کو تو ہرگز نہیں دیتا جو لوگوں کو روحانیت کی دعوت دیتا ہو، اور انہیں اللہ و یوم آخر کی یاد دلاتا رہتا ہو۔ عورت کے تئیں یہ عاشقانہ کیفیات بہت کچھ بتاتی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسان خالص دنیاوی ہے دینی نہیں، اور اے مسلمانوں ہم ان کے تقوے اور زہد کے بارے میں تمہارے دعووں کی تصدیق نہیں کرسکتے ہیں۔

ان کے جواب میں میرا کہنا ہے کہ اگر آپ کا بیان صحیح ہوتا تو پھر آپ کے ذریعہ نکالا گیا نتیجہ بھی صحیح ہوتا، لیکن آپ کے اس بیان میں ایسی تحریف پائی جاتی ہے جو اسے تقریباً جھوٹ بنا دیتی ہے، محمد (ﷺ) کی زندگی سے متعلق جو تفصیلات دوست اور دشمن دونوں بیان کرتے ہیں وہ کچھ اور بتاتی ہیں، آپ نے اس وقت جب کہ آپ کی عمر محض ۲۵ / برس تھی ایک ایسی عورت سے شادی کی تھی جو چالیس برس کی تھی، اور وہ آپ کے ساتھ تقریباً اٹھائیس سال تنہا رہیں، اب بتائیے کہ جس شہوت پرستی کا ذکر آپ کرتے ہیں وہ کہاں پائی گئی۔

جب آپ چالیس برس کے تھے تو آپ کی یہ زوجہ ۵۵ / برس کی تھیں، اور جب آپ ۵۳ / برس کے تھے تو ان کی عمر تقریباً ستر برس تھی، اس وقت کن حسیناؤں سے ہم آغوش ہوتے تھے؟ اور دوست تو دوست دشمنوں کا بھی بیان ہے کہ وہ اپنی اس بوڑھی زوجہ کے لئے سراپا وفا بنے

ہوئے تھے جس کے ساتھ انہوں نے اپنی پوری جوانی گزار دی تھی۔

پھر آپ کی ان اہلیہ حضرت خدیجہ کا انتقال اس سال ہوا جسے ''سال غم'' کا عنوان دیا گیا تھا تو آپ اپنے گھر انہی کی عمر کی ایک اور خاتون لے آئے، اور مدینہ ہجرت کے وقت تک بس یہی آپ کے نکاح میں رہیں۔

یہ صحیح ہے کہ آخری دس برسوں میں آپ کے رشتۂ ازداوج میں کچھ اور خواتین بھی آئیں، لیکن یہ کون تھی، یہ وہ شکستہ دل بیوائیں تھیں جنہیں مشکل حالات نے گھیر رکھا تھا، نہ ان کی خوبصورتی کے چرچے تھے، اور نہ یہ کم عمر تھیں، ہاں البتہ ان میں سے ایک حضرت عائشہ بنت ابوبکر غیر شوہر دیدہ تھیں، ان سے آپ نے شادی ان کے والد سے اپنے رشتوں کو مستحکم کرنے کے لئے کی تھی، ان کے بعد آپ نے حضرت حفصہ بنت عمر سے شادی کی تھی، یہ بھی کوئی خاص خوبصورت نہ تھی، بلکہ ان کے شوہر کی وفات کے بعد ان کی دلداری کی خاطر ہی یہ شادی کی گئی تھی۔

آپ کی ایک بیوی حضرت ام حبیبہ تھیں، جو حبشہ ہجرت کر گئی تھیں، آپ نے حبشہ جانے کے بعد ان کو دیکھا بھی نہیں تھا، ہاں البتہ آپ کو یہ معلوم تھا کہ وہ اپنے والد (جو اس وقت مشرکین کے سردار تھے) کی مرضی کے خلاف اسلام لائیں، اور اپنے مرتد شوہر کی مرضی کے خلاف مسلمان رہیں، تو کیا ایسی صورت میں آپ انہیں بے سہارا و پریشان حال چھوڑ دیتے؟ بس اسی پہلو پر توجہ کرتے ہوئے آپ نے ان کی دلداری کے لئے انہیں پیغام بھیج دیا۔

جب بھی کسی معزز خاتون پر خراب حالات آئے، آپ نے اسے رشتہ ازدواج میں لے لیا، اس میں شہوت کا ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہوتا تھا، خود ان خواتین کو بھی اس کا احساس تھا، انہیں احساس تھا کہ یہ صورت تو ایک انسان کی طاقت سے پرے ہے، اسی لئے ان میں سے بعض نے تو یہ تجویز بالکل صاف الفاظ میں پیش کر دی تھی کہ انہیں بیت نبوی سے محض وابستگی کا شرف

حاصل رہے، اور وہ اپنے حقوق زوجیت سے سبکدوش ہوتی ہیں، اس سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں محض انسانیت کے جذبہ سے پناہ دی تھی، اس میں شہوانی جذبات کا کوئی کردار نہیں تھا، ہماری بیان کردہ تفصیلات کے بعد شہوت وغیرہ کا کیا امکان رہتا ہے؟

پھر ان ازواج کو ان کی خواہش کے مطابق رکھنے کی ہدایات متعدد آیات میں وارد ہوئیں، مثلاً: ''**وإن امرأة خافت من بعلها نشوزا أو إعراضا فلا جناح عليهما أن يصلحا بينهما صلحا والصلح خير**'' (اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ دونوں آپس میں صلح کرلیں، اور صلح بہتر ہے) ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے: '' **ترجی من تشاء منهن وتؤوی إليک من تشاء ومن ابتغيت ممن عزلت فلا جناح عليک ذلک ادنىٰ أن تقر أعينهن ولا يحزن ويرضين بما آتيتهن كلهن**'' (تم اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے الگ رکھو، جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلالو، اس معاملہ میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس طرح زیادہ متوقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی تم ان کو دوگے اس پر وہ سب راضی رہیں گی)۔

آپ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہ سکتے تھے، کہ اس تعدد ازدواج کا سبب بعض خالص مؤمن خواتین پر آنے والے مصائب تھے، اس میں شہوانی جذبات کا کوئی دخل نہیں تھا۔

اگر ہم بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیں کہ ان میں سے چند کے ساتھ شادی کا سبب ان کی خوبصورتی ہی تھی، تو کیا دعوت اسلامی کے مشکل ترین دن اور عام مسلمانوں بالخصوص اہل بیت کو درپیش جاں گسل مسائل ومصائب مسلمانوں اور ان کے نبی کو کسی لذت اندوزی کی فرصت دیتے تھے۔ وہ گھر والیاں کیسی محروم ہوں گی جن کا شوہر ایک بڑی امت کا باپ، کمزوروں، بے سہاروں اور صبح وشام کے طالبین امداد کا سہارا ہو، وہ ایسے لوگوں کو اپنے پاس جو کچھ ہو دے دیتا ہو اور خود وہ

اور اس کی گھر والیاں بھوکے پیٹ سوتی ہوں۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہ کی یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات تک کبھی ایسے دو لگاتار دن نہیں آئے کہ آپ کے گھر والوں نے یہ دو لگاتار دن شکم سیر گزارے ہوں۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: رسول اکرم ﷺ کا انتقال ہو گیا، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے ایک دن میں دو وقت روٹی اور تیل کھایا ہو۔

امام ترمذی نے حضرت مسروق کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے میرے لئے کھانا منگایا، اور پھر کہنے لگیں، جب کبھی سیر ہو کر کھانا کھا لیتی ہوں تو رونا آتا ہے! میں نے عرض کیا: ایسا کیوں؟ فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ کی زندگی یاد آجاتی ہے، آپ نے کبھی ایک دن میں دو مرتبہ روٹی اور گوشت نہیں کھایا۔

بیہقی نے حضرت عائشہ کا یہ قول نقل کیا ہے: رسول اللہ ﷺ کبھی تین دن لگاتار شکم سیر نہیں ہوئے، حالانکہ اللہ کا دیا اتنا ہوتا تھا کہ اگر ہم چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے، لیکن آپ دوسروں کو ترجیح دیا کرتے تھے۔

طبرانی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دسترخوان کے لئے جو کی روٹی بچتی ہی نہیں تھی، حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خود قربانی دے کر دوسروں کی مدد کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے اپنے ازار پر چمڑا لگوایا تھا'' (تاکہ لوگوں کے کھینچنے سے پھٹ نہ جائے، مترجم)۔ اللہ اکبر کپڑے اور کھانے کے کتنے طالب وہاں آیا کرتے تھے۔

بسا اوقات لوگ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں کھانا تیار ہونے سے بہت پہلے پہنچ جاتے، اور بسا اوقات کھانے سے فارغ ہو کر دیر تک بیٹھے رہتے، یقیناً یہ بات رسول اللہ ﷺ پر گراں گزرتی تھی، اور آپ اس سے بہت حرج محسوس فرماتے تھے، لہذا یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس

بابت وحی نازل ہوکر ایک محکم نظام بتائے، اسی لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''**یا أیھا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوت النبي إلا أن یؤذن لکم إلی طعام غیر ناظرین إناہ ولکن إذا دعیتم فادخلوا فإذا طعمتم فانتشروا ولا مستأنسین لحدیث إن ذلکم کان یؤذی النبي فیستحیی منکم واللہ لا یستحیی من الحق**''......(اے ایمان لانے والو! نبی کے گھروں میں بلا کھانے پر بلائے نہ چلے جایا کرو، نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو، ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ، مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو، تمہاری یہ حرکتیں نبی کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے، اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا)

آں حضرت ﷺ کے ساتھ آپ کی ازواج مطہرات نے بھی معاشرہ کی خدمت، لوگوں کی تعلیم، ضعیفوں کی مدد اور مہمانوں کی میزبانی میں بہت مشقتیں اٹھائی تھیں۔

ایسا بکثرت ہوتا تھا کہ آپ ﷺ لوگوں کو مسجد میں نماز پڑھا کر اپنے گھر تشریف لاتے، کچھ کھانے کو طلب فرماتے، اور وہ نہ ملتا تو روزہ کی نیت کر لیتے، کبھی تھوڑا بہت سرکہ ہوتا تو اس کو کھا لیتے، اور ایسی صورت میں ناراض یا پریشان خاطر نہ ہوتے، بلکہ اسے بڑی خوشی سے تناول فرماتے اور یوں کہتے کہ سرکہ تو بہت اچھا سالن ہے۔!! یہ ہے وہ زندگی جس کے بارے میں یورپیوں کا کہنا ہے کہ وہ عورت سے لذت اندوزی اور ان کی آغوش میں جنسی شہوت پوری کرنے سے عبارت تھی......اس زندگی میں یہ پرسکون دنیا کہاں نظر آتی ہے؟؟

تمام ارباب سیر کا بیان ہے کہ آپ کی ازواج نے اس طرز زندگی سے پریشان ہو کر اسے بدلنے کا ایک ساتھ مطالبہ کیا، ان کی خواہش تھی کہ پرسکون زندگی گزاری جائے......لیکن جب انہیں یہ واضح جواب ملا کہ: یہاں تو یہی حال رہے گا، چاہو ساتھ رہو اور چاہو تو علاحدگی اختیار کر لو، تو ان کے دلوں پر ایمانی جذبات حاوی آ گئے اور انہوں نے آخرت کو اور اس دنیا میں

خوش عیشی حاصل کرنے پر پریشانیوں سے نبرد آزما رسول اکرم ﷺ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔

خانوادۂ نبوت پر لازم تھا کہ وہ دنیا کے کمزور ترین گھرانے کے حال میں رہے، اور وہاں کی ذمہ دار خواتین وہ پریشانیاں اٹھائیں جن کا سامنا اپنے وطن اور مال سے بے دخل کئے گئے ان لوگوں کو کرنا پڑ رہا تھا جو ہجرت کے بعد زندگی روکھی سوکھی کھا کر گزار رہے تھے۔

اللہ نے اس قربانی کے بدلے میں انہیں ''أمهات المؤمنين'' بنادیا، اس لقب سے شرف کے ساتھ ساتھ ذمہ داری بھی ظاہر ہوتی ہے۔

کیا کوئی آسمانی یا غیر آسمانی مذہب تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیتا ہے؟ یا اس میں ذرہ برابر بھی کراہت کہتا ہے؟ نہیں، بلکہ عہد نامۂ قدیم کے مطابق ماضی کے انبیاء نے بے حدود تعدد ازدواج کیا تھا، عہد نامۂ قدیم میں حضرت سلیمان کے بارے میں مذکور ہے کہ انہوں نے تین سو خواتین سے شادی کی تھی۔

عیسائیت میں بھی تعدد ممنوع نہیں ہے، ول ڈیورانٹ نے ''قصة الحضارة'' میں عیسائی مذہبی پیشواؤں کے نہایت گندے واقعات ذکر کئے ہیں، آیئے اب اس مسئلہ پر دین کے بجائے فلسفہ کے پہلو سے نظر ڈالیں، اور دیکھیں کہ فلاسفۂ یونان کا طرز عمل کیا تھا تا کہ فکر قدیم کے قائدین کی زندگی کا یہ پہلو سامنے آجائے............۔

میں چاہتا تھا کہ یہ نہایت گھنونی چیزیں ذکر کردوں، لیکن پھر مجھے خیال ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے دشمن بڑے بے حیا اور دروغ گو ہیں اس لئے مجھے خیال ہوا کہ ان لات کے بھوتوں پر لات ہی چلائی جائے۔......

ماجد نصر الدین نے صحيفة اللواء الأردنية میں ایک مضمون بعنوان ''لماذا ينهل المثقفون من تراث موبوء بالشذوذ'' تحریر کیا تھا، اس میں انہوں نے لکھا تھا: ''وہ فلاسفہ جنہیں کچھ لوگ اعلیٰ ترین نمونہ خیال کرتے ہیں پکے ہم جنس پرست تھے، وہ ہم جنسی پر فخر

کرتے تھے، خود سقراط کی بیوی اپنے شوہر کو اس لئے ناپسند کرتی تھی کہ اس کے اپنے ایک شاگرد کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے، اب آپ اس افلاطون کے بارے میں خود ہی رائے قائم کرلیجئے جو سقراط سے کم عمری میں ہی وابستہ ہوگیا تھا، اور سقراط اس بے حیائی کا معروف بیمار اور نوجوانوں کو بگاڑنے میں مشہور تھا۔

ارسطو کا خیال تھا کہ اس کے زمانے میں ہم جنسوں کی تعداد فطری طریقہ پر کار بند لوگوں کے برابر تھی، اس نے ایسی باتیں کہی ہیں جن کو ہم نقل کرنے کی بھی ہمت نہیں کرسکتے، ایک مؤلفہ لکھتی ہیں: اکثر معاشروں میں ہم جنسی یا تو رائج ہی نہیں تھی، یا پھر وہ اسے حرام قرار دیا کرتے تھے، سوائے یونانیوں کے، کہ وہاں مردوں کی ہم جنسی عام تھی، اور لڑکوں کو کرایہ پر لیا جاسکتا تھا''۔

یونانیوں اور رومیوں کی ان رسوا کن و بے حیا حرکتوں کی وارث جدید مغربی تہذیب ہے، اور وہ اپنی اس گندگی کو بھول کر جس میں وہ صبح وشام لت پت رہتی ہے اس خاصۂ خاصان رسل پر گندگی اچھالتی ہے جس نے پوری دنیا کو پاکبازی کا سبق پڑھایا تھا۔

ایڈس کے معاشرہ سے ہم اس حرکت کے علاوہ اور کس چیز کی توقع رکھ سکتے ہیں؟

ازواج مطہرات (۲)

ایک شخص نے مجھ سے بہت حیرت کے ساتھ پوچھا: کہ حضرت عائشہ کی شادی نہایت کم عمری میں پچاس سال سے زیادہ کے ایک آدمی کے ساتھ کیسے ہوگئی؟ میں نے کہا: یہ کوئی نیا سوال نہیں ہے، لوگوں کو یہ اشکال ہوا کرتا ہے، لیکن آپ کی یہ حیرت اس وقت جاتی رہے گی جب آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ سے پہلے حضرت عائشہ کا ایک رشتہ اور آچکا تھا۔

یہ سن کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور منہ کھل گیا، اور اس نے کہا: یہ کیا قصہ ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جبیر بن مطعم بن عدی حضرت عائشہ کو پیغام دینا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے والدین سے بات کی، تو انہوں نے پہلے تو اسے منظور کرلیا اور اس رشتہ کو لے کر وہ حضرت ابوبکر کے پاس گئے۔ لیکن پھر کچھ دنوں کے بعد انہیں یہ ڈر ہوا کہیں اس شادی کے بعد ان کا لڑکا اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ کر اپنی سسرال والوں کا دین نہ اختیار کرلے، اس خیال کے بعد ان کی رائے اس رشتہ کی نہیں رہی۔

انہی دنوں حضرت خولہ بنت حکیم نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ کے لئے پیغام دے رہے ہیں، یہ سن کر حضرت ابوبکر مطعم بن عدی کے پاس گئے، اور ان سے پوچھا: کیا وہ ابھی تک حضرت عائشہ کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی کے خواہش مند ہیں، مطعم نے انکار کردیا اور حضرت ابوبکر کو اپنی رائے پر عمل کرنے کی آزادی دیدی۔

اب حضرت ابوبکر پر کسی وعدہ اور عہد کی پابندی لازم نہ رہی تھی، اس طرح رسول اللہ ﷺ کی شادی حضرت ابوبکر کی بیٹی سے ہوگئی، بعض بچیاں کم عمری میں ہی بالغ ہوجاتی ہیں، ایک ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ عدالت نے ان کے پاس ایک لڑکی بھیجی تا کہ وہ اس کی عمر کی

جانچ کریں، انہوں نے طبی طریقہ پر اس کی عمر کا اندازہ سترہ سال کیا، بعد میں برتھ سرٹیفکٹ سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی عمر کے تیرہویں سال میں تھی۔

حضرت عائشہ اپنی رخصتی کے وقت یقیناً شادی کی اہل تھیں، بلاشبہ اس شادی کا پہلا محرک آں حضرت ﷺ اور ان کے اوّلین رفیق کے درمیان تعلقات پختہ کرنے کا جذبہ ہی تھا، ایسے ہی جذبہ نے آپ کی شادی حضرت حفصہ کی بیوگی کے بعد ان سے کرادی تھی، حالانکہ وہ کوئی خوبصورت خاتون نہ تھیں، لیکن یہ پہلو نہ شادی کا سبب تھا اور نہ اس سے مانع۔

ان شادیوں کے کچھ اور سماجی اور سیاسی اسباب تھے، جن کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے کبھی تعلقات کو مستحکم کرنے کے لئے، کبھی شکستہ دل کی دل بستگی کے لئے اور کبھی صاحب دعوت (نبی کریم ﷺ) اور ان کے متبعین یا ان خاندانوں سے تعلق قائم کرنے کے لئے یہ شادیاں کی تھیں جو مصیبت کے موقعوں پر جزیرۃ العرب کو ہلا کر رکھ دیتے تھے۔

کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ: ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ آسمانی وغیر آسمانی مذاہب میں تعدد ازدواج ایک عام بات تھی، اور اسلام نے اسے آکر قیود وحدود آشنا کیا، لیکن جس حد پر نبی اسلام نے مسلمانوں کو روکا اس پر وہ خود کیوں نہ رکے، کیا صحیح حدیثوں میں یہ بات مروی نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک ایسے آدمی کو جس کے پاس دس بیویاں ہوں یہ حکم دیا تھا وہ چار روک کر بقیہ کو چھوڑ دے؟

اس سوال کے جواب میں ہمارا کہنا ہوگا: یہ سوال بالکل صحیح ہے، لیکن اس کے جواب پر ہمیں غور کرنا چاہئے! اس شخص نے جن چھ عورتوں سے علاحدگی کرلی ہوگی انہیں دوسرے گھر مل گئے ہوں گے، اس لئے کہ انہیں جس سے چاہیں شادی کی اجازت تھی، اور ان سے شادی کرنے میں کسی پر پابندی نہیں تھی۔

لیکن اگر ایسا ازواج مطہرات کے ساتھ بھی ہوتا تو وہ کیا کرتیں، اس لئے کہ پہلے وحی

مسلمانوں سے کہہ چکی تھی کہ: ''**ومالکم أن تؤذوا رسول الله ولا أن تنکحوا أزواجه من بعده أبدا إن ذلکم کان عند الله عظیما**'' (تمہیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچاؤ، اور نہ ہی اس بات کی اجازت ہے کہ تم ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو، یہ اللہ کے نزدیک بڑا گناہ ہے)۔

ان کو تو قرآن مجید نے یہ کہہ کر امہات المؤمنین بنادیا تھا کہ: ''**النبي أولیٰ بالمؤمنین من أنفسھم و أزواجه أمھاتھم.....**'' (نبی مومنین سے خود ان سے زیادہ قریب ہیں اور ان کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں) اور کوئی مؤمن اپنی ماں سے شادی نہیں کرسکتا ہے، کیا اس کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ ان بیویوں کو چھوڑ دیتے تاکہ وہ ساری زندگی تنہائی اور بے سہارگی میں گزاریں؟

اور اگر ہم بالفرض تسلیم کرلیں کہ ان ازواج سے علاحدگی اختیار کرنا مطلوب تھا تو کیا یہ خداوندی بدلہ تھا ان خواتین کے لئے جنہوں نے حضرت رسالت مآب ﷺ کے ساتھ نہایت پریشان زندگی گزاری تھی۔

جب آپ ﷺ نے انہیں اختیار دیا تھا کہ وہ چاہیں تو آپ کے ساتھ رہیں اور چاہیں تو علاحدگی اختیار کرلیں اس وقت ان خواتین نے آپ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے مال و دولت سے بھرے گھروں میں واپس جانے سے انکار کردیا تھا، انہیں ایمان نے شب بیداری اور روزوں کی فضا میں رہنے اور ساری دنیا سے گمراہی کا مقابلہ کرنے والے رسول کے ساتھ جدوجہد کرنے پر آمادہ کیا تھا، کیا اس وفاء کے بعد ان کا بدلہ یہ تھا کہ انہیں چھوڑ دیا جاتا؟

اللہ نے ان کے آپ کے ساتھ رہنے کا اور مزید شادیاں نہ کئے جانے کا اعلان کیا تھا، اور ان کے لئے خاص یہ قانون بنایا تھا کہ: ''**لا یحل لک النساء من بعد ولا أن تبدل بھن من أزواج ولو أعجبک حسنھن إلا ما ملکت یمینک وکان الله علی کل**

شئ رقیبا'' (آپ کے لئے اب مزید خواتین نہیں ہیں، اور نہ ہی یہ کہ آپ ان کے بدلہ میں کچھ اور خواتین سے شادی کریں خواہ آپ کو ان کا حسن کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے، اس حکم سے باندیاں مستثنیٰ ہیں، اور اللہ ہر چیز پر نگراں ہے)۔

رسول اکرم ﷺ کی زندگی کی اس نام نہاد کمزوری کے حوالہ سے آپ ﷺ پر اعتراض کرنے والوں سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ: کیا یہ صرف اسی شریف ومکرم انسان کے خلاف مقدمہ ہے؟ اور صرف ان کی ہی بے عزتی کرنے کی جان بوجھ کر کی جارہی حرکت ہے؟ آپ سے پہلے بھی متعدد انبیاء کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کی گئی ہیں، نیک لوگوں کو بہت برے الزامات کا سامنا کرنا پڑا ہے، کیا حضرت لوط پر یہ الزام نہیں لگایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں سے شراب کے نشہ میں جنسی تعلق قائم کیا تھا، جس کے نتیجہ میں دونوں کے یہاں اولاد ہوئی؟ کیا حضرت یعقوب پر یہ الزام نہیں لگایا کہ انہوں نے اپنے بھائی عیصو سے سازش کرکے نبوت کا منصب ہڑپ کرلیا تھا؟ کیا حضرت سلیمان پر یہ تہمت نہیں لگائی گئی کہ اگرچہ ان کے حرم میں ایک ہزار عورتیں تھیں تب بھی وہ ایسے مجہول حبیب کی تلاش میں قدس کی سڑکوں پر پھرا کرتے تھے جس سے وہ ہم آغوش ہوں، یہ نہایت بے ہودی بات عہد قدیم کے غزل الغزلات نامی اس صحیفہ کے متعدد صفحات پر بیان کی گئی ہے جو حضرت سلیمان کی جانب منسوب ہے۔

ان صحیفوں کے لکھنے والوں پر تہمت بازی کا جو جنون مسلط تھا اس کے باوجود ان الزام تراشوں نے انبیاء کو باعزت جانا، حضرت سلیمان کو یہودیوں نے بادشاہ بنایا، اور کیسا بادشاہ؟ ان کے نزدیک وہ اس ہیکل کے بانی تھے جس کی ازسرنو تعمیر لازمی ہے تاکہ وہ رب تعالیٰ کا مسکن ہو، اور وہ وہاں سے بنی اسرائیل میں سے اپنے پسندیدہ بندوں کے ذریعہ پورے عالم پر حکمرانی کرے۔

لیکن وہ محمد جو روزہ دار اور شب بیدار تھے، پوری زندگی اللہ کی خاطر پریشانیاں اٹھاتے رہے، اور آخر عمر میں ان کے یہاں چند ایسی بیوہ و بے سہارا خواتین تھیں جوان کے ساتھ نہایت معمولی حالات میں رہیں، اور انہوں نے اپنی توجہات کا مرکز رضاء خداوندی اور آخرت کو بنا رکھا تھا، بس یہی محمد ہیں جن کی مخالفت جائز ہے، اور جن پر افترا پردازی کرنے والوں کی حفاظت کا فریضہ NATO انجام دے۔

پھر یہ بدزبانی اور نہایت غصہ کرنے والے لوگ کون ہیں؟ کیا یہ ایسے راہبوں کی جماعت ہے جن کو کثرت عبادت نے لاغر کر دیا ہے، اور جو اپنے بیان کے مطابق صرف رضاء خداوندی کی خاطر جنسی شہوتوں کو مکمل طور پر دبائے ہوئے ہیں؟ نہیں، یہ تو وہ لوگ ہیں جو جنسی شہوتوں میں گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں، اور جنسی لذت اندوزی کا کوئی موقعہ وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں، اس سلسلہ میں انہیں کوئی جھجھک ہے نہ حیا کا پاس؟

تہذیب یورپ کی خصوصیت یہ ہے کہ جنسی لذت اندوزی کا جو سامان پہلے بادشاہوں اور رئیسوں کے لئے خاص تھا اس نے اسے عام کر دیا ہے، اب درویش ستر عورتوں سے تعلق قائم کر سکتا ہے، وہ جب جب نیا مزا چکھتا ہے ایسی روایات (نہ کہ قوانین) طلب کرتا ہے، جو اسے اس کی حرکتوں سے باز رکھیں، اس غلاظت میں رہتے ہوئے یہ لوگ آں حضرت ﷺ کی برائی کرتے ہیں اور آپ کی ناموس پر حملہ آور ہوتے ہیں، کیسا ظالمانہ رویہ ہے؟

اسلام نے تعدد ازدواج کا حکم نہیں دیا ہے، اس لئے کہ شادی صرف لذت اندوزی کا سامان نہیں ہے، بلکہ وہ خاندان کی تربیت اور نگرانی کی ذمہ داری سے بھی عبارت ہے، جو اس ذمہ داری کو ادا نہ کر سکے اسے اسلام حکم دیتا ہے کہ وہ شادی نہ کرے روزے رکھے، ان یورپیوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ: تعدد ازدواج (جس کی اسلام نے اجازت دی وہ) بہتر ہے یا زنا؟

ہر انصاف پسند اور سچے شخص سے ہمارا سوال ہے کہ کیا یورپی معاشروں میں مرد صرف

ایک خاتون پر اکتفا کرتے ہیں، یا تعدد ازدواج وہاں ایسا بے لکھا قانون ہے جس کی تابع اکثریت ہے؟ ایک اور سوال یہ ہے کہ: اس حرام تعدد کا سبب مجبوریاں ہیں، یا آزادانہ اختلاط اور رقص وسرور کی محفلوں کے ذریعہ جذبات انگیزی کی عمداً کی گئیں کوششیں ان ناپاک تعلقات کا سبب ہیں۔

اور آخر میں یہ فیصلہ کن سوال کہ: کیا تاریخ کے حافظہ میں محمد (ﷺ) سے زیادہ با اخلاق، پاک کردار، غیرت منداور شبہات سے محفوظ کوئی شخصیت گزری ہے؟

کیا تاریخ ہمیں اس کے گھر کی ایسی محفلیں بتاتی ہے جن میں خوان پر شراب کے جام، بہترین کھانے اور قوت باہ بڑھانے والی غذائیں ہو؟

وہ سوتے یا بیٹھتے تو ان کے جسم پر چٹائی کے نشانات ہوتے، ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اگر روٹی اور گوشت مل جاتا تو اسے وہ ان نعمتوں میں شمار کرتے جن کی بابت قیامت میں سوال ہوگا!!

کیا اس گھوڑ سوار اور کھردری جلد والے نبی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ شہوت پرست تھا، پھر یہ الزام کون لوگ لگارہے ہیں؟ وہ جنہیں اللہ نے ایڈز جیسے Venereal امراض میں مبتلا کر رکھا ہے۔(Venereal Diseases وہ امراض کہلاتے ہیں جو غلط جنسی تعلقات کے ذریعہ متعدی ہوتے ہیں۔مترجم)۔

اس موقعہ پر شاعر کے یہ اشعار یاد آجاتے ہیں:

وطاولت الأرض السماء سفاهة   وعيرت الشهب الحصا والجنادل
وقال السها للشمس لونک ضئيلة   وقال الدجى للصبح: لونک حائل
فيا موت زر إن الحياة ذميمة   ويا نفس جدی ان دهرک هاذل

(زمین نے بے بیوقوفی میں آسمان سے قامت سے متعلق مقابلہ کیا، اور سنگریزوں اور

چٹانوں نے تاروں کو عار دلایا، سہا، نے سورج سے کہا کہ تیری روشنی پھیکی ہے، اور تاریکی نے صبح سے کہا کہ تیرا رنگ ماند ہے، جب یہ صورت حال ہے تو اے موت تو آجا کہ اب زندگی مذموم ہے، اور اے نفس تو سنجیدہ ہو جا کہ تیرا زمانہ مذاق کر رہا ہے)۔

ہماری خواتین کیا کریں؟

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی ایک مشہور جنگ ''ذی قار'' نامی ہوئی، اس کا آغاز ایرانیوں کے ذریعہ جزیرۃ العرب پر ایک بڑے حملہ سے ہوا تھا، جس کا مقابلہ عربوں نے اپنے تمام اختلافات بھلا کر متحدہ طور پر کیا تھا۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ اس جنگ کے عرب سپہ سالار حنظلہ بن ثعلبہ نے اونٹوں پر رکھی ہوئی پالکیوں کی رسیاں کٹوادی تھیں، اور عورتوں کو اپنے سپاہیوں کے پیچھے پیدل چلنے کا حکم دیا تھا، اور پھر پورے لشکر کے مردوں کو پکارتے ہوئے کہا تھا: تم میں سے ہر ایک اپنی اہلیہ کی حفاظت کے لئے لڑے۔

اس ندا نے تمام سپاہیوں میں جوش بھر دیا، اور ہر طرح کے تردد کو ختم کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کو بدترین شکست ہوئی اور وہ واپس بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

جنگ احد میں مشرکین کی خواتین اپنے اس لشکر کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں جو بدر کی شکست کا بدلہ لینے نکلا تھا، یہ خواتین مردوں کو جوش دلانے کے لئے یہ اشعار پڑھ رہی تھیں:

إن تقبلوا نعانق ونفرش النمارق

أو تدبروا نفارق فراق غير وامق

(اگر آگے بڑھ کر مقابلہ کرو گے تو ہم معانقہ کریں گے، اور تمہارے لئے گاؤ تکیے لگائیں گے، اور اگر میدان چھوڑ کر بھاگو گے تو ہم سے محبت ترک کر کے تم سے علاحدگی اختیار کرلیں گے)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عربوں کی خواتین میدان جنگ میں بھی ایک کردار

رکھتی تھیں، اور معاشرے کے بڑے چھوٹے مسائل میں ان کا دخل تھا۔

اس کی ایک مثال بعثت کے ابتدائی زمانہ میں بھی ملتی ہے، آں حضرت ﷺ کے چچا ابولہب کے ساتھ اس کی بیوی تکذیب اور مخالفت اسلام میں شانہ بشانہ تھی۔

یہ بد بخت آپ کا نام محمد کے بجائے ''مذمم'' (نہایت لائق مذمت) لیا کرتی تھی، وہ کہتی تھی: ''مذمما أبينا...... ودينه قلينا ......وأمره عصينا'' (اس نہایت لائق مذمت پر ہم ایمان نہیں لائے......اس کے دین کو ہم نے قبول نہیں کیا......اور اس کا کہنا ہم نے نہیں مانا)

وہ قریش کی مجلسوں میں اس ہجو کو سناتی پھرتی، فتنہ انگیزی کرتی اور کفر کی تائید کرتی، لہذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہوا: ''وامرأته حمالة الحطب في جيدها حبل من مسد'' ([ابولہب کے ساتھ جہنم میں] اس کی بیوی بھی ہوگی لکڑیاں ڈھونے والی، اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی) یہ عورت قریش کے ممتاز افراد میں سے تھی، اس کا کام لکڑیاں ڈھونا نہیں تھا، لیکن اسلام کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرنے، بدتمیزی کرنے اور نفرتیں پیدا کرنے کے اس کے عمل کو اس عورت کے عمل سے تشبیہ دی گئی ہے جو آگ لگانے کے لئے لکڑیاں ڈھو کر لاتی ہے۔

مجھے خیال ہوتا ہے کہ اگر باطل کو ایسی باحمیت خواتین مل سکتی ہیں جو اس کے مسائل کا ادراک رکھتی ہوں اور اس کی مدد کرتی ہوں، تو پھر ایمان کو اس کے مقابلے کے لئے خواتین کی خدمات حاصل کیوں نہیں ہوسکتیں؟

اندلس میں اسلام کا آخری قلعہ ڈھانے کا کام ایک مرد اور ایک عورت نے کیا تھا، انہوں نے وہاں سے توحید کا پرچم ہٹوا دیا تھا، ہزاروں مسلم خواتین بھی اسلام کی ویسی خدمت کرسکتی ہیں جیسی خدمت مشرک خواتین گمراہی کی کرتی ہیں، پھر ان کے اور اس خدمت کے درمیان کیوں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں؟

گزشتہ سال امریکہ کے صدارتی انتخابات میں ڈیموکریٹک امیدوار کی بیوی اپنے

شوہر کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھی، اور لوگوں کو خیال تھا کہ وہ میدان مارلے جائے گا، اور چونکہ اس کی یہ بیوی یہودی تھی اس لئے کہنے والوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہائٹ ہاؤس کی ملکہ (خاتون اول) اسرائیل کی حلیف ہوگی۔

لیکن خدا کی مرضی کہ ریپبلکن امیدوار جیت گیا، اور ممکنہ خاتون اول کو ایسی مایوسی ہوئی کہ اسے اپنے غموں پر قابو پانے کے لئے ہمہ وقت شراب نوشی کا سہارا لینا پڑا، اور اب وہ ایک اسپتال میں نشہ کی لت کا علاج کرا رہی ہے، اس نے ایسا اس لئے کیا کہ وہ اس حادثہ کو بھول جانا چاہتی تھی۔

کبھی کبھی میرے دل میں سوال آتا ہے کہ یہ خاتون اپنے مشن کے تئیں کیسی مخلص اور پابند تھی؟ ہماری خواتین عظیم اسلامی اقدار کی خدمت اس طرح کیوں نہیں کرسکتیں؟ کیا چیز ان کے آڑے آرہی ہے؟ ان کے آڑے صرف اسلام سے جاہل لوگوں کا رویہ آرہا ہے۔

اگر میاں بیوی اچھے اخلاق وعادات میں ایک دوسرے کے معاون ہوں تو کتنا بہتر ہو؟ سعد بن ناشب ایک سخت مزاج اور سخت کلام شخص تھا، اس کی بیوی کو یہ بات ناپسند تھی، اس نے اس کی بدخلقی اور سخت کلامی پر تنقید کی، تو اس نے اپنا دفاع کرتے ہوئے اور اپنی حقیقت واضح کرتے ہوئے کہا:

تُفنِّدنی فیما تری من شراستی وشدة نفسی أم عمرو وما تدری

فقلت لها: إن الكريم وإن حلا ليلفىٰ على حال أمرَّ من الصبر

وما بی علیٰ من لان لی من فظاظة ولكننی فظٌّ أبِیٌّ على القسر

(ام عمرو میری سخت مزاجی کی وجہ سے مجھے برا بھلا کہتی ہے، اور اسے حقیقت معلوم نہیں ہے، میں نے اس سے کہا کہ کریم خواہ کیسا ہی نرم مزاج وشیریں دہن کیوں نہ ہو، سختی کے وقت میں نہایت تلخ ہوتا ہے، جو مجھ سے نرمی کے ساتھ پیش آئے میں اس کے لئے سخت نہیں ہوں، ہاں جو

شخص بداخلاقی کرے میں اس کے لئے نہایت تندخو اور سخت دل ہوں)۔

شاعر نے کیا خوب معذرت کی ہے! لیکن اس قصہ میں ہمارا مقصود یہ ہے کہ عورت اپنے شوہر کو کیسی نصیحت کررہی ہے، اور اس کے لئے کیسی جویائے خیر ہے۔

ذیل میں ایک اور شخص (سالم بن قحفان) کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، یہ نہایت سخی اور فیاض تھا، اس کے پاس بہت بڑی تعداد میں اونٹ تھے، اس سے جو کچھ مانگنے آتا اپنا ایک اونٹ اسے دے دیتا، اور اپنی بیوی سے کہتا کہ سائل کے لئے ایک رسی مہیا کرو، تاکہ وہ میرا دیا ہوا اونٹ لے جائے، اور اپنے اوپر لعنت ملامت کرنے سے اسے روکتا تھا:

لا تعذلینی في العطاء ویسِّری لکُلِّ بعیر جاء طالبه حَبْلاً

فلم أر مثل الإبل مالا لمقتن ولا مثل أیام الحقوق لها سبلا

(میری اس داد و دہش کے سلسلہ میں مجھ پر ملامت مت کرو، اور ہر اس اونٹ کے لئے جسے لینے کوئی سائل آئے ایک رسی مہیا کردیا کرو، مال حاصل کرنے والے کے لئے اونٹ جیسا کوئی اور مال نہیں ہوتا ہے، اور مہمانوں کے لئے اس کو ذبح کردینا اس کا بہترین مصرف ہے۔)

حلفت یمینا بابن قحفان بالذي تکفّل بالأرزاق في السهل والجبل

تزال حبال محصداة أعدُّها لها ما مشی منها علی خُفِّهِ جمل

فأعْطِ ولا تبخل لمن جاء طالبا فعندی لها خُطُم، وقد زاحتِ العللُ

(میں ابن قحفان سے اس ذات کی قسم کھا کر کہتی ہوں جو تمام مخلوقات کی رزق کا ذمہ دار ہے کہ میں تمام اونٹوں کے لئے مسلسل ایسی اچھی رسیاں تیار رکھوں گی جو اس وقت تک کام دیں گی جب تک اونٹ اپنے پاؤں پر چلتے رہیں گے، ہر آنے والے سائل کو تم اونٹ دے دو، بخل نہ کرو، کہ دیے جانے والے اونٹ کے لئے میرے پاس لگام ہے، اب کوئی چیز اس داد و دہش سے مانع نہیں ہے)۔

اسلام سے پہلے کے عرب معاشرے کی ان مثالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں ایثار وقربانی نیز جود وسخا کی روایات کس قدر مستحکم تھیں، انہی روایات نے معاشرہ کو متوازن بنایا تھا، اور خاندان کو معاشرہ کی ترقی اور اس کے استحکام کا سرچشمہ بنایا تھا، اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ مضبوط خاندان ہی مضبوط معاشرہ کی بنیاد اور اس کی روایات کا اولین محافظ ہوتا ہے۔

پھر اسلام نے آ کر گھر کے مال سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی عورت کو مزید ترغیب دی، ام المؤمنین حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب عورت اپنے شوہر کے مال سے اللہ کے راستہ میں کچھ خرچ کرتی ہے تو اسے اجر ملتا ہے، شوہر کو اس لئے ثواب ملتا ہے کہ مال اس نے کمایا تھا، بیوی کو اس لئے کہ خرچ اس نے کیا ہے، اور خزانچی کو بھی اس کا اجر ملتا ہے، اور ان سب کو مکمل اجر ملتا ہے، کسی کے اجر میں کمی نہیں کی جاتی ہے۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق سے روایت ہے کہ انہوں نے نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے پاس بس وہی مال ہے جو (میرے شوہر) زبیر نے میرے پاس رکھا ہے، تو اس میں سے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے میں کوئی گناہ تو نہیں ہے، آپؐ نے فرمایا: جتنا دے سکو دو، روک کر نہ رکھو، ورنہ اللہ تم سے روک لے گا۔

کیا اب بھی عرب خاندان صدقات وخیرات کے طالبین کے لئے داد ودہش کی روایات پر قائم ہیں؟ یا اب وہاں خودغرضی اور بخل کی مغربی روایات کا دور دورہ ہے۔

کیا ہمارے مرد اب بھی عزت نفس اور اہل خانہ کی حفاظت کو اپنے لئے فخر کی بات سمجھتے ہیں، یا امریکی ویورپی روایات کی سرد مہری نے نئی نسل کی ذہنیت ہی بدل دی ہے؟

آج کی عورت تو اس بات پر فخر کرتی ہے کہ اس کے پاس بالکل جدید فیشن کے مطابق دسیوں جوڑے کپڑے، دیگر اسباب زینت اور وسائل خوشحالی نیز لوگوں کے جذبات بھڑکانے

کے سامان ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں ہم عربوں کے اخلاق نہایت پاکیزہ تھے، جس کی تصویر کشی حاتم طائی کے ان اشعار سے ہوتی جو اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے:

إذا ما صنعت الزاد، فالتمسي له أكيلا! فإني لست آكله وحدي

أخاطارقا، أو جاربيت، فإنني أخاف مذمات الأحاديث من بعدي

وإني لعبد الضيف ما دام نازلا ومافيّ الاتلک من شيمة العبد

(جب کھانا بنایا کروتو کسی مہمان یا پڑوسی کو میرے ساتھ کھانے کے لئے بلالیا کرو، میں اکیلے نہیں کھا سکتا، مجھے ڈر لگتا ہے کہ میرے پیچھے میری برائیاں کی جائیں گی، مہمان جب تک رہے میں اس کا غلام ہوں، اور سوائے اس ایک خصلت کے میرے اندر غلامی کی کوئی اور خصلت نہیں ہے)

کتنا اچھا ہو کہ زوجین ادیب، عالم، کریم یا بہادر ہوں، کہ اگر ایک ان خوبیوں کی راہ سے ہٹے تو دوسرا اسے اس راہ پر باقی رکھے۔

ہزار مردوں پر بھاری ایک عورت

جامعۃ الازہر کے کلیۃ اصول الدین کے فارغین (جن کی تعداد بہت ہے) معنوی ومادی طور پر ایک خاتون کے زیر بار احسان ہیں، اس عورت نے اپنا مال خدا کی راہ میں وقف کر کے اس سے بہت سے ادارے قائم کئے جو دسیوں برس سے خیر کے سرچشمے بنے ہوئے ہیں، اور جب تک اللہ چاہے گا مستقبل میں بھی یہ خیر پیدا کرتے رہیں گے۔

ان زیر بار احسان لوگوں کی طویل فہرست میں ایک میرا بھی نام ہے، آدھی صدی سے زائد کا عرصہ ہوتا ہے کہ جب سے میں اس کلیہ کے فیض یافتگان میں سے ایک ہوں، مجھے جن اساتذہ اور قائدین فکر اسلامی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے ان کی ایک بڑی تعداد نے تعلیم اسی عمارت کے کمروں میں حاصل کی ہے جس کو "خازندارہ" نے اپنی عظیم الشان مسجد کے پہلو میں تعمیر کرایا تھا۔

تعلیمی سال کے آغاز پر تعلیم کی ابتداء بڑی مسجد میں منعقد ایک بہت بڑے مجمع کے جلسہ سے ہوتی تھی، جس میں ہمیں یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ ہم علم اللہ کے لئے حاصل کریں، مال وجاہ کے لئے نہیں، اس میں ائمۂ علم اور تربیت وحق کی حفاظت میں ان کے کارناموں کا بھی تذکرہ کیا جاتا تھا۔ وہاں سے نکل کر جب ہمارے قدم درجوں کی جانب اٹھتے تھے تو ہم میں سے ہر ایک کے دل میں ابوالعلاء کا وہ جملہ ہوتا تھا جو انہوں نے ایک حنفی فقیہ کے بارے میں کہا تھا: "انہوں نے تمام عمر عبادت میں گزار دی، وہ علم کو اس کی اصل کی تحقیق اور محنت کے ذریعہ حاصل کرتے تھے"۔

لیکن ہمارے کلیہ کی عمارت بنوانے والی یہ خازندارہ کون تھیں؟ ہمیں نہیں معلوم،

ہمارے قدیم معاشروں میں عورت کا نام چھپایا جاتا تھا، ماں اور بیوی کا نام ذکر کرنا صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا، یہ برائی تھی، اور اس کا ارتکاب دین دار لوگ نہیں کیا کرتے تھے، شاید ان کے خیال میں عورت کے نام کا بھی پردہ تھا، جیسے یہ حضرات اس کی آواز کا پردہ بتایا کرتے تھے۔

کیا اس خیال کے پیچھے دین اسلام کارفرما تھا؟ نہیں اور ہرگز نہیں، نبوت کے بالکل آغاز میں (جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے) رسول اللہ ﷺ نے صفا پر کھڑے ہوکر صفیہ بنت عبدالمطلب اور فاطمہ بنت محمد کو بآواز بلند پکار کر خدا کی معرفت اور اس پر ایمان کی دعوت دی تھی۔

عورتوں کا نام لینا نہ عیب کی بات تھی اور نہ ہی اس کے چرچے کئے جاتے تھے، غلط تدین بسا اوقات فطرت کے اتنا یا اس سے بھی خلاف ہوتا ہے جتنا جاہلیت ہوتی ہے......اس جملۂ معترضہ کے بعد آیئے پھر خازندارہ کی تعمیر کرائی ہوئی مسجد اور کلیہ کی عمارت کی بات کرتے ہیں، کلیہ میں تعلیم عالیہ تک ہوتی تھی، علیا کے درجات اسی مسجد میں لگتے تھے، اور یہ فطری طور پر چھوٹے ہوتے تھے، ابھی تک شیخ امین خطاب (الجماعۃ الشرعیہ مصر کے دوسرے سربراہ) کے ''علل الحدیث'' کے موضوع پر ہونے والے محاضرات کا منظر میری نگاہ تصور کے سامنے گھومتا رہتا ہے، شیخ رحمۃ اللہ علیہ اللہ کے خوف سے بہت گریہ کرنے والے شخص تھے، طلبہ ان کے پاس ہوتے تو ایسا محسوس کرتے جیسے وہ بہت خشوع وخضوع والی نماز میں ہوں۔

لیکن پھر رفتہ رفتہ طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی، اور ایک زیادہ کشادہ مقام کی ضرورت محسوس ہونے لگی، اس وقت ہمارے کانوں میں یہ آواز بھی پڑی کہ ذمہ داران جلد ہی یتیم خانہ کی عمارت کلیۃ میں شامل کرلیں گے، مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ اسی نیک خاتون نے ایک یتیم خانہ اس نیت سے بنوایا تھا کہ اس میں رہنے والے یتیم بچوں کی تمام ضروریات کا انتظام یہ یتیم خانہ ہی کرے گا، اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے مال کا ایک حصہ خاص بھی کردیا تھا۔

لیکن کسی وجہ سے یہ وصیت نافذ نہیں ہوسکی، ایک صاحب نے ازراہ مذاق کہا تھا کہ شاید یتیم بچے نہیں ملے، میرا اپنا احساس یہ ہے کہ بہت سے اچھے منصوبے غلط اندازِ تنقید، غلط طرزِ نگرانی اور تعلق مع اللہ نہ ہونے کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتے ہیں، ہمارے یہاں واقفوں نے بہت وقف کئے ہیں، لیکن ان کی تنفیذ کرنے والوں کی خیانتوں اور کوتاہیوں نے ان وقفوں کو ضائع کر دیا ہے، لیکن چونکہ ایک کے نقصان سے دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے، اس لئے خالی یتیم گاہ میں ہم طلبہ کے درجات منتقل ہو گئے، ان شاء اللہ اس عظیم خاتون کو اس کی نیکی کا بھرپور ثواب ملے گا، کہ اس نے اپنی ذمہ داری رضاء خداوندی کی طلب میں ادا کر دی تھی۔ دوسروں نے اس کی میراث کے ساتھ جو کیا انہیں اس کا بدلہ ملے گا: ''**يوم تجد كل نفس ما عملت من خير محضرا وما عملت من سوء تود لو أن بينها وبينه أمدا بعيدا......**'' (وہ دن جب ہر نفس اپنے کئے کا پھل حاضر پائے گا، خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی، اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش یہ دن اس سے ابھی بہت دور ہوتا۔)

ابھی ہم اس عمارت میں تعلیم حاصل ہی کر رہے تھے کہ ایک اور بہت بڑی عمارت کے چرچے سننے میں آئے، معلوم ہوا خازندارہ اسپتال بنوارہی ہیں۔

میں نے دل کی گہرائیوں سے اس خاتون کے لئے دعا کی، اس نے ایک درس گاہ بنوائی، مسجد بنوائی، یتیم خانہ بنوایا اور اب اسپتال بنوارہی ہے؟ یعنی علم کی نشر واشاعت، عبادت کے لئے مقام کی فراہمی، یتامی کی تربیت اور مریضوں کا علاج یہ سب کچھ وہ کر رہی ہے؟ اس کے سینہ میں کیسا پاکیزہ دل ہے، کہ وہ مسلسل اللہ کو قرض حسن دیے جارہی ہے اور آخرت میں اپنی خوش روئی کا انتظام کر رہی ہے: ''**يوم ترى المؤمنين والمؤمنات يسعىٰ نورهم بين أيديهم وبأيمانهم بشراكم اليوم جنات تجري من تحتها الأنهار**'' (اس دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ

رہا ہوگا، [ان سے کہا جائے گا کہ] آج بشارت ہے تمہارے لئے، ایسی جنتیں ہوں گی، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی)

ہماری تاریخ میں ایسی نیک خواتین کی کوئی کمی نہیں ہے جنہوں نے اللہ کے راستہ میں اپنا مال اور اپنا وقت صرف کرنے میں بالکل بخل نہیں کیا، اور نہایت خاموشی کے ساتھ وہ کام کئے جو اکثر مرد نہ کر سکے، علم تاریخ کے محققین کی تحقیق کا ایک موضوع ایسے غیر مشہور ناموں کی تلاش بھی ہو سکتا ہے، جن کا اللہ کے یہاں بہت بڑا مقام تھا۔

ایک دن ہمیں یہ خبر ملی کہ اس عظیم مسجد کا نصف حصہ شبرا روڈ کی توسیع کی نذر ہونے جا رہا ہے، یہ بات عبداللطیف بغدادی کے زمانہ کی ہے، عوام کا خیال تھا کہ شعائر اللہ کی توہین ہو رہی ہے، اور یہ مسجد مٹادی جائے گی، بعض کم ہمت مسلمانوں کا خیال تھا کہ اب موت اہون ہے، اور انہوں نے مسجد کے ضائع ہونے سے پہلے ہلاکت کا ارادہ کر لیا تھا، میں اس وقت وزارۃ الاوقاف سے وابستہ تھا، میں شیخ باقوری کے پاس حالات جاننے کے لئے ان کے دفتر میں گیا۔

شیخ کے چہرے پر فکر وغم کے اثرات نمایاں تھے، وہ مسجد پر حملے کو اپنے اوپر اور اسلام کے اوپر حملہ تصور کر رہے تھے، انہیں عوام کے احتجاج اور معاملہ کی سنگینی نے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

بالآخر صدر عبدالناصر نے مسجد نہ گرائے جانے کا حکم دے دیا، اور اس طرح وہ لوگوں کے غصہ اور اس کے اثرات سے بچ گئے۔

لیکن وہ اسپتال جسے اس عظیم خاتون نے مسلمانوں کی خدمت کے لئے تعمیر کرایا تھا اسے اسلامی دائرہ سے نکال کر وسیع تر دائرہ میں لے جایا گیا، یعنی عبدالناصر نے اسے تمام ادیان کے پیرووں یا دین پسند اور دین مخالفوں سب کے لئے عام کر دیا۔

اس اقدام کے پس پردہ یہ ارادہ کارفرما تھا کہ اسلام کو ان اداروں سے بے دخل کر دیا

جائے جو مسلمانوں کے لئے خاص ہیں، اور اسلام کے حال و مستقبل کی حفاظت کر رہے ہیں، اسپتال اور یتیم خانہ کے ساتھ یہی کیا گیا، کلیہ کی عمارت میں اب علوم قرآن کی تعلیم ہوتی ہے، مسجد اب تک مرجع عوام ہے اگر چہ نہایت بوسیدہ ہوگئی ہے، وہ رونق قصہ پارینہ بن گئی۔

اللہ خازندارہ کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمائے کہ اس بندی نے اپنا مال اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیا، مریضوں کی دوا، بھوکوں کی غذا اور طلبہ کے لئے علم کا انتظام کیا، دیگر خواتین و حضرات کو بھی اللہ اس نمونہ کے اتباع کی توفیق دے۔

دونادر خواتین

حضرت خدیجہ ایک نہایت دور بین خاتون تھیں، وہ لوگوں کی حقیقت کا ادراک کرلیا کرتی تھیں، نیک فطرت انسان کی نیکی ان سے پوشیدہ نہیں رہتی تھی، اور نہ ہی وہ کسی برے آدمی کے تصنع سے دھوکہ کھاتی تھیں، غالبًا تجارت کے پیشہ نے ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی تھی، اس لیے کہ تاجر لوگوں کی حقیقت سب سے جلدی تاڑ لیتے ہیں۔

اپنے تجارتی میدان میں انہوں نے آں حضرت ﷺ کو پہچان لیا تھا، اور ان کے پاس اپنا پیغام بھیج دیا تھا، رسول اللہ ﷺ اہل مکہ کے لئے غیر معروف نہ تھے، کہ آپ کے پاکیزہ اخلاق نے سب کو آپ کا قائل اور آپ سے محبت کرنے والا بنا دیا تھا، اور باطن کی پاکیزگی بھی خوب روئی کی طرح بکثرت عوام الناس کی محبت کا سبب اور غیر مختلف فیہ چیز ہو جاتی ہے۔

لیکن شادی کے بعد حضرت خدیجہ کو اپنے شوہر کے بارے میں زیادہ واقفیت ہوئی، اور انہیں اندازہ ہوا کہ وہ کیسے کمال سے متصف ہیں، اسی لئے جب آپ ﷺ نے انہیں غار غرا میں پیش آئے ماجرے کی خبر دی تو انہوں نے ماضی پر مستقبل کو قیاس کیا، اور قسم کھا کر یہ بات کہی کہ ان کا جیسا انسان ضائع نہیں کیا جائے گا، اور یہ ناممکن ہے کہ اللہ کسی ایسے شخص کو رسوا کرے جسے اس نے تمام فضائل وخوبیوں سے نوازا ہے، انہوں نے آں حضرت ﷺ سے کہا: ”بخدا آپ کو اللہ کبھی بھی رسوا نہیں کرے گا، اس لئے کہ آپ سچ بولتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، بوجھ اٹھاتے ہیں، غرباء وفقراء کی مدد کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، مصیبتوں میں تعاون کرتے ہیں اور امانت دار ہیں“۔

یعنی اللہ دنیا وآخرت میں اس کردار کے انسان کو رسوا نہیں کرسکتا، یہ انسان شیطان کی

حرکتوں سے محفوظ ہے: ''إن عبادی لیس لک علیهم سلطان و کفی باللّٰه و کیلا''
(بلاشبہ میرے بندوں پر تمہارا کوئی زور نہیں ہے، اور اللہ کارسازی کے لئے کافی ہے)۔

حضرت خدیجہ قریش کی ممتاز خاتون تھیں، یعنی عرب کی بلند مقام خاتون تھیں، عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لائی تھیں، لیکن اسلام تو ہمہ گیر دین ہے، بڑوں کا بھی ہے اور چھوٹوں کا بھی، اگر کچھ مالدار اس کی جانب رغبت رکھتے ہیں، تو فقراء کی اکثریت اس کی آغوش میں آنا چاہتی ہے، اس میں محمود دوایاز کا کوئی فرق نہیں ہے، اگر حضرت ابوبکر جیسا ممتاز و قد آور شخص اس میں داخل ہوا تھا، تو غلام بلال بھی اس کے زیر سایہ آیا تھا، اور پھر کچھ ایسا ہوا تھا کہ حضرت عمر جیسے انسان نے کہا تھا: ''ابوبکر سیدنا و اعتق سیدنا'' (ابوبکر ہمارے سردار ہیں، اور انہوں نے ہمارے سردار [بلال] کو آزاد کیا تھا)۔

یہ دین طبقاتی نظام سے نا آشنا ہے، یہاں سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اگر ایک ممتاز گھرانہ کی خاتون خدیجہ سب سے پہلے اسلام لائی تھیں تو ایک کم حیثیت گھرانہ کی خاتون سمیہ نے سب سے پہلے جام شہادت نوش کیا تھا۔

اللہ بندوں کو آزماتا بھی طرح طرح سے ہے، شہرت، گم نامی، مالداری، فقر، صحت اور مرض سب آزمائش کے اس کے طریقہ ہیں، اور اصل امتحان آخرت کی بابت ہے، حضرت عثمان بن عفان (جو کہ قریش کے ممتاز افراد میں سے ایک تھے ان) کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بطحاء میں جارہا تھا کہ دیکھا عمار، ان کے والد اور والدہ کو دھوپ میں ستایا جارہا ہے تاکہ وہ اسلام چھوڑ دیں، عمار کے والد نے آپ سے کہا: کیا ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا؟ آپ نے فرمایا اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو، اے اللہ! یاسر کے گھر والوں کو معاف فرمادیجئے، اور آپ نے ایسا کر بھی دیا ہے''۔

اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے سرداران قریش آئے، ان میں ابوجہل بھی

تھا، اسے اس خاتون (حضرت سمیہ) کی جفاکشی اور صبر پر غصہ آیا اور اس نے اپنے نیزے سے ان کے پیٹ کے نچلے حصہ پر وار کر دیا، جس سے ان کا رحم پھٹ گیا اور وہ شہید ہو گئیں، اس طرح انہوں نے اسلام کی راہ میں جام شہادت نوش کرنے کا اعزاز سب سے پہلے حاصل کیا۔

سزائے خداوندی کے انتظار میں ایک مدت گزر گئی، یہاں تک کہ جب غزوۂ بدر ہوا، اور فرعون صغیر (ابوجہل) مسلمانوں سے لڑنے کے لئے نکلا، تو تقدیر خداوندی نے اس کا قتل دو مسلم نوجوان سے کرادیا، "**إناأرسلنا إليكم رسولا شاهدا عليكم كما أرسلنا إلى فرعون رسولا فعصىٰ فرعون الرسول فاخذناه أخذا وبيلا**" (ہم نے تمہارے پاس اس طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح فرعون کے پاس بھیجا تھا، تو فرعون نے رسول کی نامانی تو ہم نے اس کی سخت پکڑ کی)۔

کیسا مقام تعجب ہے کہ سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کی سعادت ایک خاتون کے حصہ میں آئی، اور شہادت کا اعزاز بھی سب سے پہلے ایک خاتون کو ملا۔

حضرت عائشہ بطور ادیب

ام المؤمنین حضرت عائشہ کو عربی ادب (شعرونثر) کا بہترین ذوق تھا، اور وہ اس سے فوراً استشہاد کیا کرتی تھیں، اس درجہ میں یہ صلاحیت کسی اور خاتون میں نظر نہیں آتی، حضرت علیؓ شہید ہوئے تو انہوں نے کہا:

فألقت عصاها واستقر بها النوى　　كما قرَّ عيناً بالإياب المسافر

(وہاں قیام کرکے وہ بالکل مطمئن ہیں، ویسے ہی جیسے مسافر گھر واپس پہنچ کر سکون سے ہوتا ہے)۔

اور جب حضرت ابوبکر کا آخری وقت آیا تو انہوں نے یہ شعر پڑھا:

لعمرک ما يغنى النزاء عن الفتى　　إذا حشرجت يوما وضاق بها الصدر

(آپ کی قسم کسی انسان کی مالداری وقت نزع کی پریشانیوں میں اس کے کام نہیں آتی)۔

حضرت ابوبکر نے ان کی توجہ اس سے بہتر بات کی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا: یہ نہ کہو، بلکہ کہو: ''وجاءت سكرة الموت بالحق ذلک ما كنت تحيد'' (موت کی جانکنی حق لے کر آ پہنچی، یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا)۔

حضرت عائشہ کے بھائی محمد بن ابی بکر مصر میں شہید کئے گئے تو انہوں نے یہ اشعار پڑھے:

وكنا كندمانى جذيمة حقبة　　من الدهر حتى قيل لن يتصدعا
فلما تفرقنا كأنى وما لكا　　لطول اجتماع لم نبت ليلة معا

(ایک زمانہ تھا کہ ہم دونوں جذیمہ کے دوستوں جیسے تھے، یہاں تک کہ یہ کہا جاتا تھا کہ یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے، پھر جب ہم جدا ہوئے تو اگر چہ ایک لمبا عرصہ ساتھ رہے لیکن لگتا یہ ہے کہ کبھی ساتھ ہی نہ رہے تھے)۔

راویوں کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ نے اپنے بھائی حضرت عبدالرحمٰن کو مصر بھیجا تا کہ وہ مرحوم بھائی کے یتیم بچوں کو لے کر آئیں، حضرت عائشہ نے ہی ان کی پرورش کی، یہاں تک کہ جب وہ بچے بڑے ہو گئے، تو انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن سے کہا: میں نے ان کی ذمہ داری اپنے اوپر اس لئے لے لی تھی کہ یہ کم عمر تھے، مجھے ڈر تھا کہ کہیں تمہارے گھر کی خواتین ان سے اکتا ئیں نہیں، کہ میں ان کے ساتھ زیادہ مہربان اور ان کی غلط باتوں کو زیادہ گوارا کرنے والی تھی، لیکن اب جب کہ یہ بچے بڑے ہو گئے ہیں، ان کی ذمہ داری تم لو، اور ان کے ساتھ وہ سلوک کرو جو حجیہ بن مضرّب نے معدان کے بچوں کے ساتھ کیا تھا۔

حجیہ کا قصہ یہ ہے کہ اپنے بھائی معدان کی وفات کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے یتیم بچوں کے پاس اس (حجیہ) کی خادمہ ٹوٹے برتن میں بچا ہوا دودھ لے جا رہی تھی، اس کی بیوی نے ان بچوں کو بس اتنا سا ہی دیا ہے، یہ دیکھ کر اس کو سخت غصہ آیا، اور اس نے حکم دیا کہ اس کا جانور اس کے گھر سے پہلے بھائی کے گھر میں دوہا جائے گا، اور یتیم بچے بچا کچا نہیں کھائیں گے، بلکہ کھانے میں باقاعدہ ان کا حصہ ہوگا، اس پر اس کی بیوی ناراض ہوئی تو اس نے اس سے کہا:

تلوم على مال شفانى مكانه　　إليک فلومي ما بدا لک واغضبى
رأيت اليتامى لا تسدفقورهم　　هدايا لهم في كل قعب مشعب
ذكرت بهم عظام من لواتيته　　حريبا لآسانى لدى كل مركب
أخى والذي إن أدعه لملمة　　يجبنى وإن أغضب إلى السيف يغضب

(میری بیوی! مجھے اس مال کے سلسلہ میں ملامت کرتی ہے، جس کا مصرف میرے

لئے سکون قلب ہے، اے بیوی! جب تک چاہو لعنت کرو، اور غصہ ہو، میں نے دیکھا کہ یتیموں کا فقر ٹوٹے پھوٹے پیالوں میں دیے جارہے ہدیوں سے کم نہیں ہورہا ہے، انہیں اس حال میں دیکھ کر وہ شخص یاد آگیا جس کے پاس اگر میں ضرورت مند ہوکے جاتا تو وہ ہر جانور میں میرا برابر کا حصہ پاتا، یعنی میرا بھائی، اگر میں اسے کسی مصیبت میں پکارتا تو وہ میری درخواست قبول کرتا، اور اگر جنگ کے موقع پر بلاتا تو بھی وہ میرے ساتھ ہوتا)۔

یعنی حضرت عائشہ نے اپنے بھائی کو ایک جاہلی شاعر کے کلام سے نصیحت کی۔ حضرت عروہ بن زبیر کا بیان ہے: میں نے طب، فقہ اور شعر کا حضرت عائشہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت عائشہ لوگوں میں سب سے ممتاز عالم تھیں، بڑے صحابہ بھی ان سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے، حضرت ابوسلمہ کا بیان ہے کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا حضرت عائشہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا، اور نہ ہی کسی کو ان کا جیسا فقیہ ومفسر پایا۔

حضرت عائشہ حضرات عمر وعثمان کے عہد میں بھی فتوے دیا کرتی تھیں۔

حضرت عائشہ کا علم فتوے تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ آپ کو وہ مقام حاصل تھا کہ آپ دوسروں کی آراء کی تصحیح کیا کرتی تھیں، فہم قرآن میں ان کا رسوخ، سنت نبوی کا گہرا علم اور ادب عربی میں وسعت معلومات نے ان کو قابل اعتماد مرجع بنادیا تھا۔

کیا ہر زمانے اور علاقے کی خواتین کے لئے یہ روشن حیات اسوہ نہیں ہے، کیا ہمیں خواتین سے یہ کہہ دینا چاہئے کہ گھروں میں بیٹھو، شعر ونثر اور دین ودنیا کسی چیز سے تمہارا کوئی تعلق ہیں ہے!!

عورت میدان علم وادب میں

پچھلی چند صدیوں میں فکر اسلامی کی تابانی ماند پڑی تو اس کے نتیجے میں علم وادب کے میدان میں عورت کے انسانی مستوی میں نہایت رسوا کن حد تک کمی آئی، اور زمانۂ جاہلیت کی روایات ورجحانات دوبارہ عود کرآئے، ماضی کی خواتین کے کلام کی مثال ہمیں انحطاط کے اس زمانے کی خواتین کے یہاں نہیں مل سکتی، دیکھئے ام صریح کندیہ نے اپنی قوم کے ان لوگوں کا کیسا مرثیہ کہا تھا جنہوں نے میدان میں ثابت قدم رہتے ہوئے جان دے دی تھی:

أبوا أن يفروا والقنا في نحورهم　　وأن يرتقوا من خشية الموت سلما

ولو أنهم فروا لكانوا أعزة　　ولكن رأوا صبرا على الموت أكرما!

(موت یقینی ہونے کی صورت میں بھی انہوں نے میدان نہیں چھوڑا اور موت سے ڈر کر فرار اختیار نہیں کیا، حالانکہ اگر یہ یہ میدان سے بھاگ جاتے تو بھی ان کی عزت پر کوئی حرف نہ آتا [اس لئے کہ یہ چند تھے اور ان کے دشمن بہت] لیکن انہوں نے بھاگنے کے مقابلہ میں مرجانے کو زیادہ عزت کی بات جانا)۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ ''اگر وہ بھاگتے ......'' اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ چند تھے اور مقابلہ میں پورا لشکر، اس لئے وہ وہ کہہ سکتے تھے جو حارث بن ہشام نے اس وقت میدان چھوڑتے ہوئے کہا تھا جب اس کا تن تنہا ایک بڑے لشکر سے مقابلہ ہو گیا تھا، حارث نے میدان چھوڑنے کا عذر بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

وعلمت أني إن أقاتل واحدا　　أقتل ولا يضرر عدوى مشهدى

فصددت عنهم والأحبة دونهم　　طمعالهم بعقاب يوم مرصد

(مجھے خیال ہوا کہ اگر میں نے تنہا جنگ کی تو مارا جاؤں گا اور میری شہادت سے دشمن کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، تو میں ان کے سامنے سے ہٹ گیا، اور میرے اعزہ ان کے پاس تھے اس امید میں کہ ایک دن اللہ انہیں ضرور بدلہ دے گا)۔

لیکن یہ نقطۂ نظر اس بہادر خاتون کو پسند نہیں آیا، اس کے نزدیک موت پر صبر زیادہ بہتر تھا، ایسی ہی خواتین کے یہاں وہ باغیرت وحمیت اولاد پیدا ہوتی ہے جو آگے چل کر بلا جھجھک دین کی حفاظت کے لیے اپنی جان نچھاور کر دیتی ہے۔

اسی طرح کی ایک عرب غریب خاتون ام صعلوک تھیں، ان کا بیٹا ایک جنگ میں گیا اور واپس نہیں آیا، اگر یہ اعرابی خاتون کسی انگریز لارڈ صاحب کی ماں ہوتی تو اس کے اشعار کو ادب کا شہ پارہ مانتے ہوئے اس کا ترجمہ دیگر زبانوں میں کیا گیا ہوتا۔

ان کا بیٹا دیگر غریبوں کی طرح غربت کے ازالہ اور خوشحالی کے حصول کی آرزو رکھتا تھا، اس عورت نے غربت کو ''ہلاکت'' سے تعبیر کیا ہے، اللہ کا دین اور فطرت سلیمہ غربت کو ایسا ہی تصور بھی کرتے ہیں، لیکن دینداری کے غلط تصور میں غربت کو صالحین کی راہ سلوک کی ایک منزل تصور کیا جاتا ہے۔

طاف یبغی نجوة من هلاك فهلك
ليت شعری ضلة أی شئ قتلك
أمريض لم تعد أم عدو ختلك
والمنايا رصد للفتى حيث سلك
أی شئ حسن لفتى لم يك لك
كل شئ قاتل حين تلقى أجلك
طالما قد نلت فی غير كد أملك

إن أمرا فادحا عن جوابی شغلک
سأعزی النفس إذ لم تجب من سألک
لیت قلبی ساعة صبره عنک ملک
لیت نفسی قدمت للمنایا بدلک

(وہ ہلاکت (فقر وغربت) سے نجات حاصل کرنے کے لئے نکلا تھا، اور ہلاک ہوگیا، مجھے معلوم نہیں کہ تمہاری موت کا سبب کیا تھا، اس لئے میں پریشان ہوئی، کیا کسی مرض سے تمہارا انتقال ہوگیا، اور تم واپس نہ آسکے، کیا کسی دشمن نے تمہیں ماردیا، اور جوان کہیں بھی جائے موت اس کی تاک میں رہتی ہے، اور نوجوانوں کی کون سے خوبی تم میں نہ تھی، جب موت کا وقت آتا ہے تو معمولی چیز بھی بہانا بن جاتی ہے، اور تم نے نہ جانے اپنے کتنے مقاصد بے محنت کے حاصل کئے، کسی نہایت اہم معاملہ نے تمہیں میرا جواب دینے سے روک رکھا ہے، اور اگر تم نے سوال کرنے والے کو جواب نہ دیا تو میں دل کو تسلی دے لوں گی، کاش میرا دل تم پر ایک لحہ بھی صبر کرلیتا، اور کاش تمہارے بدلے میں ہی مرگئی ہوتی)۔

اسی طرح صفیہ باہلیہ نے اپنے بھائی کا مرثیہ کہا: تو اپنے آپ کو اور اپنے بھائی کو ایسے دوگھوڑے قرار دیا جن میں مجد وکرم کے حصول کا مقابلہ تھا، وہ چلا گیا اور یہ تنہا رہ گئی۔

کنا کغصنین فی جرثومة سمقا حینا بأحسن ما یسموله الشجر
حتی إذا قیل قد طالت فروعهما وطاب فیآهما واستنظر الثمر
أخنی علی واحدی ریب الزمان وما یبقی الزمان علی شیء ولا یذر
کنا کأنجم لیل بینها قمر یجلو الدجی فهوی من بینها القمر

(ہم ایک تنے کی دو بہت اچھی شاخوں کی مانند تھے، یہاں تک کہ جب یہ کہا جانے لگا کہ یہ دونوں شاخیں بہت لمبی اور بہت سایہ دار ہوگئی ہیں، اور پھلوں کا انتظار کیا جانے لگا تو پھر

میرے اکلوتے کو گردش زمانہ نے ہلاک کردیا، اور زمانہ کسی چیز کو نہیں چھوڑتا ہے، ہم اہل خانہ کی مثال ان ستاروں کی تھی جن میں ایک مہتاب تھا، جو تاریکی دور کرتا تھا، اور یہی چاند سب کو چھوڑ کر چلا گیا)۔

مردوزن ایسے ہوتے تھے، کیا ابھی بھی ایسے ہی ہوتے ہیں؟

جھوٹے نبی کے مقابلے میں

قرن اول میں اسلامی خانوادہ کا ہر فرد اپنے دینی، سیاسی وعسکری مسائل سے دلچسپی رکھتا تھا، یہ دلچسپی محض خبریں جاننے تک محدود نہیں تھی، بلکہ اس کا دائرہ ماں بہنوں کی ذاتی شرکت تک پہنچا ہوا تھا۔

اس وقت ہمارے سامنے جنگ ردہ کا ایک عجیب وغریب واقعہ ہے، اس وقت مسلمانوں کی مسیلمہ کذاب کے پیروؤں سے زبردست جنگ چل رہی تھی۔

مسیلمہ کذاب عجیب وغریب انسان تھا، انسان کو بڑا بننے کا بھوت کسی بھی حد تک پہنچا سکتا ہے، وہ فرعون کی طرح روم کو نذر آتش اور ہلاکو کی طرح بغداد کو تباہ وبرباد بھی کرسکتا ہے۔ مسیلمہ کذاب ایک مشہور ڈاکو بن کر شہرت وناموری کی اپنی آرزو پوری کرسکتا تھا، لیکن دعوائے نبوت تو اس کے لئے کہیں سے بھی صحیح نہیں تھا۔

لیکن بڑے بننے کی خواہش نے اس سے یہ دعوا کرا کر رسول اللہ ﷺ کے نام یہ خط لکھوادیا کہ اب زمین دونوں کے درمیان نصف نصف ہوگی۔ آں حضرت ﷺ نے اس بے وقوفی سے صرف نظر کیا، اور حضرت حبیب بن زید کو اس سے گفتگو کرنے، حالات کا اندازہ کرنے اور اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کرنے کے لئے اس کے پاس بھیجا، حضرت حبیب ایمانی جذبات سے لبریز ایک نوجوان تھے، مسیلمہ نے ان کو دیکھا تو انہیں قتل کرنے کا ارادہ کرلیا، اس نے ان سے پہلے دریافت کیا کہ کیا تم محمد (ﷺ) کو اللہ کا رسول مانتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں! پھر اس نے پوچھا کیا تم مجھے بھی اللہ کا رسول مانتے ہو؟ حضرت حبیب اس سوال پر بہرے بن گئے، اور انہوں نے ایسا ظاہر کیا جیسے کہ وہ یہ سوال سن نہ پا رہے ہوں، مسیلمہ نے بار بار یہ سوال پوچھا، اور ہر مرتبہ

حضرت حبیب نے اس کا جواب اسی خاموشی سے دیا۔

اس طرز جواب پر مسیلمہ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے یہ طے کرلیا کہ وہ اس مومن نوجوان کو جسم کے اعضاء کاٹ کاٹ کر قتل کرے گا، جب بھی وہ یہ سوال پوچھتا، حضرت حبیب انکار کردیتے، وہ ظالم آپ کے جسم کا ایک عضو کاٹ دیتا، آخر جسم کے کٹے ہوئے حصوں سے اتنا خون نکلا کہ اس نوجوان کی جان جاتی رہی، اور وہ آخر وقت تک باطل کو حقیر اور حق کو عظیم ثابت کرتا رہا۔

ان کی والدہ نسیبہ بنت کعب انصاریہ کو اپنے بیٹے کے اس طرح قتل کئے جانے کی خبر ملی تو انہوں نے نذر مانی کہ جب تک وہ اپنے بیٹے کا بدلہ نہ لے لیں گی یا جب تک مسیلمہ قتل نہیں کردیا جائے گا وہ نہائیں گی نہیں، انہوں نے اپنے ایک اور بیٹے عبداللہ کو ساتھ لیا، جنگ یمامہ میں شرکت کی، اور مسیلمہ کے لشکر سے زبردست جنگ لڑی، انہوں نے اس جنگ میں نہایت بہادری کا ثبوت دیا، ان کے جسم پر بارہ زخم آئے، اور سخت خونریز جنگ کے دوران ان کا ہاتھ بھی کٹ گیا، لیکن اللہ کے لشکر نے مسیلمہ کو قتل کردیا اور بے پناہ جانوں کا نذرانہ پیش کرکے اس کے جھوٹ کو مٹا ڈالا، حق غالب آگیا، جھوٹ کی زبردست شکست ہوئی، اور حضرت نسیبہ اپنی نذر پوری کرکے واپس لوٹیں۔

جب حضرت نسیبہ گھر سے نکلی تھیں تو کیا انہیں کوئی واپس لوٹا سکتا تھا؟ ہرگز نہیں، وہ اس سے پہلے جنگ احد، بیعت رضوان، فتح مکہ اور غزوہ حنین میں شریک رہ چکی تھیں، اور اس سب سے پہلے وہ بیعت عقبہ کے موقعہ پر بھی تھیں، اپنے خانوادہ اور اپنے دین کے لئے مایۂ افتخار مجاہد و مسلم خاتون کے یہ عظیم کارنامے ہیں۔

آج اگر کوئی عورت کسی جھوٹے نبی اور اس کے متبعین کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلے تو ہمارے زمانے کے نام نہاد فقہاء اس سے کہیں گے: گھر میں بیٹھو! تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے۔

یہ نام نہاد فقہاء ذہنی و فکری انحطاط کے زمانہ کی پیداوار ہیں، کسی صحیح و بیدار معاشرہ میں یا سلف صالحین کے عہد میں ان کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

قانونِ ''حمد''

ایک معزز گھرانے کے خراب دن آئے تو معاشرہ میں اس کا مقام جاتا رہا، یہی صورت حال تھی کہ اس گھرانے سے کم حیثیت گھرانے نے اس کی ایک لڑکی کے لئے پیام دیا، حالانکہ وہ پہلے اس کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

اس گھرانے کے سربراہ کو اپنے مقام پر حرف آتا محسوس ہوا تو اسے غصہ آگیا، اور بہت افسوس کے ساتھ اس نے سوچا کہ کیا اگر اس کے برے دن چل رہے ہیں تو اب حقیر لوگ اس کی برابری کی ہمت کریں گے، اور غیر کفو خانوادے اب اس کی لڑکی کو رشتہ دیں گے۔

یہ سب کچھ سوچ کر اس نے پیغام دینے والے کو نہایت سخت جواب دیتے ہوئے کہا:
کیا تم ہمارے گھر کی ایسی معزز خاتون لے جا کر خود معزز بننا چاہتے ہو جس کے مقام کے تم ہو نہیں؟ یہاں سے چلے جاؤ، جب سے اسلام نے لڑکیوں کو درگور کرنے سے منع کیا ہے اس وقت سے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ رہی ہماری بیٹی تو حالات کی خرابی اس کی بلند مقامی پر بالکل اثر انداز نہیں ہوسکتی، مندرجہ ذیل اشعار میں اس خاندان کے سربراہ کا غصہ پھوٹا پڑتا ہے:

تبغی ابن كوز والسفاهة كاسمها ... ليستاد منا أن شتونا لياليا
فما أكبر الأشياء عندي حزازة ... بأن أبت مزريا عليك وزاريا
وإنا على عض الزمان الذي بنا ... نعالج من كره المخازى الدواهيا
فلا تطلبنها يا ابن كوز فإنه ... غذا الناس مذ قام النبي الجواريا
وإن التى حدثتها في أنوفنا ... وأعناقنا من الإباء كما هيا

(بیوقوفی تو بے وقوفی ہی ہے، ہمارے خراب دن دیکھ کر ابن کوز ہم معززین کے یہاں

شادی کرنا چاہتا ہے، یہ بات مجھے بالکل گراں نہیں گزری کہ تم ہمارے یہاں سے اس حال میں نامراد واپس ہوئے کہ ہم نے تم کو کمتر سمجھا تھا اور تم ہم پر تنقید کر رہے تھے ہم ان برے حالات میں بھی ذلت سے بچنے کے لئے بڑے مشکل حالات کا سامنا کر رہے ہیں، اے ابن کوز! میری بیٹی کو پیغام نہ بھیجنا کہ نبی ﷺ کے بعد سے لوگوں نے لڑکیوں کو کھلانا پلانا شروع کر دیا ہے [یعنی اب لڑکیاں بہت ہیں کسی اور کے یہاں پیغام دو] اور ہماری جس آن بان کے تذکرے تم نے سنے ہیں ماضی کی طرح وہ ابھی تک قائم ہیں)۔

اس واقعہ کی دو باتوں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کی، ایک یہ کہ فقر و فاقہ کے شکار اس شخص نے زبردست مصائب کا سامنا نہایت ہمت کے ساتھ کیا، اور کوئی بھی ایسا کام نہیں کیا جو اس کے مقام کے خلاف ہو، دوسری بات یہ کہ اس نے اپنی بیٹی کو نہایت اہم مقام دیا، اور اس کے مقام کو اپنی آن کا مسئلہ بنا لیا، اور یہ طے کر لیا کہ جب تک وہ زندہ رہے گا اس کی بیٹی نہایت باعزت زندگی گزارے گی، یہ دونوں خصلتیں ان معزز افراد کی خصوصیت ہوتی ہیں جو اپنی اور اپنے اہل خانہ کی عزت کا پاس رکھتے ہیں، بس اس قصہ کی یہی باتیں ہمارے لئے اہم ہیں۔

ماضی و حال کے عرب معاشروں میں کچھ مستحکم روایات پائی جاتی تھیں، ان میں سے کچھ صحیح تھیں تو کچھ غلط، حسب و نسب کا عربوں کے یہاں ایسا اہتمام تھا کہ اس کی سرحدیں غرور و تکبر تک جا پہنچتی تھیں، لیکن محترم احمد موسیٰ سالم کہتے ہیں: ماضی میں عربوں کے یہاں اس ''حمد'' (تعریف) کا قانون چلتا تھا جس سے آں حضرت ﷺ کا اسم گرامی (محمد) ماخوذ تھا، اور اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آں حضرت عربوں کی خوبیوں میں یکتا ہیں، اور آپ کا ان کی برائیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، پس آپ خود عربوں کے قانون کے اعتبار سے محمد (قابل تعریف) ہیں، یہ حقیقت بھی تھی، آپ نے خود فرمایا تھا کہ آپ ''خیار من خیار من خیار'' (اچھوں کے اچھوں کے اچھے) ہیں۔

اس اچھے قانون کی تشریح کرتے ہوئے خنساء نے کہا تھا:

نعف ونعرف حق القری ونتخذ الحمد کنزا وذخرا

(ہم پاک دامن ہیں اور مہمان نوازی کا حق جانتے ہیں، اور تعریف کو ذخیرہ وخزانہ شمار کرتے ہیں)۔

حاتم طائی کی والدہ (جو خود نہایت سخی تھیں) کے اشعار ہیں:

لعمري لقدما عضنی الجوع عضة فآلیت أن لا أمنع الدهر جائعا

وما إن ترون الیوم إلا طبیعة فکیف بترکی یا ابن أمی الطبائعا

(میری عمر کی قسم مجھے بہت پہلے ایک مرتبہ بھوک کی زبردست تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا، تو اس وقت میں نے یہ قسم کھالی تھی کہ میں کبھی کسی بھوکے سائل کو نہ ٹالوں گی، اور آج جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ فطرت ہے، اور اے ماں جائے میں فطرت سے کیسے دست بردار ہو جاؤں۔)

اس عورت کو ایک مرتبہ بھوک کا سامنا ہوا، تو اس نے یہ قسم کھالی کہ وہ جس بھوکے کو بھی دیکھے گی اسے مال دے گی، اس عورت کو یہ کرنے کا حق حاصل تھا، اور کوئی اسے روک نہیں سکتا تھا۔

اسلام سے پہلے ایک نہایت ممتاز ودانا خاتون، جمعہ بنت الخس نامی گزری ہیں، صدق مقالی کی عظمت انہوں نے اپنے اشعار میں یوں بیان کی ہے۔

وخیر خلال المرء صدق لسانه وللصدق فضل یستبین ویبرز

وإنجازک الموعود من سبب الغنی فکن موفیا للوعد تعطی وتنجز

(بہترین انسانی خصلت صدق گوئی ہے، سچ کی عظمت بالکل روز روشن کی طرح عیاں ہے، وعدہ نبھانا مالداری کا سبب ہے، لہٰذا وعدہ وفا کرنے والے بن کر لوگوں سے کئے ہوئے وعدوں کا پاس رکھئے، اور لوگوں کو دیجئے)۔

یہ ''قانون حمد'' جس کا تذکرہ ممتاز ادیب محترم احمد موسی سالم نے کیا ہے اسے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ قبول کیا جاسکتا ہے، اسلام کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ ہم اعمال اللہ کی رضا اور قیامت کے دن اس کا ثواب حاصل کرنے کی نیت سے کریں، جب ہم اعمال صرف اللہ کی خاطر کریں گے تو اللہ دنیا وآخرت میں ہمارا ذکر خیر کرائے گا، اسلام کے نزدیک ہم لوگوں کی جانب سے تعریف حاصل کرنے کے لئے کوئی عمل نہیں کر سکتے ہیں، اور نہ ہی اپنے آپ کو بدنام کروانے والے اعمال کرنے کی ہمیں اجازت ہے۔

عربوں کے یہاں فخر ومباہات کا رجحان تھا، اور یہ وہ رذائل ہیں جو عمل صالح کو بھی حبط کر دیتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت کی عرب خواتین صلح وجنگ دونوں طرح کے حالات میں نہایت خوبیوں کی مالک تھیں، اور ان کے سامنے اس طرح کی رکاوٹیں بھی نہیں تھیں جس طرح کی رکاوٹیں آج کی مسلم خواتین کے سامنے ہیں۔

قرن اول میں ایک خارجی خاتون اس لشکر کی قائد ہوسکتی تھی جس نے حجاج کو شکست دے کر اسے اس کے قلعہ میں محصور کر دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ (حجاج) بری طرح گھبرایا ہوا تھا، یہاں تک کہ حجاج کے اس کردار پر اسے عار دلاتے ہوئے ایک شاعر نے کہا تھا:

أسد علی وفي الحروب نعامة   فتخاء تنفر من صفير الصافر
هلا برزت إلى غزالة في الوغى   بل كان قلبک في جناحی طائر

(میرے اوپر شیر بنتے ہو، اور جنگوں میں وہ کمزور پرندے ثابت ہوتے ہو جو سیٹی سے اڑ جائے، تو پھر تم جنگل میں ہرنی سے مقابلہ کیوں نہیں کرتے، درحقیقت تمہارا دل پرندوں جیسا ہے۔)

لیکن بعد کے زمانوں میں بیچاری عورت اپنے گھر سے باہر کی کوئی چیز نہیں جان سکتی

تھی، اور پھر جب فاتح مغربی تہذیب ہم پر غالب آئی تو عورت کا کام محض اچھے کپڑوں اور آرائش کی نقالی تھی، لیکن ایٹم کی دریافت اور انفس وآفاق کی تحقیقات ایسی چیزیں نہیں ہیں جن میں عورت اپنی شرکت کی فکر کرے، اس لئے کہ یہ اس کے کام نہیں ہیں۔

خیر کے میدان میں اسلام مرد وزن کے درمیان کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا ہے، دونوں عقائد، عبادات اور اخلاق کے سلسلے میں یکساں ہیں، لہذا علم، عمل اور محنت کے میدان میں بھی سب برابر حیثیت کے ہیں۔

مرد کی مردانگی اس کے تقوے میں کوئی اضافہ نہیں کرتی ہے، اور عورت کی نزاکت سے اس کے مقام میں کمی نہیں آتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: ''...... **من يعمل سوء ا يجز به ولا يجد له من دون الله وليا ولا نصيرا، ومن يعمل من الصالحات من ذكر أو أنثى وهو مؤمن فأولئک يدخلون الجنة ولايظلمون نقيرا**' (جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا، اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لئے کوئی حامی ومددگار نہیں پا سکے گا، اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔)

آج دوڑ کے مقابلوں میں مردوں اور عورتوں کے مقابلے الگ الگ ہوتے ہیں، دونوں صنفوں کی مسافت اور ان کے اعداد وشمار الگ الگ رکھے جاتے ہیں۔ یہ چیز کھیلوں میں تو صحیح ہو سکتی ہے، لیکن نیکیوں کے حصول اور آخرت کی کمائی میں یہ تقسیم ناممکن ہے، وہاں عورت مردوں سے آگے بڑھ سکتی ہے، بسا اوقات عورت خواہ کسی نبی کی بیوی ہی کیوں نہ ہو مردوں کے مقابلے میں پیچھے بھی رہ جاتی ہے...... اسی لئے ہمارا کہنا ہے کہ فرعون کی بیوی فرعون سے بہتر تھیں، مریم علیہا السلام بے شمار مردوں سے افضل تھیں، اور حضرت نوح وحضرت لوط اپنی بیویوں سے

بہتر تھے۔

مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے مجھ سے کہا: قرآن مردوں کو خواتین پر ترجیح دیتا ہے، اپنے اس خیال خام کی دلیل کے طور پر انہوں نے یہ آیت قرآنی پیش فرمائی: ''ولیس الذکر کالأنثی ''(اور مرد عورت جیسا نہیں ہے)، ان کا یہ استدلال غلط فہمی پر مبنی تھا۔

یہ قرآنی جملہ جناب عمران کی اہلیہ کے منہ سے نکلا تھا، وہ حاملہ تھیں، ان کا خیال تھا کہ ان کے یہاں ایک بیٹا ہوگا جو مسجد اقصیٰ کا خادم اور عبادت گزاروں کا قائد ہوگا، لیکن جب ان کے گمان کے برخلاف ان کے یہاں لڑکی ہوئی تو انہوں نے یہ جملہ کہا، اس لئے کہ عبادت گزاروں کی قیادت کی عورت اہل نہیں ہوسکتی تھی۔

پھر انہوں نے حقیقت کو تسلیم کرلیا، اس لئے کہ وہی اللہ کی منشا تھی، انہوں نے اپنی بیٹی اور اس کی ذریت کی حفاظت کی دعا اللہ سے کی، اللہ نے یہ دعا قبول کی، اور اس نوخیز بچی کو کروڑوں مردوں پر فوقیت دی، پھر اس بیٹی کے بیٹے کو اولوالعزم انبیاء میں سے ایک بنایا۔

ہاں البتہ بلاشبہ کچھ ذمہ داریاں مردوں کے ساتھ تو کچھ ذمہ داریاں عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں، اور ان خصوصیات کا خداوندی انصاف وفضل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

باب سوم

آیئے! گھر سے آغاز کریں

شادی عبادت ہے

انسانی زندگی کی حفاظت اور قیامت تک اس کے تسلسل کو قائم رکھنے کی خواہش اسلامی تعلیم ہے۔اسی مقصد کے پیش نظر شادی کی ترغیب دی گئی ہے، اسلام کو یہ بات پسند ہے کہ زوجین والدین بن جائیں، اور اولاد کے بعد ان کے یہاں پوتے پوتی بھی ہوں،'' **واللہ جعل لکم من أنفسکم أزواجا، وجعل لکم من أزواجکم بنین وحفدة ورزقکم من الطیبات**'' (اور اللہ نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے جوڑے بنائے، اور پھر تمہارے جوڑوں سے تمہیں بیٹے پوتے عطا کئے، اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں)۔

اسی لئے رہبانیت کو اسلام نے مسترد کر دیا ہے، اس لئے کہ راہب اور راہبہ پر کاروان حیات ختم ہو جاتا ہے، اگر یہ نام نہاد عبادت عام ہو جائے یعنی سب لوگ رہبانیت اختیار کرنے لگیں تو اس کا مطلب سوائے انسانی برادری کی خودکشی اور دنیا کی تباہی کے اور کیا ہوگا؟

لہذا کسی کو اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ اسلام نے شادی کو عبادت اور اس کے زیر سایہ جنسی خواہشات کی تکمیل کو کار ثواب قرار دیا ہے، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''**من أراد أن یلقی اللہ طاهرا مطهرا فلیتزوج الحرائر**'' (جو اللہ کے حضور میں پاک صاف حاضر ہونا چاہے اسے چاہئے کہ آزاد خواتین سے شادی کرے) ایک اور حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد نقل فرمایا گیا ہے: ''**أربع من أعطیهن فقد أعطی خیر الدنیا والآخرة ، قلب شاکر ولسان ذاکر، وبدن علیٰ البلاء صابر، وزوجة لا تبغیه حوبا فی نفسها وماله**'' (جسے یہ چار چیزیں مل گئیں اسے دنیا و آخرت کا خیر مل گیا: شکر کے جذبات سے لبریز دل، اللہ کا ہمہ وقت ذکر کرنے والی زبان، مصیبتوں پر صبر کرنے والا جسم اور ایسی بیوی جو اپنے جسم

اور شوہر کے مال کے سلسلے میں خیانت نہ کرے)۔مصیبتوں پر صبر کرنے والے جسم سے مراد ہمارے نزدیک وہ مضبوط بدن ہے جو اپنی ذمہ داریاں بخیر وخوبی ادا کر سکے اور اس سلسلہ میں نہ تھکے اور نہ ہمت ہارے، کیا مردانگی اس کے علاوہ کچھ اور ہے؟

لیکن اس موقع پر نہایت اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ آخر ایک مسلمان مرد کیسی عورت سے شادی کرے، اس سلسلہ میں یہ جاننا ضروری ہے کہ شادی صرف آبادی بڑھانے کے لئے کیا جانے والا عقد نہیں ہے، بلکہ اسلام نے اسے آبادی کے ساتھ ساتھ ایمان میں اضافے کا ایک نظام بھی بنایا ہے۔

اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اچھی طرح کھانے پینے والی نسلیں وجود میں لائی جائیں، بلکہ اس سے مقصود ایسی اولاد کو وجود میں لانا ہے جو اس کائنات کے ہدف تخلیق کو پورا کرے، والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عقل وقلب سلیم رکھنے والی اچھے اخلاق کی حامل اور بلند مقصد ذریت کی تربیت میں تعاون کریں۔

ابوالأنبیاء حضرت ابراہیم کو اللہ نے اولاد سے نوازا تو دیکھئے انہوں نے کیا رویہ اختیار کیا، قرآن نے اس سلسلہ میں ان کا یہ بیان نقل کیا ہے: ''**الحمد لله الذي وهب لي علىٰ الكبر إسماعيل وإسحاق إن ربي سميع الدعاء رب اجعلنى مقيم الصلاة ومن ذريتى ربنا وتقبل دعاء**'' (تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے کبرسنی میں مجھے اسماعیل واسحاق نوازے، میرا رب دعاؤں کو بہت سننے والا ہے، اے میرے رب مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا، اے ہمارے رب اور میری یہ دعا قبول کر لے)۔

یعنی انہیں ایسی اولاد کی خواہش تھی جو اللہ کے سامنے سجدہ ریز اور اس کی عبادت گزار ہو، کہ فاسق وملحد اولاد کے والدین نہایت بدقسمت ہیں، آج دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ ہیں جنہیں اس کی کوئی فکر نہیں ہے کہ ان کی اولاد کا دینی واخلاقی حال کیا ہوگا؟ وہ کافر ہوں گے یا

مومن؟ ان بیچاروں کے نزدیک اصل اہمیت بس اولاد کی معاشی حالت کی بلندی ہے، خواہ بعد میں یہ جہنم کا ایندھن بنیں۔

ہم مسلمانوں کے نزدیک یہ طرز فکر نہایت غلط ہے، ہم ایسے لوگوں کو انسانی جسم رکھنے والے جانور ہی سمجھتے ہیں۔

اللہ نے اپنے پسندیدہ بندوں کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ جب وہ ازدواجی زندگی کا آغاز کرتے ہیں تو یوں دعا کرتے ہیں: "ربنا هب لنا من أزواجنا وذرياتنا قرة أعين واجعلنا للمتقين إماما" (اے ہمارے رب! ہماری بیویوں اور اولاد کو ہمارے لئے وجہ سکون بنا اور ہمیں متقین کا امام بنا)۔

وہ نگاہ جو مختلف جگہوں پر پڑتی رہے وہ خائن ہے جو انسان کو ضائع کر دیتی ہے، زوجین کو ایک دوسرے کے لئے وجہ سکون اور ان میں سے ہر ایک کو اس رشتہ کی بقا کے لئے پرعزم ہونا چاہئے، اسی طرح ان دونوں کو اولاد کی تربیت اور ان کے حال و مستقبل کو سنوارنے کے لئے باہم تعاون کا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔

چونکہ خیر کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا مطالبہ ہے اس لئے مسلمان کو بلند ہمت اور عالی حوصلہ ہونا چاہئے۔

اسے پیشوا و مقتدا بننا چاہئے، کاہلی کا رویہ اختیار کر کے چوتھے گریڈ کا نہیں بننا چاہئے، عالی حوصلگی ایمان کا تقاضا ہے، اللہ اسے پسند کرتا ہے جو فردوس اعلیٰ کا سوال کرتا ہے۔

ایک مسلم گھرانے کی تعمیر بڑی محنت کی طالب ہوتی ہے۔

شادی سوچ سمجھ کر کیجئے!

پچھلی نسلوں کے اثرات اگلی نسلوں میں یقیناً منتقل ہوتے ہیں، لیکن یہ معاملہ بڑا حیرت ناک ہے، یقین کے ساتھ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اگلی نسلوں میں پچھلی نسلوں کے کتنے اثرات منتقل ہوں گے، اگلی نسل میں کیا اثرات آئیں گے! اور بعد کی نسلوں میں کتنے اثرات منتقل ہوں گے؟ اور پچھلی نسلوں کی کون سی خصوصیات اگلی نسلوں میں منتقل نہیں ہوں گی بلکہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گی۔

پھر پچھلی نسلوں سے اگلی نسلوں میں منتقل ہونے والی ان خصوصیات کو اگلی نسلوں کے ماحول کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کبھی مستقبل کا ماحول ان کے لئے ساز گار ہوتا ہے تو کبھی ناساز گار، بسا اوقات اگلی نسلوں کی نفسیاتی خصوصیات ان کو مزید نکھار دیتی ہیں تو کبھی ان کو بے حرکت وغیر مفید بنا دیتی ہیں۔

یہ وہ قدریں ہوتی ہیں جنہیں ہم نذر آتش نہیں کر سکتے ہیں، البتہ ہمارے لئے شریعت کے احکام پر عمل کرنا لازم ہے، کہ اس میں ہماری دنیا وآخرت کی کامیابی پنہاں ہے۔

ایسا ہی ایک شرعی حکم یہ ہے کہ خانہ آبادی کے وقت نیک بیوی کا انتخاب ہی لازمی ہے، کہ شادی محض جنسی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ شادی یا خانہ آبادی اس سے بلند چیز ہے۔

اس سلسلہ میں بعض روایات مروی ہیں، جنہیں ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔ مثلاً ایسی ہی ایک روایت ہے: ”إياكم وخضراء الدين! قالوا: وما خضراء الدين؟ قال: المرأة الحسناء في المنبت السوء“ (”خضراء الدین“ سے بچو، لوگوں نے دریافت کیا

کہ ''خضراء الدین'' سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: برے پس منظر کی خوبصورت عورت)۔

ایسی ہی ایک حدیث ہے: ''شادی کے لئے انتخاب سوچ سمجھ کر کرو، کہ نسبی سلسلہ کا اثر پڑتا ہی ہے''۔

یہ حدیثیں ضعیف ہیں، لیکن ان کے ضعف کی تلافی حدیث صحیح ''**الناس معادن**......'' سے ہو جاتی ہے اس لئے کہ ہم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، اور خود مٹی بھی طرح طرح کی ہوتی ہے، کوئی سرسبز و شاداب تو کوئی بنجر، کوئی نرم تو کوئی سخت۔

شادی کے خواہش مند کو بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہوئے پاکیزہ ترین کا انتخاب کرنا چاہئے۔

عام طور پر ہم لوگ خوبصورتی، مال اور خاندانی وجاہت کو اہمیت دیتے ہیں، میں نوجوانوں سے یہ نہیں کہتا کہ وہ ان امور پر توجہ نہ دیں، یقیناً دیں، لیکن ثانوی درجہ میں، ان کا پہلا مقصد اچھی دینی و اخلاقی معیار کی خاتون ہونی چاہئے کہ اگر ایسی خاتون نہ ملی تو دیگر امور بھی مفید نہ ہوں گے۔

میں سمندروں کے بارے میں پڑھ رہا تھا کہ ایک خوش منظر مچھلی نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی، اس کی کھال پر خیرہ کن نقاشی تھی، پھر مجھے معلوم ہوا کہ یہ مچھلی زہریلی ہوتی ہے، میں نے سوچا: کیسے تعجب کی بات ہے؟ ایسی خوش منظر اور ایسی موذی، ایسے لوگ انسانوں میں بھی بہت سے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**ومن الناس من يعجبک قوله في الحياة الدنيا ويشهد الله علىٰ ما في قلبه وهو ألد الخصام**'' (کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن ہوتے ہیں)۔

شادی کے خواہش مند کو میری نصیحت ہے کہ وہ ظاہری خوبصورتی سے دھوکہ نہ کھائے،

اس کا مطلوب پاکیزہ باطن ہونا چاہئے، اگر آپ یہ سوال کریں کہ باطن کے حالات کا کسے علم ہوسکتا ہے؟ تو ہمارا جواب ہوگا: گھرانے بہت کچھ بتادیتے ہیں، بیٹی عام طور پر اپنے والدین جیسی ہی ہوتی ہے، ہمیں مشورہ اور استخارہ بھی کرنا چاہئے۔

اسی لئے ادارۂ صحت (W.H.O.) نے شادی کے خواہش مندوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اچھے ماحول کی پروردہ اور اچھے خاندان کی لڑکیوں کو ہی بیویاں بنائیں۔

عثمان بن ابی العاص ثقفی نے اپنی اولاد کو اچھی جگہ شادی کرنے اور برے خاندانوں سے بچنے کی نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: ''اے بیٹو! شادی شدہ مرد ایک کسان کی مانند ہے، لہذا اسے دیکھنا چاہئے کہ وہ بیج کہاں ڈال رہا ہے، برے پس منظر سے شاذونادر ہی اچھے انسان برآمد ہوتے ہیں، لہذا خوب سوچ سمجھ کر شادی کرو! خواہ اس میں کچھ وقت ہی کیوں نہ لگے''۔

حضرت عمر کے ایک صاحب زادے نے ان سے دریافت کیا کہ اولاد کا باپ پر کیا حق ہے؟ فرمایا: ''یہ کہ وہ اس کے لئے اچھی ماں کا انتخاب کرے، اس کا اچھا نام رکھے، اور اسے قرآن کی تعلیم دے''۔

اچھی ازدواجی زندگی کا مومنین سے مطالبہ کیا گیا ہے، مؤمن اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ وہ سکون کی زندگی گزارے، اس لئے عبادالرحمان (اللہ کے پسندیدہ بندوں) کی یہ دعا قرآن نے بتائی ہے: ''**ربنا هب لنا من أزواجنا وذرياتنا قرة أعين واجعلنا للمتقين إماما**'' اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا) حضرت عائشہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: ''سوچ سمجھ کر شادی کرو، اور اپنے ہم سروں میں کرو''۔

شادی کے لازمی قواعد

شریف اور اچھی اولاد کو یقینی بنانے کے لئے اسلام نے شادی کے کچھ ایسے قواعد وضع کئے ہیں جن کی رعایت لازمی ہے، اسی لئے اللہ اور آخرت کا انکار کرنے والی ملحد اور متعدد معبودوں پر ایمان رکھنے والی بت پرست مشرک خاتون سے شادی کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ایسی عورت اللہ کے کسی حکم کا پاس نہیں رکھے گی، اور پاک دامنی و بدکرداری میں اس کے نزدیک کوئی فرق نہ ہوگا۔

موحد باندی مشرک ملکہ سے بہتر ہے، ایک عام مومن خاتون کسی یونیورسٹی کی ملحد استاذ سے بہتر ہے، ہم ایسی خاتون کے خواہش مند ہیں جو اپنی اولاد میں خدا کا خوف، اچھے اخلاق، ذوق عبادت اور برائیوں سے اجتناب کی خصوصیات پیدا کرے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”**ولا تنكحوا المشركات حتى يؤمن ولأمة مؤمنة خير من مشركة ولو أعجبتكم ولا تنكحوا المشركين حتى يؤمنوا ولعبد مؤمن خير من مشرک ولو أعجبكم أولئک يدعون إلى النار والله يدعو إلى الجنة والمغفرة بإذنه.....**“ (تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، ایک مؤمن باندی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو، اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، ایک مؤمن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو، یہ لوگ تمہیں جہنم کی طرف بلاتے ہیں، اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے)۔

کیا یورپی وامریکی خواتین ایسی ہیں؟ وہ مسیحی ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، اور کاش وہ

اپنے اس دعوے میں سچی ہوتیں، مغربی معاشرہ گناہوں میں گلے گلے ڈوبا ہوا ہے، وہاں دن بھر میں ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ کے حضور حاضری کا خیال کسی کو نہیں آتا، بے حیائی کا عام رواج ہے، اور قانونی شادی سے پہلے ہی بکارت زائل ہوچکی ہوتی ہے۔

ہمارے علم کی حد تک ماضی کی کسی تہذیب میں حرام شہوت رسانی کا وہ حال نہیں رہا جو آج مغربی ممالک میں ہے، وہاں بے حیائی و بدکرداری آخری حدود پر ہے۔

ناممکن ہے کہ ان بدکردار خواتین سے شادی کرکے کوئی مسلمان نیک اولاد حاصل کرسکے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات والطیبات للطیبین والطیبون للطیبات أولئک مبرءون مما یقولون لھم مغفرۃ ورزق کریم**'' (خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں، اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے، پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے، ان کا دامن پاک ہے ان باتوں سے جو بنانے والے بتاتے ہیں، ان کے لئے مغفرت ہے اور رزق کریم)۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے کتابی خواتین سے شادی کی اجازت دی ہے، لیکن اس زمانہ میں کتابی خواتین ہیں کہاں؟ ماضی میں کچھ ایسی کتابی خواتین پائی جاتی تھیں جن کے یہاں معرفت خداوندی، پاکدامنی اور آسمانی دین کا کچھ حصہ پایا جاتا تھا، مسلمان مرد کی ان کے ساتھ شادی ان کے لئے اسلام کا تعاون حاصل کرنے اور پھر اس کے دائرہ میں داخل ہونے کا ذریعہ ہوتی تھی، ایسی شادیوں کی بنیاد یہ تھی کہ اولاد اپنے باپ کے دین، اس کے طرز عبادت اور اس کی خوبیوں میں پروان چڑھے، اور اب ایسی شادیوں کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

خود ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایسی شادیاں اولاد کے ساتھ ساتھ والد کے دین کو بھی لے ڈوبتی ہیں، اور غیر مسلم خاتون سے کی گئی شادی کا انجام نہایت خراب ہوتا ہے، اور غالب تہذیب سب کو اپنے سیلاب میں بہا لے جاتی ہے۔

اسلام نے مسلم خاتون کی غیر مسلم سے شادی کرنے کو قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے، ایسے تعلقات زنا کی نئی صورت بن کر سامنے آرہے ہیں، بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ: کتابی خواتین سے شادی کی اجازت اگر اسلام نے دی ہے تو پھر مسلم عورت کی کتابی مرد سے شادی کو غلط کیوں قرار دیا ہے۔

اس سول کا جواب ہے کہ مسلمان سربراہِ خانہ حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ کی توہین کا کبھی دل میں خیال بھی نہیں لاسکتا۔ وہ ان دونوں کا احترام حضرت محمد (ﷺ) کی طرح ہی کرے گا، یہ دونوں اس کے نزدیک نہایت عظیم المرتبت، اولوالعزم اور سچے رسول تھے، یہ وہ چیز ہے جس سے حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ کے پیروؤں کو اطمینان حاصل ہوگا۔

جب کہ یہود ونصاریٰ کو حضرت محمدؐ سے آخری درجہ کا بغض رہا ہے، اور انہوں نے آپ پر ہر طرح کی تہمت لگائی ہے۔

انگلینڈ نے اپنا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ایک ایسے مصنف کو دیا ہے جس کا کل سرمایہ آں حضرت ﷺ کی شان میں گستاخی اور آپ پر افترا پردازی ہے، ایسے ماحول والے گھر میں ایک مسلم خاتون کیسے رہ سکتی ہے۔

شادی محض مرد کا ایک عورت سے عشق نہیں ہے...... !! یہ اجتماعی آداب اور نفسیاتی اطمینان پر، ایمان باللہ اور خداوندی احکام کی روشنی میں زندگی گزارنے کے ساتھ خانہ آبادی سے عبارت ہے۔

شادی: نشان راہ ہے منزل نہیں ہے

خاندان کا اولین فریضہ ایمان، عبادت، اخلاق حسنہ، صحیح طریقۂ حیات، اچھی اقدار وروایات کی حفاظت ہے، والدین اس فریضہ کی ادائیگی کے مشترکہ ذمہ دار ہیں، بالخصوص اس حوالہ سے ماں کے کاندھوں پر نہایت اہم وگراں قدر ذمہ داری ہے۔

شادی کا ارادہ رکھنے والے مرد کو اس حقیقت پر نظر رکھنی چاہئے، شادی کو صرف جنسی لذت اندوزی کا ذریعہ سمجھنا نہایت غلط ہے۔

کچھ لوگ کھانے کے لئے جیتے ہیں، ان سے بہتر وہ لوگ ہیں جو جینے کے لئے کھاتے ہیں، شہوت کے سیلابِ تند وتیز کو ہم سب خوب جانتے ہیں، اس کی تیزی میں کمی لانا مطلوب ہے، اور یہ کام دیر یا سویر ہو جائے گا، اس کے یقینی اثرات نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں، اگر ہم نے ان کی نسل کی اچھی طرح تربیت نہیں کی اور ان کو کما حقہ توجہ نہیں دی تو ہمیں کبھی بھی انسانی کمال حاصل نہیں ہو سکے گا، اور ہم ایسی اولادیں اپنے پیچھے چھوڑ کر جائیں گے جو دشمنوں کا چارہ یا ان کے ٹینکوں کا نشانہ بنیں گے، لہذا نہایت اہم کام ہے کہ ہم اگلی نسل کو پاکیزہ، ذہین، محنتی، طاقتور اور قائدانہ صلاحیتوں کا مالک بنائیں، وہ صلاح کی خواہش مند اور فساد سے نفور ہوں۔

اس سلسلہ کا پہلا کام یہ ہے کہ مائیں معروف نیک خانوادوں سے لائی جائیں، کہ اس سے اچھا پھل برآمد ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا رشاد ہے: "**والبلد الطيب يخرج نباته بإذن ربه والذي خبث لا يخرج إلا نكدا**" (اچھی زمین اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے، اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا)۔

اچھے خانوادوں سے نیک توقعات ماضی سے رکھی جاتی ہیں، یہی وجہ تھی کہ جب لوگوں نے حضرت مریم کو بے شادی کئے حاملہ پایا تو حیرت میں رہ گئے اور کہہ اٹھے: ”**يا أخت هارون ماكان أبوک امرأ سوء وماكانت أمک بغيا**“ (اے ہارون کی بہن! نہ تمہارا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تمہاری ماں بدکردار تھی) اس واقعہ کا خارق عادت ہونا تو لوگوں کو تب معلوم ہوا جب نولود بچے نے یہ کلمات اپنی زبان سے ادا کئے: ”**قال إني عبدالله آتاني الكتاب وجعلني نبيا**“ (انہوں نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا)۔

ایک صحیح حدیث میں لوگوں کو ”معدنی کانوں“ سے تشبیہ دی گئی ہے، اس حقیقت کا ادراک ہم سے اس موضوع کی ان دو حدیثوں کو قبول کروا دیتا ہے: ”**تخيروا لنطفكم فإن العرق دساس**“ (اپنی بیویوں کا سوچ سمجھ کر انتخاب کرو کہ اگلی نسلوں میں پچھلی نسلوں کے اثرات آتے ہیں) اور ”**إياكم وخضراء الدين! قالوا وما خضراء الدين؟ قال: المرأة الجميلة في المنبت السوء**“ (خضراء الدین سے بچو، لوگوں نے عرض کیا اس سے کیا مراد ہے، فرمایا برے پس منظر کی خوبصورت عورت) ایک قدیم عربی شاعر نے بھی کہا تھا:

على وجه ميّ مسحة من ملاحة وتحت الثياب الخزي لو كان باديا

ألم تر أن الماء يكدر طعمه وإن كان لون الماء أبيض صافيا

(میہ دیکھنے میں حسین ہے اور اس کا باطن نہایت باعث رسوائی ہے، کبھی کبھی صاف دکھائی دینے والا پانی بھی تو بدمزا ہوتا ہے)

ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: ”**تنكح المرأة لأربع لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها، فاظفر بذات الدين تربت يداک**“ (عورت سے شادی چار وجہوں سے کی جاتی ہے: اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب کی وجہ

سے، اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے، لہذا دین والی کا انتخاب کرکے کامیاب ہوجاؤ۔)

آج لوگ مالدار بیوی ڈھونڈتے ہیں، اس ملکۂ حسن کو حاصل کرنے کے لئے مقابلہ کرتے ہیں جو اپنا جسم ثقافتی پروگراموں اور فیشن شوز میں دکھاتی پھرتی ہے، کسی بدنیت ہاتھ کے اٹھنے پر اعتراض نہ کرنے والی عورت کی بھی کوئی حیثیت ہے؟ اور یقینی طور پر تباہ ہونے والی اس بنیاد پر بننے والے گھر کی کیا حیثیت ہے؟ شادی ایک وسیلہ ہے، ہدف نہیں، اس کا مقصد محض جنسی آسودگی نہیں ہے، وہ تو درحقیقت بلند صفات انسانیت کے امتداد کا ایک وسیلہ ہے۔

اوسط درجہ کی آمدنی رکھنے والے گھر کو نیک وپاک باز بیوی اس نہایت مالدار گھر سے زیادہ اچھی طرح بساتی ہے جس میں اخلاقی اعتبار سے کوئی کم حیثیت عورت رہتی ہے، رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے: ''**الدنيا متاع وخير متاع الدنيا المرأة الصالحة**'' (دنیا عارضی ہے، اور اس کی بہترین نعمت نیک بیوی ہے) ایک اور حدیث میں اس کی تفصیل آں حضرت ﷺ نے یوں بیان فرمائی ہے: ''**مااستفاد المؤمن بعد تقوى الله خيرا من زوجة صالحة، إن أمرها أطاعته، وإن نظر إليها سرته، وإن أقسم عليها أبرته، وإن غاب عنها نصحته في نفسه وماله**'' (اللہ تعالیٰ کے تقوے کے بعد مومن کو ملنے والی سب سے بڑی نعمت نیک بیوی ہے، جس کو وہ حکم دے تو مانے، اسے دیکھے تو وہ خوش کردے، اس پر قسم کھالے تو اسے پورا کرادے، اور اگر کہیں جائے تو اس کے پیچھے وہ اس کا اور اس کے مال کا خیال رکھے)۔

کیا ایسی خاتون بغیر تیاری اور تربیت کے وجود میں آسکتی ہے؟ کیا ایسی بیوی کسی ایسے جاہل واخلاقی اعتبار سے پسماندہ ماحول میں از خود وجود میں آسکتی ہے جہاں اس کی اچھی تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہ ہو؟

مردوزن کے درمیان تعلقات کا تنہا راستہ

جنسی آسودگی کا ایک ہی مناسب راستہ ہے: شادی، اس کے علاوہ جنسی آسودگی کے تمام وسائل کو تمام مذاہب ممنوع قرار دیتے ہیں، اور انہیں غلط روش سے تعبیر کرتے ہیں، اس قاعدہ کو قرآن مجید نے اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا ہے: "**والذين هم لفروجهم حافظون إلا على أزواجهم أو ما ملكت أيمانهم فإنهم غير ملومين فمن ابتغى وراء ذلك فأولئك هم العادون**" (اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے اور باندیوں کے، کہ ان پر شرمگاہوں کو محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں، البتہ جو ان کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں)۔

صرف رشتۂ ازدواج ہی مردوزن کو جمع کرتا ہے، اس کے علاوہ کسی اور طریقہ پر ان دونوں صنفوں کے درمیان جنسی تعلقات کا قیام اللہ کی نافرمانی اور اس کے احکام کی بجا آوری نہ کرنا ہے، اس مسئلہ میں شریعت موسوی، شریعت عیسوی اور شریعت محمدی میں کوئی اختلاف نہیں ہے، پوری دنیا میں پھیلی بے حیائی کو کسی بھی دین کا سچا پیرو کار قبول نہیں کرسکتا ہے۔

پوری دنیا کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کرنے والے بے حیائی کے سیلاب سے عیسائیت کے مذہبی پیشواؤں نے آنکھیں موندر کھی ہیں، بلکہ ان میں سے بعض لوگوں نے تو زنا کو صحیح قرار دینے والے قوانین کی قانون سازی میں حصہ بھی لیا ہے، اور ان لوگوں کی جانب سے ایسی حرکت کوئی جائے حیرت نہیں ہے، جن کو متعدد بحرانوں نے عقیدہ وایمان کی بہت سی بنیادوں سے بھی محروم کردیا ہے۔

مردوزن کو جمع کرنے کا ایک تنہا صحیح طریقہ خاندان ہی ہے، اسی لئے خاندان کو وجود میں لانا دین کا، اور اس کی حفاظت ایمان کا تقاضہ ہے، نیز اس کے لئے خطرہ بن رہے حالات کا

مقابلہ جہاد اور اس کے نتائج یعنی بیٹوں اور بیٹیوں کی ہمدردی خدائی حکم ہے۔

عصر حاضر کے بے حیاؤں اور بے دینوں نے زنا اور لواطت کو اختیار کرکے انہیں خاندان کا بدل بنایا ہے، غلط قانون بلا اکراہ ان حرکتوں کو صحیح قرار دیتا ہے، پھر رقص وسرور کی مجلسوں اور بے حیائی کو فروغ دینے والی دیگر چیزوں کی بھی یہ قانون اجازت دیتا ہے۔

کیسا مقام حیرت ہے کہ ''ایڈز'' کے خلاف چلائی جارہی مہم کا مقصد بدکرداروں کو اس موذی مرض سے بچانا ہے۔

یہ مقصد نہایت گھٹیا اور اس کی راہ میں کی جانے والی کاوشیں نہایت نامبارک ہیں، کسی بدکردار کو ایڈز سے بچانے والا ایسا شخص جو اس کو اس کے گناہ کی اجازت دے اس سے کم بدراہ نہیں ہے۔

اس میدان کے تمام ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس مرض سے حفاظت کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اس کے اہم ترین سبب سے بچا جائے، حرام کاری سے اجتناب کرتے ہوئے صرف حلال تک محدود رہا جائے، اس کے باوجود خادمانِ دین، ماہرین تربیت اور میڈیا کے لوگوں میں سے کوئی بھی پاکدامنی کی اہمیت پر زور نہیں دیتا ہے، اور اس کے نتیجے میں ملنے والی عافیت کا تذکرہ نہیں کرتا ہے۔

کاش ہر ملک میں خاندان کو وجود میں لانے اور پھر اس کی حفاظت کے لئے ایک باقاعدہ وزارت ہوتی، انگلینڈ کے ایک حکومتی عہدہ دار کا سرکاری بیان میں نے خود پڑھا تھا، اس میں تحریر کیا گیا تھا کہ حکومت ایڈز کے خلاف مہم، اس کے شکار افراد کی تعیین اور دیگر لوگوں کو اس سے بچانے کے لئے اربوں پاؤنڈ خرچ کرے گی، یہ بجٹ صرف ایک سال کا تھا۔

اس کو پڑھ کر میں نے کہا: حرام کام کس قدر مہنگا ہے، اس کے خرچ کتنے زیادہ ہیں، اور حلال کس قدر کم خرچ ہے، صحیح طریقہ کی پابندی کی جائے تو ان تمام اخراجات کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی، اس کے باوجود بہت سے لوگ اس کو لائق التفات نہیں سمجھتے ہیں۔

اہل خانہ پر خرچ کرنے کا ثواب

سربراہ خانہ کے ذریعہ اپنے اہل خانہ کا خرچ اٹھانا نہایت کارثواب ہے، اسلام نے اس کے لئے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے اسے دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔

جہاد فی سبیل اللہ، غلاموں کو آزاد کرانا، مسکینوں کی مدد کرنا اور اپنے اہل خانہ کی ضرورتیں پوری کرنا......ان میں سے کس مصرف میں اپنا مال خرچ کرنا سب سے بہتر ہے؟ آیئے اس سلسلہ کی چند حدیثوں کو پڑھتے ہیں:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ: ''وہ دینار جو تم اللہ کے راستے میں خرچ کرو، وہ دینار جو تم ایک غلام کو آزاد کرانے کے لئے خرچ کرو، وہ دینار جو تم کسی مسکین کو صدقہ کرو اور وہ دینار جو تم اپنے اہل خانہ پر خرچ کرو......ان میں سب سے زیادہ باعث ثواب وہ دینار ہے جو تم اپنے اہل خانہ پر خرچ کرو''۔

رسول اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''انسان کے مال کا بہترین مصرف اس کے اہل وعیال، جہاد میں استعمال ہونے والا گھوڑا اور مجاہدین کی مدد ہے''۔ راوی کہتے ہیں کہ بہترین مصارف کی اس فہرست کا آغاز آپ نے اہل وعیال سے کیا۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم جو مال بھی اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرو گے اس کا اجر تمہیں ملے گا یہاں تک کہ اس لقمہ کا بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں رکھو''۔

حضرت ابومسعود بدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انسان

جب اپنے اہل خانہ پر اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرتا ہے تو یہ کارِثواب ہوتا ہے۔

حضرت مقدام بن معدی کربؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اپنے آپ کو کھلانا کارِثواب ہے، اپنی اولاد کو کھلانا کارِثواب ہے، اپنی اہلیہ کو کھلانا کارِثواب ہے، اپنے خادم کو کھلانا کارِثواب ہے۔ اس مضمون کی بہت سی روایتیں آنحضرت ﷺ سے مروی ہیں، ہم انہی چند پر اکتفا کرتے ہیں۔

ان تمام احادیث کا کیا مطلب ہے؟ میرے ذہن میں ان روایات کو پڑھ کر یہ سوال اٹھا کہ گھر میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے وہ تو ہم خود استعمال کرتے ہیں، گھر پر خرچ کئے گئے تمام مال کا فائدہ تو ہمیں ہی ملتا ہے، تو کیا اہل خانہ پر خرچ کیا گیا یہ مال ہمارے لئے ذخیرۂ آخرت اور جہاد اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے خرچ کئے گئے مال سے بڑھ کر کارِثواب ہوگا؟

اس سوال کا جواب خود میں نے یہ دیا کہ: غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ مسلم گھرانہ ہی عقائد وحسنات کا سرچشمہ ہوتا ہے؟ اولاد اور والدین کے لئے سرچشمۂ حیات کی حیثیت رکھنے والا گھر یقیناً مبارک ہے، اور اس پر کچھ کرنا مبارک ترین تجارت ہے۔

مسلمانوں کے یہاں ان سماجی حقائق کا پاس ماضی سے چلا آرہا ہے، ان کے یہاں انسان کے اچھے ہونے کی یہ ایک نشانی ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کی ہر طرح کی ذمہ داری اٹھائے، یہاں تک کہ چھوٹا بڑا ہو کر بڑے سے مستغنی ہو جائے، اس کو کم محنت اور وقت والی عبادت سمجھا جاتا ہے، یہ بیک وقت کارِ دنیا بھی ہے اور کارِ آخرت بھی۔

اس موقعہ پر جدید تہذیب سے صرف نظر کر لیجئے جس کے پروردہ گھرانوں میں باپ بیٹوں کے بالغ ہوتے ہی ان سے کہہ دیتا ہے کہ اپنے رزق کا انتظام خود کرو، بلکہ بسا اوقات مرد اپنی بیوی کے اخراجات سے بھی گرانی محسوس کرتا ہے۔

خاندان میں باہمی محبت ومودت اور وفا شعاری کے عناصر اسے ایک ایسی نہایت مستحکم

وحدت (Unit) بنا دیتے ہیں جس کے ہر فرد پر اللہ تعالیٰ مہربان ہوتا ہے، ہماری امت کا یہی حال تھا اور ایسا ہی رہنا بھی چاہئے۔

خاندان کے ذمہ دار و نگہبان کا حق ہے کہ وہ اس کی بیوی، اس کی محنت اور کاوشوں کی قدردانی کرے، اور جب وہ دن بھر کا تھکا ماندا گھر واپس آئے تو بیوی کی آغوش میں سکون پائے، اور بیوی کی زبان و روش اس کے لئے اطمینان اور دلداری کا سامان ہو۔

اس کے برخلاف احسان ناشناسی اور ناسپاسی کا رویہ میاں بیوی کے تعلقات خراب کرنے والا رویہ ہے۔ اس کردار و رویہ کی بیوی کی بابت رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ اس بیوی کی جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جو اپنے شوہر کی ناشکری ہو اور اس سے بے نیاز بھی نہ ہو''۔

ایک عورت خدمت نبوی میں حاضر ہوئی، آپ نے اس سے دریافت فرمایا: شادی شدہ ہو؟ اس نے عرض کیا: جی! آپ نے فرمایا: تم شوہر کے ساتھ کیسا معاملہ کرتی ہو، اس نے عرض کیا جہاں تک ہوسکتا ہے اس کی خوشنودی کا سامان کرتی ہوں، اس کو آپ نے جواب دیتے ہوئے یہ مختصر اور بلیغ جملہ ارشاد فرمایا: تمہارا اس کے ساتھ کیسا معاملہ ہے؟ دیکھو وہ تمہاری جنت یا دوزخ ہے!'' ایک اور حدیث اس کی تشریح کرتی ہے، اس میں ارشاد ہوا ہے: ''کوئی عورت اس وقت تک اللہ کا حق ادا نہیں کرسکتی ہے جب تک وہ اپنے شوہر کا حق ادا نہ کرے۔''

میں نے حضرت معاذ کی روایت کردہ ایک عجیب وغریب روایت پڑھی، جس میں بعض ان خواتین کے اوصاف بیان کئے گئے تھے جو اپنے مسائل خود حل کرتی ہیں، اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ گھر میں بس ان کا ہی ارادہ چلے اور اس سلسلے میں وہ کسی چیز کو خاطر میں لانا نہیں چاہتی ہیں، میں نے اس حدیث میں ایسی عورت کے لئے کی گئی نصیحت کو غور سے سنا، اس کو سنتے وقت مجھے ہنسی آرہی تھی اور میں اسے روکنا چاہ رہا تھا۔

یہ حدیث ملاحظہ ہو: ''کسی مومن خاتون کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں کسی ایسے شخص کو بلائے جسے وہ پسند نہ کرتا ہو، اسی طرح اسے شوہر کی مرضی کے خلاف گھر سے نکلنا بھی نہیں چاہئے، شوہر کے سلسلے میں کسی کی اطاعت بھی نہیں کرنی چاہئے، اس کے بستر سے اسے علاحدگی بھی نہیں اختیار کرنی چاہئے، اور نہ ہی بیوی اسے مارے، یہ حدیث پڑھ کر میں نے سوچا کیا بیوی بھی شوہر پر ہاتھ اٹھا سکتی ہے؟ کیا مرد ایسا زنانہ ہو جائے گا؟ اور کیا ایسی عورت ممتاز فائٹر یا جاپانی کشتی کی ماہر ہوگی؟

ان خیالات سے واپس نکل کر میں نے حدیث کا اگلا حصہ پڑھنا شروع کیا، جس میں رسول اللہ ﷺ نے بیوی کو ان چیزوں سے منع فرما کر ارشاد فرمایا ہے: ''اگر شوہر ظالم ہو تو بھی کوشش کر کے اسے راضی کر لینا چاہئے، اگر وہ اس سے خوش و راضی رہنے لگے تو پھر تو کیا کہنا؟ ایسی صورت میں اللہ بیوی کا عذر قبول کرے گا، اس کے موقف کو بہتر قرار دے گا اور وہ گناہ گار بھی نہ ہوگی، اور اگر شوہر بیوی کی کوششوں کے بعد بھی راضی نہ ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس (بیوی) نے اللہ کے حضور اپنا عذر قبول کروا لیا ہے۔

ہر گھر کو مسائل کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے، البتہ اچھے اخلاق مسائل کو یقینی طور پر حل کر دیتے ہیں، شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

لعمرک ما ضاقت بلاد بأهلها ولكن أخلاق الرجال تضيق

(تمہاری قسم کوئی علاقہ اپنے باشندگان کے لئے تنگ دل واقع نہیں ہوتا ہے، بلکہ لوگوں کے اخلاق ہی تنگ دامن ہوتے ہیں۔)

عورتوں کے اخلاق بھی بسا اوقات ایسے ہی ثابت ہوتے ہیں، ازدواجی زندگی میں خراب تعلقات کا برا اثر اولاد پر بھی پڑتا ہے، اور ان کے لئے نہایت خراب نتائج کا سبب بنتا ہے۔

اس کے برخلاف زوجین یا والدین کے درمیان باہمی محبت واحترام کا تعلق نہایت اچھے اثرات کا حامل ہوتا ہے، اور اولاد پر بھی اس کے نیک اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور یہ گھر کے داخلی وخارجی مصالح کے لئے بہت خوش آئند ثابت ہوتا ہے۔

اس حوالہ سے ایک حدیث نبوی کا تذکرہ بہت کیا جاتا ہے، یہ حدیث تشریح کی محتاج ہے:

حضرت معاذ بن جبل شام سے واپس آئے تو خدمت نبوی میں حاضر ہوئے، اور آتے ہی آپ کو سجدہ کیا، آپ نے فرمایا: ارے یہ کیا؟ حضرت معاذ نے عرض کیا: میں شام گیا تھا، وہاں دیکھا کہ وہ لوگ اپنے پیشواؤں کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے چاہا کہ میں آپ کو کروں۔

خود ہم نے بھی بعض لوگوں کو فرشی سلام کرتے دیکھا ہے، جس میں وہ رکوع کی طرح جھک جاتے ہیں، ابھی تک جاپانی شاہ کے لئے یہ سلام کیا جاتا ہے، حبشہ کے بادشاہ کے یہاں بھی اس کا رواج تھا، بعض مقامات پر اس کے لئے مکمل سجدہ بھی کیا جاتا ہے۔

عرب بڑوں کی تعظیم کے اس طریقہ سے نابلد تھے، حضرت معاذ نے یہ طریقہ مدینہ میں اپنایا تو آپ نے مکمل طریقہ پر اسے مسترد کر دیا، بعض روایات کے مطابق آپ نے فرمایا: ''ایسا نہ کرو، اگر میں کسی کو سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو دیتا کہ شوہر کو سجدہ کرے''۔

اس کا تتمہ خود بخود یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ: لیکن میں کسی کو بھی سجدہ کا حکم یا اجازت نہیں دے رہا، بیوی کو بھی شوہر کے لئے نہیں، اس کا مطلب جیسا کہ حدیث کے اگلے لفاظ میں وارد ہوا ہے یہ ہے: ''......بخدا عورت اپنے رب کا حق شوہر کا حق ادا کئے بغیر ادا نہیں کر سکتی''۔

شوہر اور بیوی یکساں حقوق وواجبات کے حامل ہیں، اچھے اخلاق ومعاملہ کے ساتھ مرد لائق اطاعت وسربراہ خانہ بن جاتا ہے، لیکن اس سلسلے میں وفاء، اخلاص اور محبت ہی اس کے ذرائع ہوتے ہیں۔

خاتون کی ذمہ داری کو حقیر نہ سمجھئے!

کیا چائلڈ ہومس (Child Homes) نے گھر، مامتا اور خانوادہ کا بدل بن سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! ہم ان چائلڈ ہومس کو آخری درجہ کی مجبوری ہی میں قبول کر سکتے ہیں، اور وہ بھی بس مجبوری کی چند صورتوں میں، ان چند صورتوں کے علاوہ بچوں کو فطری آغوش و ماحول میں ہی تربیت پانی چاہئے۔

اسلام نے مرد پر گھر کے اخراجات کی ذمہ داری ڈال کر عورت کو شوہر کے حقوق کی ادائیگی، اولاد کی تربیت اور اپنی فطری ذمہ داریوں پر مکمل توجہ دینے کے لئے یکسو کر دیا ہے۔

خاتون خانہ کی ذمہ داریوں کو حقیر سمجھنے والے لوگ اس منصب کی اہمیت اور قوموں کے اخلاقی وسماجی حال و مستقبل کی تعمیر میں اس کے بہت دور گامی اثرات سے ناواقف ہیں۔

گھر کے اندر کی ان ذمہ داریوں کا بوجھ مرد کی پر مشقت ذمہ داریوں جیسا ہی ہے، شریعت نے دونوں صنفوں کو ان کے لئے مناسب اور ان کی صلاحیتوں کے مطابق ذمہ داریاں دی ہیں۔

چند مخصوص خواتین کو حاصل ہونے والی بعض صلاحیتوں سے عورتوں کے اس اختصاص پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

غزوۂ خندق کے موقع پر جس قلعہ میں خواتین کو حفاظت کی غرض سے رکھا گیا تھا، وہاں ایک یہودی دشمنوں کو پتہ بتا رہا تھا، یہ حرکت حضرت صفیہؓ نے دیکھی تو وہ قلعہ سے نیچے اتر کر آئیں اور اسے قتل کر دیا، کیا ہم اس جیسے مواقع کے لئے تمام عورتوں کو فوجی تربیت دیں گے، نہیں ہرگز نہیں! ڈاکٹرں کا کہنا ہے کہ: دونوں صنفوں کا زندگی میں الگ الگ میدانِ کار رہے، ہاں کچھ افراد

دوسری صنف کے میدان کار میں بھی تھوڑا بہت دخل رکھتے ہیں۔

اس میں کیا شک ہے کہ عورت کی نفسیات اور اس کے جسم کو اللہ نے مرد کی نفسیات اور جسم سے جداگانہ رکھا ہے، عورت کے جسم کی ساخت ماںتا کی ذمہ داری سے ہم آہنگ رکھی گئی ہے، اسی طرح اس کو نفسیاتی طور پر ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ گھر کی ذمہ دار ہو، الحاصل یہ کہ عورت کے بہت سے ظاہری و پوشیدہ اعضاء، اس کے اعصاب اور اس کی ہڈیاں، نیز اس کے اعضاء کی صلاحتیں مردوں سے مختلف ہیں۔

یہ ظاہری و باطنی فرق کچھ بلا سبب نہیں ہیں، اس لئے کہ جسم انسانی بلکہ پوری کائنات میں کوئی چیز بھی بلا حکمت نہیں ہے، مرد کی ساخت ایسی رکھی گئی ہے کہ وہ گھر کے باہر کے کاموں کی مشقتیں اٹھا سکے، جب کہ عورت کو حمل وولادت، بچوں کی تربیت اور شوہر کے لئے راحت وسکون فراہم کرنے کی عظیم ذمہ داری دی گئی ہے۔

شیخ عباس محمود العقاد لکھتے ہیں: ''فطری بات ہے کہ عورت کی نفسیاتی ساخت مرد سے جداگانہ ہو، اس لئے کہ نومولود بچے کی ذمہ داریاں صرف رضاعت تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ نومولود بچے کی ہمہ وقتی خدمت کرنی ہوتی ہے، بس کے لئے دونوں کے مزاجوں، فہم، احساسات اور جذبات میں ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے، اور عورت کی زندگی کے تمام مراحل میں (بچپن سے لے کر بڑھاپے تک) یہ ہم آہنگی واضح طور پر نظر آتی ہے، عورت رضامندی، غضب ناکی، نخرے دکھانے، ناراضگی، اور سامنے والے سے (خواہ وہ ہم عمر ہو یا اولاد کی عمر کا) محبت کی خواہش میں بالکل بچوں جیسی ہوتی ہے، یہ اخلاق عورت کے لئے اختیاری نہیں ہیں، بلکہ اس کی فطرت میں پیوست ہیں، چونکہ رضاعت کے ساتھ بچوں کی پرورش بھی اسے کرنی ہوتی ہے، اس لئے جسمانی اعضاء کے ساتھ ساتھ نفسیاتی خصوصیات کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

بچوں کی پرورش اور ان کی دیکھ بھال کے لئے جو اخلاق لازمی ہونے کی حیثیت رکھتے

ہیں وہ صنف نازک کی اس نرمی کا لازمی نتیجہ ہیں جو اسے زیادہ جذباتی بنا دیتی ہے، اور جس کے نتیجہ میں عورت کے لئے عقل ورائے کو غالب رکھنے اور ارادہ کی پختگی جیسے وہ امور مشکل ہو جاتے ہیں جو ایک مرد کے لئے آسان ہوتے ہیں۔

لہذا یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ یہ دونوں صنفیں مزاجی اعتبار سے بالکل مختلف ہیں، اور ان خصوصیات میں دونوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس مسئلہ سے متعلق ہم ڈاکٹروں کی رائے پھر نقل کر رہے ہیں، عالمی ادارۂ صحت کے نشریہ میں شائع رپورٹ کے مطابق ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ: عورت کا سب سے اہم میدانِ کار ما ممتا و تربیت اولاد کا میدان ہے، اس میں کردار ادا کر کے عورت معاشرہ کی ترقی و تعمیر میں نہایت سرگرم حصہ لیتی ہے، اور وہ اس میدان میں جس قدر یکسو ہوتی ہے قوم پر اس کے اتنے ہی اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

عورت کا یہ کردار اس کو دیگر مادہ مخلوقات سے زیادہ مشقتوں کا مکلّف کرتا ہے، اس لئے کہ دیگر مؤنث مخلوقات کا نظامِ حمل وولادت سال کے ایک مخصوص ومحدود دورانیہ میں ہی پایا جاتا ہے، اس کے برخلاف عورت کو سن بلوغ سے لے سن ایاس تک مسلسل اس نظام کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کبھی حیض، کبھی حمل، کبھی نفاس اور کبھی رضاعت، اور ان تمام مراحل میں اسے کچھ مشقتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حیض کا سامنا ہر (غیر حاملہ) عورت کو کرنا پڑتا ہے، اور اس کے دوران اسے متعدد پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جنہیں اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

۱- اکثر عورتوں کو اس کے دوران کمر اور پیٹ کے نچلے حصہ میں درد رہتا ہے، بسا اوقات یہ درد اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

۲- اس مدت میں بالخصوص اس کے آغاز میں بہت سی عورتوں کو الجھن رہتی ہے، اس

درمیان عورت چڑ چڑی اور بدمزاج ہوجاتی ہے۔

۳-بعض عورتوں کو حیض شروع ہونے سے پہلے مائیگرین (Migraine، سر کا ایک مخصوص درد) ہوتا ہے جس میں زبردست تکلیف ہوتی ہے، ساتھ میں متلی بھی ہوتی ہے، اور بسا اوقات اس درد کی وجہ سے نگاہ بھی کمزور ہوجاتی ہے۔

۴-خون کی کمی، ایک مرتبہ کے حیض میں عورت کا ۶۰ ملی لیٹر سے لے کر ۲۴۰ ملی لیٹر خون نکل جاتا ہے۔

۵-حیض کے دنوں میں Endocrine Gland (جسم کے وہ غدود جو خون میں متعدد ہارمونس اور دیگر چیزیں ملاتے ہیں) بھی متأثر ہوجاتے ہیں اور نہایت کم کام کرتے ہیں۔

۶-مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر جسم کی حرارت کم ہوجاتی ہے، نبض دھیمی ہوجاتی ہے، بلڈ پریشر کم ہوجاتا ہے، اور بہت سی عورتوں کو کمزوری محسوس ہوتی ہے۔

عورت کو درپیش ان حالات کا خیال رکھتے ہوئے شریعت نے بعض عبادات میں اسے رخصتیں دی ہیں، مثلاً حیض کے ایام میں اس کے لئے روزے معاف ہیں، وہ روزہ بھی ان ایام میں نہیں رکھے گی، بلکہ دیگر ایام میں روزوں کی قضاء کرے گی۔

جب ان حالات میں رب العالمین عورتوں کو بعض ذمہ داریوں سے سبکدوش کردیتا ہے، تو پھر اس کا خود کو یا معاشرہ کا اسے ایسے کاموں کا پابند بنانا کیسے صحیح ہے جس کی اس میں استطاعت نہیں ہے؟

شوہر سے محروم

تربیت اولاد زوجین کی مشترکہ ذمہ داری ہے، یہ نہایت اچھی روایت ہے کہ اولاد والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے، ماں کی مامتا اور باپ کی نگرانی دونوں انہیں حاصل ہوں۔

لیکن حالات ہمیشہ سازگار نہیں رہتے، یہ زندگی تو اچھے حالات اور برے حالات کے امتزاج سے ہی عبارت ہے، بسا اوقات اولاد مشفق و بارِ کفالت کے امین باپ سے محروم ہو جاتی ہے، یعنی ماں بیوہ اور اولاد یتیم ہو جاتی ہے، ایسے حالات میں ماں کا بچوں کے لئے یکسو ہو جانا اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے، امام ابوداود نے حضرت عوف بن مالک کی روایت سے رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ: ''وہ کمزور حال عورت قیامت کے روز مجھ سے بہت قریب ہوگی جو بیوہ ہوگئی ہو، نہایت خوبصورت اور اچھے مقام کی ہو، اور وہ اپنے آپ کو اپنے یتیم بچوں کی کفالت کے لئے اس وقت تک یکسو رکھے جب تک کہ وہ بڑے نہ ہو جائیں یا ان کا انتقال نہ ہو جائے''۔

یعنی وہ خوبصورت عورت جس نے اولاد کے لئے یکسوئی کی وجہ سے زینت چھوڑ رکھی ہو، اور اس کی وجہ سے اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی ہو وہ نہایت بلند مقام ہے، لیکن اس موقع پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اس قربانی کا مطالبہ تمام عورتوں سے ہے؟ میرے نزدیک اس سلسلہ میں متعدد امور کا بیوہ کے فیصلہ اور یتیموں کے مستقبل کی تعیین میں خیال رکھا جائے گا، مثلاً بیوہ کی عمر، اس کی مالی حالت، اولاد کی عمر، اس سے شادی کے خواہش مند کی دینی و اخلاقی حالت، ہوسکتا ہے کہ اس سے شادی کا کوئی ایسا رشتہ دار یا نیک شخص خواہش مند ہو جو اولاد کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

اس لئے ہم بیوہ خاتون کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے بچوں کے اچھے مستقبل

کے لئے جو صحیح سمجھے وہ فیصلہ کرے۔

حضرت جعفر طیار جنگ موتہ میں شہید ہوئے تو ان کی عمر محض تیس برس تھی، ان کے پسماندگان میں ایک بیوہ اور کئی چھوٹے چھوٹے بچے تھے، کچھ ہی دنوں کے بعد ان کی بیوہ نے حضرت ابوبکرؓ سے شادی کر لی، اور یہ فیصلہ انہوں نے اچھا ہی کیا، اللہ نے اس طرح ان کے بچوں کی بہترین نگہبانی کی۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت عاتکہ بنت زید نہایت خوبصورت و باصلاحیت خاتون تھیں، ان کے شوہر حضرت عبداللہ بن ابی بکر شہید ہوئے تو حضرت عمر نے ان سے شادی کر لی، پھر وہ شہید ہوئے تو حضرت زبیر بن عوام نے ان سے شادی کر لی، پھر جب فتنۂ کبری میں وادی السباع میں وہ بھی شہید ہو گئے تو حضرت حسین بن علی نے ان سے شادی کر لی، پھر جب کربلاء کے میدان میں حضرت حسین کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا تو وہ پہلی شخص تھیں جنہوں نے ان کا چہرہ زمین پر سے اٹھایا تھا، لیکن پھر وہ بے شوہر کے ہی رہیں، اور کوئی اور ان سے شادی نہ کر سکا۔

حضرت عبداللہ بن عمر از راہ مذاق کہا کرتے تھے کہ جسے شہادت کی تمنا ہو وہ عاتکہ سے شادی کر لے۔

ان کے تمام شوہر شہید کر دئے گئے، یہ سب تقدیر کے فیصلے تھے، ادب کی کتابوں میں ان کے وہ اشعار محفوظ ہیں جو انہوں نے اپنے پہلے شوہر عبداللہ بن ابی بکر کے مرثیے میں کہے تھے:

آليت لا تنفك عيني حزينة   عليك ولا ينفك جلدي أغبرا
فللّه عينا من رأى مثله فتى   أكر وأحمى في الهياج وأصبرا
إذا أشرعت فيه الأسنة خاضها   إلى الموت حتى يترك الموت أحمرا

(میں نے قسم کھائی ہے کہ تمہارے غم میں میری آنکھیں ہمیشہ اشکبار رہیں گی، اور میں کبھی بھی غسل نہیں کروں گی، اس جیسا میدان جنگ کا ماہر آنکھوں نے بہت ہی کم دیکھا ہوگا، جب جنگ زوروں پر چھڑ جاتی اور نیزے لہرانے لگتے تو وہ زبردست خونریزی کرتا ہوا میدان جنگ میں گھس جاتا تھا)۔

وفاداری کی یہ حد محترم ہے، لیکن ایسے جذبات بس مختصر وقت تک ہی قائم رہتے ہیں، پھر وقت ہر زخم پر مرحم لگا دیتا ہے، اور اسلام مردوں اور عورتوں کے فطری تقاضوں کے آڑے نہیں آتا ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگ دین کو اپنے معاشرہ کی اقدار وروایات کا پابند کرنا چاہتے ہیں، خواہ یہ اقدار وروایات سلف صالحین کے نظریات اور فطرت سلیمہ کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔

آبرو کا تقدس

پچھلے آسمانی مذاہب کے پیرووں کی بری عادتیں افسوس کہ اب مسلمانوں کے یہاں بھی در آئی ہیں، جن کے نتیجہ میں پاکیزہ مسلم معاشرہ آلودہ ہوگیا ہے، ان میں سے کچھ مرد وزن کے باہمی تعلقات کی بابت ہیں تو کچھ کا تعلق خود عورت کے کردار اور بے حیائی کی جانب اس کے میلان سے ہے۔

بے حیائی زیب وزینت سے الگ ایک چیز ہے، زیب وزینت میں جسم کی حفاظت کی جاتی ہے، اس کی فطری خوبیوں کو باقی رکھا جاتا ہے اور اس کو معنوی یا مادی نقصان پہنچانے والی چیزوں سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے، یہ کوئی غلط بات نہیں ہے، بلکہ مطلوب ہے۔

جب کہ بے حیائی سے مراد دوسروں کی جنسی خواہشات بھڑکانا اور ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنا ہے، اور یہ بات بالکل ناقابل قبول ہے، اور اس کی قباحت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب وہ اس بے حیائی کے ساتھ مسجد آتی ہے اور عبادت کے ماحول کو خراب اور اس کی پاکیزگی کو آلودہ کرتی ہے، مسجد فتنہ انگیزی یا مقابلۂ حسن کا میدان نہیں ہے، ایسی بے حیا خاتون کو مسجد سے نکال کر گھر میں قید کردینا چاہئے۔

بنی اسرائیل کی خواتین ماضی میں اس گناہ کی مرتکب تھیں، پھر اسلام نے اس سے خبردار کیا، اور اس بات کا نہایت تاکیدی حکم دیا کہ خواتین باحیا و باپردہ مسجد آئیں۔

اسلام چاہتا ہے کہ مرد وزن کے درمیان کے تعلقات بازاروں، مسجدوں، گھروں اور سڑکوں پر پاکیزہ ہوں، نیتیں صحیح ہوں، ملاقاتیں پاکیزہ ہوں، آپسی معاملات جنسی شہوتوں سے محفوظ ہوں، ایسی شہوتوں کو صرف ازدواجی زندگی میں ہی جائے پناہ ملے۔

بعض مرد نگاہوں کے غیر محتاط ہوتے ہیں، وہ دوسروں کے گھروں میں جھانکتے پھرتے ہیں، اوراس سے ان کے اندر مزید بگاڑ آتا چلا جاتا ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وكنت إذا أرسلت طرفك رائدا   لقلبك يوما أتعبتك المناظر

رأيت الذي لا كله أنت قادر   عليه ولا عن بعضه أنت صابر

(اگرتم اپنی نگاہوں کو اپنے دل [اپنی جنسی خواہشات] کا نمائندہ بناؤ گے تو مناظر تمہیں پریشان کر دیں گے، اس لئے کہ تمہاری نظر ایسی بہت سی چیزوں پر پڑے گی جن کے بنا تمہیں قرار نہ آئے گا، اوران پر تمہارا زور بھی نہ چلے گا)

پاک نگاہی نہایت اچھے کردار کی علامت ہے، اور رذائل میں مبتلا ہونے سے بچاتی ہے، پورے معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ احکام خداوندی کا پاس رکھے، شادیوں کو آسان بنائے، کہ اس کے نتیجہ میں گھر محفوظ رہیں گے، نئے خاندانوں کی حفاظت ہوگی، اور انہیں تمام اسباب ترقی فراہم ہوں گے۔

عرب بیوی کو ''حرم'' کہتے ہیں، یہ لفظ بتاتا ہے کہ آبرو مقدس ہے، اس کی حفاظت واجب ہے، اوراس کی خاطر جان کی نذریں پیش کی جاسکتی ہیں۔

لیکن ''حریم'' کا لفظ ایک اور معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ایک جاہ ومنصب والے شخص کے پاس عورتوں کی چھوٹی بڑی تعداد ہو، اور وہ ان کی آغوش میں بھرپور شہوانی زندگی گزارے، اوراگر کوئی اس ''حریم'' پر اثر انداز ہونا چاہے تو اس کی آفت آجاتی ہے، اور بسا اوقات اسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

اس طرز زندگی کے کچھ نمونے ہمیں الف لیلہ کے قصوں نیز بعض گزشتہ بادشاہوں کے بارے میں تاریخ میں ملتے ہیں، ان بادشاہوں کے محل عورتوں سے بھرے ہوتے تھے۔

میرے نزدیک بنی اسرائیل سب سے پہلے اس انسانی یا آپ کہنا چاہیں تو کہہ لیں حیوانی

ڈرامے کووجود میں لائے تھے، انہوں نے عہد قدیم میں حضرت سلیمانؑ پر تہمت لگائی ہے کہ ان کے پاس تین سو بیویاں اور سات سو لونڈیاں تھیں، یعنی ان کے محلات میں ایک ہزار خواتین تھیں، انسان اس پورے لشکر کا کیا کرے گا؟ اور ان سب سے کیسے لطف اندوز ہو سکے گا؟

بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ وہ نبی نہیں بادشاہ تھے، اگر بالفرض یہ غلط بات مان بھی لی جائے کہ وہ بادشاہ تھے تو بھی ذرا بتایئے کہ ماضی قریب وبعید کا کون سا بادشاہ ایک ہزار خواتین سے صحبت قائم کرنے کی طاقت رکھتا ہے، جنسی شہوت کا عروج تھوڑی دیر ہی قائم رہتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے روزہ دار بھوک کی شدت کے وقت یہ سمجھتا ہے کہ وہ بہت سی چیزیں کھا جائے گا، لیکن افطار کے کچھ ہی دیر بعد اس کی خواہش ختم ہو جاتی ہے، اور وہ کھا نہیں پاتا ہے۔ بادشاہوں کی تاریخ میں مذکور اس جیسے قصے خود ساختہ ہیں، اور بدکردار جھوٹوں کے گڑھے ہوئے ہیں۔

اس موقعہ پر ہم ''لونڈی'' کہی جانے والی خواتین کے بارے میں حقیقت حال واضح کرنا چاہتے ہیں، عام طور پر یہ اغوا کی گئیں آزاد خواتین ہوتی تھیں۔

تاریخ انسانی میں ایک ایسا طویل سیاہ عرصہ گزرا ہے جس میں مسلح لشکر شہروں اور بستیوں پر حملہ کر کے وہاں کی کمزور خواتین کو اپنے ساتھ بھگا لے جاتے تھے، اور پھر انہیں بیچ دیتے تھے، یا ان سے خود لطف اندوز ہوتے تھے، زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے یہاں بھی ایسا ہوتا تھا، اور بسا اوقات ایسے ڈاکوؤں کے شکنجے میں نہایت شریف وکریم خواتین بھی ہوتی تھیں۔

عروہ بن ورد (مشہور بہادر وسخی خانہ بدوش) نے قبیلۂ غفار پر حملہ کیا، اور سلمیٰ نامی ایک لڑکی کو پکڑ لے گیا، پھر اس سے شادی کی، اور اس کے یہاں بچے بھی ہوئے، یہ عورت احساس ذلت کے ساتھ زندگی گزارتی رہی، ایک دن موقع پا کر وہ اپنے قبیلہ بھاگ گئی، اور اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنے لگی۔

اس کے پاس عروہ آیا، وہ اس سے نہایت محبت اور اکرام کا تعلق رکھتا تھا، اس نے چاہا

کہ سلمٰی اپنی اولاد کی خاطر واپس چلی چلے، اس کی اس خواہش پر سلمٰی کا جواب پڑھیئے، دیکھئے عزت نفس کا کیسا آئینہ دار ہے: ''اے عروہ! اگرچہ میں تمہیں چھوڑ آئی ہوں، لیکن میں تمہارے بارے میں یہ گواہی دیتی ہوں کہ بخدا میرے علم میں کسی عرب خاتون کو تم سے اچھا خاوند نہیں ملا ہے، جو تم سے زیادہ پاک نگاہ، پاک کردار، سخی اور حقیقت پسند ہو۔

لیکن پھر بھی میں جتنے دن تمہارے پاس رہی مجھے زندگی سے زیادہ موت عزیز رہی، اس لئے کہ مستقل تمہارے قبیلہ کی خواتین مجھے ''عروہ کی لونڈی'' کہتی تھیں۔

آج کے بعد بخدا میں ان میں سے کسی کا چہرہ بھی نہیں دیکھوں گی، جاؤ اپنی اولاد کا خیال رکھنا''۔

اگر یہ ''لونڈی'' ہے تو پھر شریف زادیاں کیسی ہوتی ہیں؟ لیکن گردش زمانہ نے نہ جانے کتنے شریف زادوں کو غلام اور کتنی شریف زادیوں کو لونڈی بنا کر رکھ دیا، تو وہ بازار میں بکیں، اور ''حریم'' میں رہیں، جہاں ان جیسی دسیوں یا سیکڑوں کے ساتھ کوئی بدکردار اور شہوت کا مارا مرد رنگ رلیاں مناتا پھرتا ہے۔

عصر حاضر میں بے جا شہوت رسانی کا ایک اور طریقہ وجود میں آیا ہے، آج کوئی بدمست شہوت پرست اگر چاہے تو ایک ہزار خواتین سے جنسی تعلق قائم کرسکتا ہے، یہ ایک ہزار خواتین ماضی کے بادشاہوں کی طرح ایک جگہ محفوظ نہیں کردی جاتی ہیں، بلکہ وہ جسم فروشی کے اڈوں، شاہراہوں، رقص وسرور کی مجلسوں اور بے حیا محفلوں میں جا بجا ان سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

پہلے جو چیز صرف بادشاہوں کو حاصل ہوتی تھی وہ اب معمولی یا غیر معمولی دام میں ہر انسان کو حاصل ہے، اور افسوس کہ انسانیت اسی گڑھے میں گرتی جارہی ہے۔

مردوں اور عورتوں کے درمیان تعلقات کی مناسب ترین صورت وہ شادی ہے جو جسمانی آسودگی کے ساتھ ساتھ باطنی سکون کا بھی باعث ہوتی ہے۔ اور جو جذبات کے ساتھ

ساتھ عقل کا بھی خیال رکھتی ہے۔

پھر اس کے نتیجے میں اگلی نسلوں کو پاکیزہ پس منظر ملتا ہے۔

اسلام نے خاندان پر بہت توجہ دی ہے، اور اس کے مفادات کے تحفظ میں متعدد احکام دیے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ان احکام کو غلط طریقہ سے سمجھا گیا اور ان کو غلط طریقہ سے برتا گیا، میں اس سلسلے میں یورپیوں کے تعدد ازدواج کی بابت نظریہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہوں کہ وہ خود تو لامحدود تعداد میں عورتوں سے حرام تعلق رکھتے ہیں، اور پھر ان مذاہب پر تنقید کرتے ہیں، جو مخصوص حالات اور اسباب کے پیش نظر تعدد کو جائز قرار دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اگر مسلمان اپنے دین پر اچھی طرح عمل کرنے لگیں، تو انسانی تعلقات کا ایک عجیب وغریب نمونہ سامنے آئے گا، دیگر لوگ اس کو پسند کریں گے اور اس کو اختیار کرنا چاہیں گے۔

گھروں کی بنیاد محبت پر ہوتی ہے

کسی بھی مسلم گھرانے کو اس قابل بنانے کے لئے کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کر سکے اس کے اندر تین صفات کا پایا جانا ضروری ہے: سکون، الفت اور باہمی ہمدردی کا جذبہ۔

سکون کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی شوہر کے لئے ایسی آنکھ کی ٹھنڈک ہو کہ شوہر اس کے علاوہ کسی اور کا نہ ہو، اور شوہر بیوی کے لئے ایسا باعثِ سکون ہو کہ پھر بیوی کسی اور کو خیال میں بھی نہ لائے۔

الفت سے مراد افراد خانہ کے درمیان باہمی محبت ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان تعلقات اچھے اور خوشگوار رہتے ہیں۔

باہمی ہمدردی مردوں اور عورتوں کے اچھے اخلاق کی یکساں بنیاد ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے آخری رسول (ﷺ) کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: ''**فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظا القلب لانفضوا من حولك**'' (یہ محض اللہ کا کرم ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کے لئے نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ اگر آپ درشت رو اور سخت مزاج ہوئے تو یہ سب آپ کو چھوڑ جاتے) ہمدردی عارضی شفقت کی ایک صورت ہے، اور یہ دائمی نرم مزاجی، خوش اخلاقی وحسن کردار کا سرچشمہ ہے۔

چونکہ خاندانوں کی بنیاد سکونِ مسلسل، دائمی الفت اور جذبۂ ہمدردی پر ہوتی ہے اس لئے شادی نہایت اچھی نعمت وبابرکت نتائج کی حامل ہے۔

یہ رشتۂ ازدواج بہت سے مسائل کا حل ہے، اور اس کے نتیجے میں اچھی اولاد ہی وجود میں آتی ہے، اولاد کے مابین جو مسائل پائے جاتے ہیں ہمارے نزدیک اس کا اصل سبب عام

طور پر ماں باپ کے رشتۂ ازدواج کی کمزوری اور تعلقات کی خرابی ہوتی ہے۔

کیا یہ معنوی صفات مادی امور سے بے نیاز کردیتی ہیں؟ گھر کی کامیابی میں متعدد داخلی وخارجی عناصر کارفرما ہوتے ہیں، یہ حدیث نبوی ملاحظہ ہو: حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تین امور نیک بختی کا سبب ہیں:

۱- بیوی جسے تم دیکھو تو وہ تمہیں بھائے، اور اپنی عدم موجودگی میں اس کے جسم اور اپنے مال کے سلسلے میں تمہیں اس پر اطمینان ہو۔ ۲- سواری کے طور پر استعمال ہونے والا اچھا جانور، اور ۳- وسیع اور زیادہ سہولیات والا گھر۔

تین چیزیں بدبختی کی علامت ہیں:

۱- ایسی بیوی جو تمہیں اچھی نہ لگے، تمہیں برا بھلا کہے، اور ایسی ہو کہ اپنی عدم موجودگی میں تم اس کے جسم اور اپنے مال کے سلسلے میں اس کی جانب سے مامون نہ رہو۔ ۲- سواری کے لئے خراب جانور، ۳- تنگ وکم سہولیات کا گھر''۔

ہر انسان اپنے لئے اسباب خوش بختی کا خواہش مند اور بدبختی کے اسباب سے گریزاں ہوتا ہے، ایک حدیث میں آیا ہے: ''اپنے لیے نفع بخش چیزوں کے خواہش مند رہو، اللہ سے مدد مانگو اور کم ہمت نہ بنو''، اسباب راحت کے حامل ایسے گھر کی خواہش ہر مسلمان کا حق ہے، جس سے وہ متحرک انسان بننے کے لئے نفسیاتی طاقت حاصل کرے، اسی طرح اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ خراب تعلقات اور ان سے بھی پہلے کم سہولیات اور بدمعاشرتی کو ناپسند کرے۔

دین فطرت کے تقاضوں کو دباتا نہیں ہے، اور نہ ہی اچھے تعلقات اور راحت وآرام کی انسانی خواہشات کے آڑے آتا ہے، شادی کے خواہش مند مرد کا یہ حق ہے کہ وہ ہونے والی بیوی میں اپنی مطلوبہ صفات کا اندازہ کرے، اور ہمارے نزدیک عورت کو بھی ہونے والے شوہر کے بارے میں یہ حق حاصل ہے۔

تجربہ اگر اطلاعات کو صحیح ثابت کردے گا تو رشتہ صحیح وباقی رہے گا، بصورت دیگر اس کے مستقبل کا کچھ پتہ نہیں۔

پیغام دینے والا شخص کچھ مدت تک بعض اخلاق بتکلف اختیار کرتا ہے، مثلاً اگر وہ غصہ ور ہوتا ہے تو کچھ دن بردبار بنتا ہے، کنجوس ہوتا ہے تو کچھ دن کے لئے سخی بننا چاہتا ہے۔

لیکن کچھ دنوں کے بعد حقیقت عیاں ہوجاتی ہے، اس کے فطری اخلاق سامنے آجاتے ہیں، اور اچانک عورت کے سامنے وہ باتیں آتی ہیں جن سے اسے پہلے سابقہ نہیں پڑا تھا، ایسے موقعہ پر وہ گویا حیرت میں ایک شاعر کا یہ شعر پڑھ رہی ہوتی ہے:

کل یوم تبدی صروف اللیالی   خلقا من ابی سعید عجیبا

(ہر روز ابوسعید کی ایک عجیب اخلاقی کیفیت سامنے آتی ہے)

بعض شوہر متعین مہر پر راضی ہوکر اس کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتے ہیں، پھر جب عقد ہوجاتا ہے، اور رخصتی ہوجاتی ہے وہ اپنے وعدہ کو بھول جاتے ہیں، اسلام نے بدعہدی کو نہایت غلط بات قرار دیا ہے، ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: ''وہ شخص جو کسی عورت سے کم یا زیادہ مہر پر شادی کرتا ہے، اور اس کی نیت مہر کی ادائیگی کی نہیں ہوتی ہے، وہ اس عورت کو دھوکہ دیتا ہے، اگر وہ اسی طرح بے مہر ادا کئے مر گیا تو قیامت کے دن اللہ کے حضور میں اسے زنا کا مجرم مانا جائے گا، اور جو شخص قرض لے اور اس کی نیت ادائیگی کی نہ ہو اور وہ دھوکہ دے کر قرض لے لے، پھر بے ادائیگی کے مرجائے تو اللہ کے حضور چور کی حیثیت سے حاضر ہوگا''۔

شادی کوئی وقتی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ زندگی بھر کے ساتھ، نہایت اہم معاہدے اور زندگی کے سارے نشیب وفراز میں شرکت سے عبارت ہے، اور اسی لئے اس میں کسی مذاق یا کھیل کی گنجائش نہیں ہے، اس میں لگائی گئی شرطوں میں تبدیلی کوتاہی کی اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی

ہے۔

مہر کی ادائیگی تو محض صحیح انداز میں رشتۂ ازدواج نبھانے کی ایک علامت ہے، اور اگر کوئی شخص اپنے آپ کو بردبار یا شریف انسان بنا کر پیش کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان اپنے مصنوعی اخلاق پر جمار ہے، اللہ اپنی بات کا پاس رکھنے والوں پر رحمتیں نازل فرماتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں زندگی پرسکون گزرتی ہے۔

بلکہ بسا اوقات عورت شوہر کو بلند اخلاق سے متصف دیکھ کر خود اپنے مال حق سے مکمل یا جزوی طور پر دست بردار ہو جاتی ہے، آخر جس نے اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دیا ہے کیا وہ اس سے مال کی کنجوسی کرے گی؟

بعض مردوں کا یہ خیال ہے کہ انہیں صرف حقوق حاصل ہیں اور ان پر کچھ ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتی ہیں، ایسے لوگ صرف اپنی انا کے نشے میں چور رہتے ہیں اور فریق ثانی کے حقوق کی کچھ پرواہ نہیں کرتے ہیں، مسلم گھرانہ کی بنیاد تو اس عادلانہ اصول پر ہوتی ہے: ''**ولھن مثل الذي عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة**'' (اور عورتوں کو اپنی ذمہ داریوں کے بقدر ہی معروف کے مطابق حقوق حاصل ہیں، ہاں البتہ مردوں کو ان پر یک گونہ برتری حاصل ہے)، یہ برتری افراد خانہ کے اس نظام کی سربراہی ہے۔ اور کیا کوئی نظام بنا سربراہ کے چل سکتا ہے۔

مسلم گھرانے کی سماجی ذمہ داریاں چند صلاحیتوں کی متقاضی ہیں، اگر یہ نہ پائی جائیں تو پھر شادی کو وجود میں لانے کا کوئی معقول سبب نہیں پایا جاتا ہے۔

اگر عورت محبت کے جذبات سے عاری، سخت دل، محض اپنے حقوق کا خیال رکھنے والی اور دوسری کے حقوق کی بالکل پرواہ نہ کرنے والی ہو تو پھر اس کا تنہا زندگی گزارنا ہی بہتر ہے۔ ایسی عورت گھر کی ذمہ دار بننے کی اہل نہیں ہے، شوہر بسا اوقات سخت بیمار ہو جاتا ہے، اس کی بیماری

طول پکڑ جاتی ہے، ایسے میں پیشہ ور تیمار دار (نرس وغیرہ) اس سے تنگ آجاتے ہیں، ایسی صورت میں اس کی بیوی کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ اچھی توقعات اور پریشان نہ ہونے کا اظہار کرے گی، نیز اس کے لئے سراپا دعا بن جائے گی۔

ایک قصہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے اپنی ایک روایت میں نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنی بیٹی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، اور عرض کیا کہ میری یہ بیٹی شادی کرنے سے انکار کرتی ہے، اس سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے والد کا کہنا مانو! اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے میں اس وقت تک نہیں شادی کروں گی جب تک آپ مجھے یہ نہ بتا دیں گے کہ بیوی پر شوہر کے کیا حقوق ہیں۔

آپ ﷺ اس سے فرمایا کہ اگر شوہر کو کوئی تکلیف ہوا اور اس حال میں بیوی اس سے اچھی اچھی باتیں کرے تو اس نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی، اس نے عرض کیا کہ پھر تو میں بخدا کبھی بھی شادی نہیں کروں گی۔

یہ سن کر آپ ﷺ نے اس کے والد سے کہا: ان کی اجازت کے بغیر ان کی شادی نہ کرنا۔

اس لڑکی نے اپنے ساتھ انصاف کیا، اور اپنے آپ کو کسی ایسے کام کا مکلّف نہیں کیا جس کو وہ پورا نہ کر سکے، اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عورت کو اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے پر مجبور کرے۔ مرد کے ذریعہ بیوی کی تیمار داری کا بھی یہی حکم ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف'' (اور عورتوں کو اپنی ذمہ داریوں کے بقدر معروف کے مطابق حقوق حاصل ہیں)۔ ہم اس مسئلہ کو اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ گھروں کی بنیاد باہم محبت پر ہے، اور اللہ کا ارشاد ہے: ''هن لباس لكم وأنتم لباس لهن'' (عورتیں تم مردوں کے لئے لباس ہیں اور تم ان کا لباس

ہو)۔

مخلصانہ محبت کے نتیجہ میں وہ وفاء وتعلق وجود میں آتا ہے جس سے تجارتی قوانین اور منافع کی بنیاد پر قائم تعلقات واقف نہیں ہیں، مرد اور عورت دونوں بکثرت گھر پر اپنی زندگی قربان کر دیتے ہیں۔

ہم جو عورت کی بابت کہہ رہے ہیں وہی مرد کی بابت بھی کہہ رہے ہیں، خاندان کی مادی ومعنوی ذمہ داریوں کو اٹھا سکنے سے عاجز شخص کے لئے شادی کرنا جائز نہیں ہے، ایسے شخص کو رسول اکرم ﷺ کی نصیحت ہے کہ: ''جو شخص ان ذمہ داریوں کو نہ اٹھا سکے اس پر روزے لازمی ہیں کہ یہ روزے اس کی شہوت کو قابو میں رکھیں گے''۔

مردوں اور عورتوں کی قربانیاں

بزدل خاتون اپنے شوہر کو ذمہ داریوں کی ادائیگی، خطرات مول لینے اور مسائل سے نمٹنے کے لئے قدم اٹھانے سے روکتی ہے، بخیل عورت اپنے شوہر کو کمزور حالوں کی مدد اور مہمان نوازی پر مال خرچ کرنے نہیں دیتی۔

گھر کے اندر ہی گھرے رہنے سے انسان گھر کے باہر کی سرگرمیاں انجام نہیں دے پاتا، اور صرف گھر کے کاموں نیز بیوی اور اولاد کی خواہشات کی تکمیل میں لگا رہتا ہے، اور پھر یہ سلسلہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو قربانیاں دینے کا حکم دیا ہے، خواہ ان کی بیویاں ان کو کتنا ہی روکیں، کم ہمتی اور آرام وراحت نیز سکون خاطر کو اصولوں وعقائد پر ترجیح دنے سے روکا ہے، یہ آیات قرآنی ملاحظہ ہوں: ''**يا أيها الذين آمنوا إن من أزواجكم وأولادكم عدوا لكم فاحذروهم وإن تعفوا وتصفحوا وتغفروا فإن الله غفور رحيم**'' (اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن بھی ہیں، پس ان سے خبردار ہو، اور اگر تم نے عفوودرگزر کا معاملہ فرمایا تو اللہ بہت مغفرت اور رحم کرنے والا ہے)۔

یہاں دشمنی سے مراد لڑائی جھگڑے والی دشمنی نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد انسان کا گھریلو تقاضوں کے آگے گھٹنے ٹیک دینا، اور اہل خانہ کے ساتھ رہنے کے مقصد سے ہجرت وجہاد نہ کرنا ہے۔

میں نے سلف صالحین کی تاریخ پر غور کیا تو دین کی خدمت، اس کے حق کی ادائیگی اور اس کی مدد کے سلسلے میں زوجین کے باہمی تعاون کا عجیب وغریب حال دیکھا۔

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ جب حضرت ابوسلمہ نے ہجرت کا پکا ارادہ کرلیا، تو میرے لئے میرا اونٹ تیار کیا، مجھے بیٹے سلمہ کے ساتھ بیٹھایا، پھر ہم نے مدینہ کا سفر شروع کیا، یہ منظر دیکھ کر میرے گھر والے راستہ روک کر کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے، اپنے سلسلے میں تو تم مختار ہو! لیکن یہ لڑکی تو ہماری ہے؟ ہم تمہیں اسے دربدر پھرائے پھرنے کی اجازت کیسے دے دیں؟ یہ کہہ کر انہوں نے ابوسلمہ کے ہاتھ سے میرے اونٹ کی نکیل لے لی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے، اس واقعہ پر بنوسلمہ کو بہت غصہ آیا، وہ کہنے لگے اگر تم نے اپنی بیٹی ہمارے لڑکے سے لی ہے تو پھر ہم بھی اپنے بچے (سلمہ) کو تمہارے پاس نہیں چھوڑیں گے، حضرت ام سلمہ کہتی ہیں: خاندان اور میرے سسرالی خاندان کے لوگ لڑکے کو آپس میں ایسے ایک دوسرے سے کھینچنے لگے کہ اس کا ہاتھ اکھاڑ دیتے، بالآخر میرے سسرالی رشتہ دار بچے کو لے گئے، میرے شوہر تنہا مدینہ چلے گئے، اس طرح ان لوگوں نے مجھے، میرے شوہر اور میرے بچے کو الگ الگ کردیا۔

میں ہر صبح ابطح جا کر بیٹھ جاتی اور روتے روتے شام کردیتی، ایک سال تک یہی حال رہا، یہاں تک کہ ایک دن ایک مراعم زاد وہاں سے گزرا، میرا حال دیکھ کر اس کو ترس آگیا، اس نے میرے گھر والوں سے کہا: اس بیچاری کو اپنے شوہر کے پاس جانے دو! اس کی درخواست پر میرے گھر والوں نے کہا کہ اگر تم چاہو تو اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ، یہ سن کر میں نے اپنا بیٹا واپس مانگا اور اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ کے لئے نکل گئی، ہمارے ساتھ کوئی اور نہ تھا۔

ابھی میں مکہ سے نکل کر بس تنعیم تک ہی پہنچا تھا، کہ میری ملاقات عثمان بن طلحہ سے ہوئی، انہوں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا شوہر کے پاس مدینہ جارہی ہوں، پوچھا تمہارے ساتھ کوئی اور ہے؟ میں نے کہا صرف اللہ اور یہ میرا بیٹا۔

انہوں نے اونٹ کی نکیل پکڑی اور کہا تم تنہا نہ جاؤ گی اور مجھے لے کے تیز تیز چلے، بخدا مجھے ان سے زیادہ شریف انسان کا ساتھ نہیں ملا، جب وہ کسی منزل پر رکتے تو اونٹ بیٹھا دیتے اور

خود ہٹ جاتے، میں اتر جاتی تو میرا اونٹ کسی درخت سے باندھ دیتے اور خود دور کسی اور درخت کے سایے میں جا کر لیٹ جاتے۔

پھر جب چلنے کا وقت آتا تو میرے اونٹ کے پاس آتے، اسے تیار کرتے، اور ہٹ جاتے، میں اس پر سوار ہوتی، تو پھر وہ نکیل پکڑ کر چلنے لگتے، اسی طرح انہوں نے مجھے مدینہ پہنچا دیا، پھر جب بنو عمرو بن عوف کی بستی نظر آئی، تو انہوں نے کہا: اس بستی میں ابو سلمہ مقیم ہیں، اللہ کی برکت کے زیر سایہ یہاں چلی جاؤ، یہ کہہ کر وہ خود اپنی ذمہ داری ادا کر کے چلے گئے۔ بکھرنے اور غموں تلے رہنے کے بعد ایک بار پھر تمام افراد خانہ مل گئے، لیکن ابو سلمہ نے خدمت اسلام کے لئے اپنی محنت جاری رکھی، اور تقدیر خداوندی کہ احد میں شہید ہو گئے، اور حضرت ام سلمہ پھر یکا و تنہا رہ گئیں، اس کے بعد آں حضرت ﷺ نے اسلام کی خاطر ان کی قربانیوں کے پیش نظر ان سے شادی کر کے انہیں عزت سے نوازا۔

اسلام کی عمارت عظیم ترین قربانیوں پر کھڑی ہے، یہ قربانیاں بہادر خاندانوں نے دی ہیں، ان خاندانوں نے جن کے افراد حق و صبر کی ایک دوسرے کو تلقین کرتے رہتے تھے۔

گھر کا کردار

بچوں کی تربیت میں گھر کا بڑا کردار ہے، بلکہ شاید دین و مادری زبان کے سلسلے میں گھر ہی اصل حیثیت رکھتا ہے، علماء اخلاق کے نزدیک تربیت کے دو اہم ترین عناصر نسلی اثرات اور ماحول ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان دونوں عناصر میں سے زیادہ قوی عنصر کون سا ہے اس کے سلسلے میں ان کا اختلاف ہے۔

ایک عرب شاعر کا شعر ہے:

وينشا ناشئ الفتيان فينا　　على ما كان عوّده أبوه

(ہمارا نوجوان وہ مزاج پاتا ہے جس کی تربیت اس کا والد اسے دیتا ہے)

کیا اکیلا باپ بچوں کو اچھی عادات کا عادی بنا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! جسمانی ومعنوی اثرات میں ماں کا بھی ایک کردار ہوتا ہے، جب حضرت مریم اپنے اس بچے (عظیم نبی حضرت عیسیٰ) کو لوگوں کے پاس لائیں جس کے باپ معروف نہ تھے تو لوگوں نے ان سے کہا: ''**يا أخت هارون ما كان أبوک امرأ سوء وما كانت أمک بغيا**'' (اے ہارون کی بہن! تمہارا باپ تو برا آدمی نہیں تھا، اور نہ ہی تمہاری ماں بدکردار تھی) اولاد پر بلکہ پوتوں پر بھی دونوں والدین کے اثرات پڑتے ہیں، اسی لئے ہم پورے گھر کو اولاد کے تئیں ذمہ دار مانتے ہیں، اور بچوں کے حال ومستقبل کے لئے ماں باپ سے یکساں طور پر مکمل فکر ونگہبانی کا مطالبہ کرتے ہیں، برباد گھروں پر اچھے معاشرے کی تعمیر ناممکن ہے، بچوں کی تربیت کا فقدان اس بات کا اعلان ہے کہ امت کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔

اسلام نے باپ کو حکم دیا ہے کہ وہ نوافل اپنے گھر میں پڑھے، تاکہ اس کی اولاد رکوع

اور سجدوں سے مانوس ہو، اور گھر میں تلاوت کرے، تاکہ گھر کی فضا قرآنی معانی سے معطر رہے، ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے: ''اپنی کچھ نمازیں گھروں میں بھی پڑھا کرو اور گھروں کو قبرستان نہ بناؤ'' یعنی وہ گھر جس میں نماز نہ پڑھی جائے وحشت ناک قبرستان جیسا ہے، آپ ﷺ کا ایک اور ارشاد ہے:

''جس گھر میں اللہ کا ذکر کیا جائے اور جس میں نہ کیا جائے ان دونوں کی مثال زندہ اور مردے کی ہے''، ایک اور موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے گھر میں انسان کی نماز نور ہے، پس اپنے گھروں کو منور کرو''۔

اسی طرح شریعت نے بچوں کو کم عمری میں ہی نماز سکھانے اور اچھے اخلاق کا عادی بنانے کا حکم دیا ہے تاکہ وہ نیک وشریف جوان بنیں، باغیرت مربیوں کا خیال ہے کہ ثقافتی استعمار نئی نسل پر خاص توجہ دیتا ہے، بے کار نسلیں کامیاب نہیں ہوا کرتیں، ان میں بس حیوانوں جیسی خواہشات پائی جاتی ہیں، ہاں ان کو نظریاتی علوم کا تھوڑا بہت علم ہوتا ہے، اور ان سے نہ بلند ہمتی پیدا ہوتی ہے اور نہ باعزت مقام حاصل ہوتا ہے۔ تیسری دنیا کی اکثر قومیں اسی خراب حالت میں ہیں۔

شیخ احمد موسیٰ سالم نے لکھا ہے کہ ہمارے ممالک میں بچپن قومی ضیاع، اور بے وطنی سے دوچار ہے، یعنی ہمیں اپنے قومی فضائل، اپنی عظمت رفتہ، دین کی اہمیت اور زبان کی ملاحت وشیرینی کا خود علم نہیں ہے، بچہ بولنا شروع کرتا ہے تو دیگر زبانوں کے الفاظ اس کی زبان پر ہوتے ہیں، یا پھر بازاری زبان بولتا ہے، اور نوخیزوں کو ایسی مہم کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس پر اجنبی فکر حاوی ہوتی ہے، ان کے سامنے جو تصویریں ہوتی ہیں وہ دوسروں کی عظمتیں قائم کرتی ہیں، ایسی کتابیں اور رسالے ان کو ملتے ہیں جو ہمیں مجروح کرتے ہیں، ہمیں اپنی اصل سے دور کرتے ہیں، اپنے دین سے غافل بناتے ہیں اور صرف یورپی طرز زندگی سے آشنا کرتے ہیں۔

جب ہمارے بچے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں تو ان کے دلوں میں کیا اقدار نقش ہوتے ہیں؟ ایک ممتاز فٹ بال پلیر کی تصویر جو دوڑ رہا ہو اور لوگ اس کے شاندار شاٹ کی داد دے رہے ہوں، یا کسی ڈرامہ کی ایکٹریس جو اپنا کردار ادا کرتے ہوئے ہنس یا رو رہی ہو اور سامنے کو یا پیچھے کو جا رہی ہو؟

ان مناظر کے پروردہ بچے کبھی بھی کوئی اونچا مقام نہیں پا سکتے، اس کا تو سوال ہی کیا ہی کہ یہ امت کے تہذیبی، اقتصادی اور سماجی برے حال کو کچھ بہتر کر سکیں۔

میرا خیال ہے کہ بچوں کی تربیت کے لئے ایک نئی علمی وادبی پالیسی وضع کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ہمارے انجام کا بس خدا ہی مالک ہے۔

اگر بچا سچ بولنا گھر میں نہیں سیکھے گا تو پھر کہاں سیکھے گا؟ اگر والدین کی آغوش میں اسے وفاداری، امانت داری اور نرم مزاجی کی تربیت نہیں ملے گی تو پھر کہاں ملے گی۔

کیا گھر کی ذمہ داری بس اپنے افراد کے لئے چارے پانی کا انتظام کرنا ہے؟ کیا ہم نے یہ آیت قرآنی نہیں سنی: ''**يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم نارا وقودها الناس والحجارة**'' (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے)۔

اخلاقی انحطاط کی سزا قیامت پر موقوف نہیں ہے، ہمارا مشاہدہ ہے کہ خراب اخلاقی حالت کی حامل قوموں کی کوئی حیثیت دنیا میں نہیں ہوتی ہے، وہ عام طور پر غربت اور ذلت کی شکار ہو جاتی ہیں۔

ہر مضبوط اور ذہین فرد درحقیقت ایسے بچپن کا تیار کردہ ہوتا ہے جو برائیوں اور لاپرواہیوں سے محفوظ ہو، اور جس پر سمجھ دار ماں اور بیدار مغز باپ کی نگرانی رہی ہو۔

اپنی جوانی میں میں نے ایک غیر ملکی عورت کو دیکھا، کہ وہ شام کے وقت اپنے بچوں کو

جمع کرتی، ان کے ہاتھ میں کاپیاں ہوتیں، اور ماں ان کے ہوم ورک کی نگرانی کرتی تھی، جب بچے سڑک پر برائے تفریح جاتے تو وہ کھڑکی سے ان پر نظر رکھتی، کہ کہیں ان کو کوئی گاڑی ٹکر نہ ماردے یا کہیں غلط لوگوں سے ان کی لڑائی نہ ہو جائے۔

اسی لئے میرا کہنا ہے کہ گھر کی مالکن کی ذمہ داری کوئی آسان ذمہ داری نہیں ہے، یہ لذت اندوزی اور جنسی شہوتوں کے تقاضوں سے پرے ایک منصب ہے:

الأم مدرسة إذا أعددتها　　أعددت شعبا طيب الأعراق

(ماں ایک مدرسہ ہے، اگر آپ نے اس کی اچھی تربیت کردی تو گویا کہ آپ نے نیک فطرت خاندان تیار کردیا)۔

امت اسلامیہ پر کئے گئے استعماری حملے کے دو ہدف تھے: ایک عورت کو ایسا جاہل رکھنا کہ وہ اپنے یا دنیا کے بارے میں کچھ نہ جانتی ہو، دوسرا یہ کہ اگر وہ تعلیم یافتہ ہو جائے تو اسے بے کار کے کاموں، فیشن، جدید تمدن کے مظاہر میں الجھا دینا اور عقل، محنت نیز انفرادی و اجتماعی ترقی سے دور رکھنا۔

استعمار نے اس کے لئے اس تعلیم کو ہتھیار بنایا جس کے ساتھ تربیت کا کوئی نظام نہیں تھا، اگر کوئی شخص دینی تعلیم کا مطالبہ کرتا ہے تو اس کو ایسے نصاب کے ذریعہ خاموش کردیا جاتا ہے جس میں بچے سورۂ فیل یا سورۂ ایلاف یاد کرلیں، اور بس اس طرح دینی تعلیم و تربیت کے خلا کو گویا کہ پر کردیا جاتا ہے۔

استعمار نے بچوں کو گمراہ کرنے کے بعد بڑوں کو بھی بگاڑنا شروع کیا، اسی صورت حال کے پیش نظر میں نے اس المناک خیال کو احاطۂ تحریر میں لانے کا فیصلہ کیا، اور میرے لکھنے کا حاصل صرف یہ ہے کہ: ؏

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

نوجوانی کے آغاز سے آج تک روزنامہ اخبارات پڑھتے وقت میں اس کالم کو چھوڑ دیتا ہوں جس کا عنوان ہوتا ہے: ’’آج شام آپ کہاں جائیں؟ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ مجھے کہاں جانا ہے؟ اور مجھے کسی ایسے شخص کی ضرورت نہیں ہے جو میرے اوقات کو منظّم کرے، میں ہمیشہ اپنے علم اور لوگوں کے نفع میں اضافہ کا خواہش مند رہتا ہوں، اور ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بعد مجھے فرصت شاذونادر ہی ملتی ہے۔

لیکن پچھلے مہینہ ایک روز مجھے خیال ہوا کہ میں یہ جانوں کہ لوگ شام کو اپنے اوقات کیسے گزارتے ہیں، تو میں نے ایک کثیر الاشاعت روزنامہ لیا اور ان فلموں کے نام پڑھنے شروع کئے جن کے ساتھ لوگ اپنی شامیں بسر کرتے ہیں، صرف ایک شام کے لئے اعلان کئے گئے جب ان ناموں کو میں نے پڑھا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی: لهيب الشياطين (شیطان کے شعلے) السغلة المحترفون (پیشہ ور حقیر لوگ) ثورة كنج كونج (کنج کونج کی بغاوت) چونکہ میرے علم میں ایسی کوئی بغاوت نہیں تھی جس کے قائد کا نام کنج ہوا اس لئے میں نے ایک صاحب سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ ایک بہت خوفناک بندر ہے جو ہر چیز کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔

میں نام پڑھتا چلا گیا: الرجل المدمر (تباہ کن مرد) ميراث الغضب (غصہ کی وراثت) علاء الدين، النمر والأنثى (تیندوا اور عورت) رجل في عيون امرأة (عورت کی نگاہ میں مرد) جرى الوحوش (وحشی جانوروں کی دوڑ) عزبة الصفيح، الملعوب، (کھلونا) قسوة الانتقام (انتقام کی آگ) قاهر التماسيح (مگرمچھوں کا بادشاہ) النتجا الجبار (ظالم نجا) میں اس نجا کو نہیں جان سکا، الثأر والانتقام (بدلہ اور انتقام) الهجوم الدامى (خون ریز حملہ) القتلة الطائرون (اڑتے ہوئے قاتل) معركة التنين الجبار (زبردست بھوت کی جنگ) سيف الشيطان (شیطان کی تلوار) بنات من نار (آگ کی

لڑکیاں)۔

جس شام کو یہ سب فلمیں دکھائی جائیں وہ خواہ بجلی کے قمقموں سے کیسی ہی روشن کیوں نہ ہو، حقیقت میں تاریک ترین ہے، کیسا مقام تعجب ہے؟ کہ ایک شام میں اتنی بڑی مقدار میں گھٹیا فکر پیش کی جاتی ہے، اور افسوس کہ پروپیگنڈہ کے اسیر اور غیروں کے ثقافتی حملوں کے مارے ہوئے لوگ گھنٹوں یہ سب کچھ دیکھتے ہیں، یقیناً ان سب کے نتیجے میں دلوں پر بہت غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

کیا ان چیزوں کو دیکھ کر ہمارا کوئی فرد اعلیٰ اخلاق کا حامل اور شریف النفس ہوسکتا ہے، یہ ڈرامے کیا اچھی تربیت میں معاون ہیں؟ اور کیا ان سے پاکیزہ اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے؟ ایسے گھروں کے پروردہ بچے عقل وقلب کے سلیم نہیں ہوسکتے، بلکہ وہ چھوٹے بڑے گناہوں میں لت پت ہی ہوں گے۔

میرے نزدیک ہیروئن اور افیم بھی ان غیر ملکوں سے برآمد شدہ تباہیوں سے کم تباہ کن ہیں، ان ڈراموں کو دیکھنے والی قوم کبھی بھی اچھا مستقبل نہیں پاسکتی ہے۔

اس دن شام تک ان ڈراموں اور فلموں کے یہ عناوین میری چشم تصور کے سامنے رہے، شام ہوئی تو میں نے یہ دعا پڑھی: ''**اللهم اجعل مساء نا هذا مساء صالحا لا مخزيا ولا فاضحا**'' (اے اللہ ہماری اس شام کو ہمارے لئے نیکی کا سامان بنا نہ کہ ذلت ورسوائی کا)۔

عصر حاضر کے والدین

ہم ایک بڑے اسلامی شہر میں تھے، کہ یہ خبر ملی کہ وہاں معذوروں کے لئے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جارہا ہے، جہاں وہ اپنی زندگی گزار سکیں، اس خبر سے مجھے بہت مسرت ہوئی، اس لئے کہ میں کمزوروں اور مصیبت زدوں سے ہمدردی رکھتا ہوں، اور اللہ سے ان کے لئے عافیت کی دعا مانگتا رہتا ہوں۔

لیکن ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ یہ عمر دراز ماں باپ کے لئے ویسا ہی ایک ادارہ ہے، جیسے مغربی ممالک میں ''اولڈ ہومس'' ہوتے ہیں، جہاں بوڑھے ماں باپ اپنی بقیہ عمریں گزارنے آجاتے ہیں۔

یہ جان کر مجھے سخت تکلیف ہوئی، اور میں نے سوچا کہ تہذیب نو نے خاندانی تعلقات کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، اور صلہ رحمی کی روایات کو قصہ پارینہ بنا دیا ہے۔

یورپ کے نوجوانوں نے زندگی کو بس رنگ رلیوں کا ذریعہ بنا رکھا ہے، اور اپنے والدین کو اس طرح فراموش کر دیا ہے کہ ان سے ملاقات لمبے لمبے عرصوں بعد یا پھر برتھ ڈے جیسی تقریبات میں ہوتی ہے، والدین کے بڑھاپے میں انہیں کوئی محبت سے بولنے والا نہیں ملتا، اور رہنے کو گھر نصیب ہوتا۔

اگر کسی عمر دراز کو گھر نصیب بھی ہوتا ہے تو ایسا کہ اہل خانہ بالکل بھی خیال نہیں رکھتے، اور بسا اوقات یہ گھر بس عارضی ہی ہوتا ہے، ایسی صورت میں اولڈ ہومس ہی ان کے لئے مناسب ہوتے ہیں جہاں وہ اپنی موت سے پہلے کا عرصہ گزار سکیں۔

ان کی اولاد اپنی ڈیوٹی کے بعد رقص وسرور اور ڈراموں وغیرہ کی مجلسوں میں داد عیش

دینے چلی جاتی ہیں، اور اس کو وہ اپنے بوڑھے اور معذور باپ کی خدمت میں تھوڑا بہت وقت گزارنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔

ایسے لوگ خواہ کتنا ہی پڑھ لکھ لیں اور کیسے ہی تہذیب یافتہ ہونے کا دعوا کرلیں جانوروں جیسے ہی ہیں۔

ہمارے معاشروں میں والدین کو برکت تصور کیا جاتا تھا، انسان اپنے کام کو جاتا تھا تو یہ سوچ کر مطمئن رہتا تھا کہ اس کے والدین اس کے لئے مصروف دعا ہیں، پھر جب وہ گھر آتا تو سب سے پہلے انہیں کی خیرت دریافت کرتا، اس کے بعد بیوی بچوں کی طرف توجہ دیتا، ہم بہت بدل گئے، اور افسوس کہ تبدیلی انحطاط کی ہے، ترقی کی نہیں۔

قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے اپنی توحید اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ایک ساتھ دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: **واعبدو الله ولا تشركوا به شيئا وبالوالدين إحسانا**'' (اور اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو) اس کی وجہ یہ ہے کہ کم عمری میں جب والدین کی شفقتیں انسان پر برستی ہیں تو اس وقت انسان عقل وشعور کے اعتبار سے نہایت کمزور ہوتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ احسانات اس پر ایک ایسی ذات کی جانب سے ہو رہے ہیں، جس کی یہ ذمہ داری ہیں، اور اس کے کچھ حقوق نہیں ہیں، یہی حال لوگوں کا اپنے رب کے ساتھ ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اشیاءِ خوردونوش اور لباس جیسے اسباب حیات وعافیت ان پر فضاء سے ازخود برستے ہیں، یا یہ ایک ایسی غیر معروف ذات کا عطیہ ہیں جس کی خواہش ہے کہ اس کے زیر بار احسان افراد اسے نہ جانیں۔

اسی لئے انہیں صبح وشام برستی اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کا خیال ہی نہیں آتا ہے۔

اللہ نے چاہا کہ والدین کے احسانات کی جانب انسانوں کی توجہ مبذول کرائی جائے، تھوڑے بہت ہی غور وفکر سے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ان کا حق ہونا معلوم ہوجاتا ہے،

ساتھ ہی اللہ کی یہ بھی مشیت ہوئی کہ لوگوں کی توجہ اپنے حق واحسان کی جانب بھی موڑی جائے کہ وہ والدین واولاد اور تمام کائنات کی مخلوقات کا مالک ہے: ''**وقضی ربک ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا إما يبلغن عندک الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنحرهما وقل لهما قولا كريماواخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا**'' (تمہارے رب کا فیصلہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اگر تم کو ان میں سے کسی ایک یا دونوں کا بڑھاپا ملے تو تم ان سے اف تک نہ کہو، اور ان کو جھڑکو مت، اور ان سے اچھی طرح گفتگو کرو، اور ان کے ساتھ فروتنی سے پیش آؤ، اور یوں کہو کہ: اے میرے رب ان دونوں پر ویسے ہی رحم کرے جیسے ان دونوں نے بچپن میں مجھے پالا تھا)۔

قدیم عربی ادب میں بھی ہمیں اولاد کی اس نافرمانی کا شکوہ ملتا ہے، امیہ بن ابی صلت نے اپنے نافرمان بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

فلما بلغتَ السن والغاية التي إليها مدى ماكنتُ فيک أؤمل
جعلتَ جزائي منک جبها وغلظة كأنک أنت المنعم المتفضل
فليتک إذ لم ترع حق أبوتی فعلت كما الجار المجاور يفعل

(جب تم عمر ومرتبہ کے اس مقام پر پہنچے جس پر میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا تو تم نے میرا بدلہ سخت مزاجی سے دیا، گویا کہ تم مجھ پر احسان کرنے والے ہو، اگر تمہیں میرے والد ہونے کا پاس نہیں ہے تو کاش تم وہ سلوک کرتے جو ایک پڑوسی کرتا ہے۔)

ایک دوسرے شاعر کے اشعار ہیں:

لربيته حتى إذا صار شيظما يكاد يساوی غارب الفحل غاربه
فلما رآنی أبصر الشخص أشخصا قريبا، وذا الشخص البعيد أقاربه

تغمد حقی ظالما، ولوی یدی   لوی یده الله الذي هو غالبه
أ إن أرعشت كفا أبيک و أصبحت   يداک يدی ليت، فإنک ضاربه

(بخدا پہلے میں نے اس کی پرورش و پرداخت کی، یہاں تک کہ وہ جب بڑا ہو گیا اور اس نے مجھے اس حال میں پایا کہ میری نگاہ کمزور ہو چکی تھی، اور مجھے قریب کی چیز کئی کئی دکھتی تھیں اور دور کی چیز قریب معلوم ہوتی تھی، تو اس نے میرے حقوق ادا نہ کئے اور میرا ہاتھ موڑ دیا، وہ اللہ جو اس پر غالب ہے اس کا ہاتھ موڑ دے، اگر تمہارے باپ کے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا ہے، اور تم طاقت ور جوان ہو گئے تو تم اس پر ہاتھ اٹھاؤ گے؟)

بلاشبہ اولڈ ہومس اس بدترین صورت حال اور اولاد کے برے سلوک سے بدر جہا بہتر ہیں۔ لیکن ہم دونوں کے درمیان موازنہ کریں ہی کیوں؟ وہ حسن سلوک او رجذبۂ ہمدردی ہمارے یہاں کیوں نہ پایا جائے جس کے تحت ہم اللہ اور والدین کے حقوق ادا کریں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور جہاد کی اجازت چاہی، آپ نے اس سے دریافت فرمایا: کیا تمہارے والدین حیات ہیں؟ اس نے عرض کیا: جی! فرمایا پھر ان کی خدمت کا ہی جہاد کرو۔

ایک اور روایت میں ہے کہ: ''ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا: میں اللہ کو راضی کرنے کے لئے آپ کے ہاتھ پر ہجرت و جہاد کی بیعت کرتا ہوں، آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا تمہارے والدین میں سے کوئی حیات ہے؟ اس نے عرض کیا: جی، دونوں حیات ہیں، آپ نے فرمایا کیا اللہ کے یہاں ثواب چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا: جی، آپ نے فرمایا: والدین کی خدمت میں جاؤ اور ان کی خدمت کرو۔''

ایک اور روایت جو کہ معاویہ بن جاہمہ سے مروی ہے، اس میں ہے کہ ہم رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جہاد کرنا چاہتا ہوں، آپ سے

مشورہ کی خاطر حاضر ہوا ہوں، آپ نے فرمایا: کیا تمہاری والدہ حیات ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: بس انہیں کی خدمت میں رہو! کہ تمہاری جنت ان کے قدموں کے پاس ہے۔ بعض دیگر روایت میں جنت کو ماں کے قدموں تلے بتایا گیا ہے۔

خیال رہے کہ بغیر تقوے اور اچھے اخلاق کے کسی گھر کا نظام نہ صحیح طریقہ پر چل سکتا ہے اور نہ وہاں اچھا ماحول قائم ہوسکتا ہے، گھروں میں کچھ نہ کچھ مسائل تو پیش آتے ہی ہیں، ان عارضی مسائل سے نپٹنے کے لئے ذہانت اور صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے، حضرت انسؓ کی اُس روایت کا یہی پیغام ہے جس کے مطابق آپ کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا: میرے والد مجھے ایک بات کا حکم دے رہے ہیں اور میری ماں اس سے روک رہی ہیں، میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا والد کا کہنا مانو اور ماں کی نافرمانی نہ کرو۔

ایک باپ غصہ میں کسی ممتاز عالم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے کہا: میرے بیٹے سے کہئے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے، انہوں نے دریافت کیا کیوں؟ اس نے کہا: وہ مجھے پسند نہیں، انہوں نے فرمایا: تمہاری ناپسندیدگی اس کو طلاق دینے کی اجازت نہیں دے دیتی، اس نے عرض کیا: کیا حضرت عبداللہ بن عمر کو رسول اللہ ﷺ نے طلاق کا حکم اس لئے نہیں دیا تھا کہ ان کے والد اسے ناپسند کرتے تھے؟ اس سوال پر انہوں نے کہا: جب دین داری، تقوے اور انصاف میں تم حضرت عمر جیسے ہو جاؤ گے تو میں تمہارے بہو بیٹوں کو تمہاری خواہشات کا تابع کر دوں گا۔

بعض لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بہو بیٹوں پر اپنی حکومت چلائیں۔

اور بہو یہ چاہتی ہے کہ شوہر والدین کو چھوڑ کر صرف اسی کا ہو رہے، اس خودغرضانہ طریقہ کار کے نہایت برے نتائج نکلتے ہیں، دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کے اور اخلاق حسنہ کو اختیار کر کے ہم بہت سے مسائل سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں، اور گھر کے شیرازہ کو منتشر ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

صلہ رحمی ایمانی اعمال میں سے ہے

وہ انسان بدترین انسان ہے جو بس اپنے لئے جئے، خود غرض ہو، اور صرف اس شخص سے تعلق رکھے جس سے اس کی کوئی مصلحت یا ضرورت وابستہ ہو۔

ایسے لوگ انسان کم اور حیوان زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے کہ انسان حیوان سے بہتر دو اسباب کی بنا پر ہے، ایک زمین و آسمان میں سرگرداں اس کی عقل، اور دوسرے اس کے جذبات جو اسے اپنے علاوہ دوسروں کے لئے بھی مفید بناتے ہیں۔

جانور صرف اپنے مفادات، خواہشات اور خطرات کی ہی بابت سوچتا ہے، اپنی اولاد سے اس کا تعلق بس ایک محدود عرصہ تک رہتا ہے اور پھر وہ دونوں بے تعلق ہو جاتے ہیں۔

اسلام مسلمانوں کو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی بہت تاکید کرتا ہے، والدین کے بعد اس سلسلہ میں اولوالارحام (رشتہ داروں) کا نمبر سب سے پہلے ہے، ایک حدیث میں آں حضرت کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: اللہ اور آخرت پر ایمان والے کو صلہ رحمی کرنی چاہئے، ایک حدیث میں ہے:

جسے وسیع رزق اور طویل عمر کی خواہش ہو اسے صلہ رحمی کرنی چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ کے حکیمانہ اقوال میں سے حضرت ابوذر کی روایت کردہ یہ حدیث بھی ہے، جس میں وہ روایت کرتے ہیں کہ: ''مجھے خلیل (ﷺ) نے چند اچھی باتوں کی نصیحت کی......آپ نے مجھے نصیحت کی کہ میں اقتصادی اعتبار سے اپنے سے برتر کسی انسان کو نہ دیکھوں، بلکہ اپنے سے کم تر کو دیکھوں۔

آپ نے مجھے مسکینوں سے محبت اور ان پر شفقت کرنے کا حکم دیا، آپ نے مجھے صلہ

رحمی کا حکم دیا، اور مجھے نصیحت کی کہ میں اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کروں۔

یہ نصیحت بھی آپ نے کی کہ حق ہی کہوں خواہ وہ کڑوا ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح آپ نے **لاحول و لا قوۃ إلا باللّٰہ** زیادہ سے زیادہ پڑھنے کا حکم دیا کہ یہ جنت کا ایک ذخیرہ ہے''۔

اعزہ سب یکساں نہیں ہوتے ہیں ان میں سے بعض بداخلاق اور شری ہوتے ہیں، تو کچھ نہایت محبت کرنے والے، احسان منداور خیر کے پاسباں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے بعض اعزہ ایسے ہیں کہ میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہوں، اور وہ میرے ساتھ قطع رحمی، میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ بردباری کا معاملہ کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جہالت کا سلوک کرتے ہیں، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''اگر واقعی بات ایسی ہی ہے تو پھر گویا کہ تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھر رہے ہو، اور جب تک تم اس حال پر رہو گے ان کے خلاف تمہارے لئے اللہ کی جانب سے ایک مددگا مہیا رہے گا''۔

عرب رشتوں داروں کی جانب سے ایذاء برداشت کرکے صلہ رحمی کی روش پر قائم رہنے پر فخر کیا کرتے تھے، اور رشتہ داروں سے کینہ نہیں رکھتے تھے:

وإني لأنسى عند كل حفيظة   إذا قيل: مولاک! احتمال الضغائن

وإن كان مولى ليس فيما ينوبني   من الأمر، بالكافي، ولا بالمعاون

(ہر غیرت کے موقعہ پر جب مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ سامنے والا تمہارا رشتہ دار ہے تو میں سارا حسد بھول جاتا ہوں، خواہ یہ رشتہ دار ایسا ہو کہ میری مصیبتوں میں نہ میرے کچھ کام آسکے اور نہ انہیں ٹال سکے)۔

''اولوالارحام'' کا جو تصور اوّل وہلہ میں قائم ہوتا ہے اسلام نے اس کا دائرہ اس سے

کہیں زیادہ وسیع رکھا ہے، وہ چچوں، ماموؤں، چچازاد بھائیوں اور ماموں زاد بھائیوں سے نیز پہلے اور دوسرے درجہ کی رشتہ داریوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اس لئے اس کے دائرے میں بہت لوگ آتے ہیں۔

اسلام تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد مانتا ہے، خواہ کتنا ہی لمبا رعرصہ گزر جائے، اور خواہ شاخیں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو جائیں لیکن اس مشترک رشتہ سے صرف نظر کرنا اسلام کی نگاہ میں کوئی مناسب عمل نہیں ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**يا أيها الناس اتقوا ربكم الذي خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا كثيرا ونساء واتقوا الله الذي تساءلون به والأرحام إن الله كان عليكم رقيبا**'' (لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیے، اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو، اور رشتہ وقرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو، یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

تمام انسانوں کا سلسلۂ نسب ایک ہی ماں باپ تک جا پہنچتا ہے، اور انہیں اچھا لگے یا برا، بہر حال ان کی رگوں میں یکساں خون ہی دوڑتا ہے، لہذا بدسلوکی، جنگ وجدال، تکبر اور دوسروں کی تحقیر کیسے روا ہو سکتی ہے؟

قوم ونسل پرستی نے ماضی میں بھی انسانیت کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا تھا، اور آج بھی یہی حال ہے، نسل پرستی کے رجحانات نے نوع انسانی سے ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کا احساس ہی چھین لیا ہے۔

یورپی اقوام ہر طرح سے اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ سفید فام یا شمال کے باشندگان دوسروں کی بنسبت زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ ذہین ہیں۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ان لوگوں کی

دوسروں پر برتری بس چندصدیوں کا قصہ ہے۔

دینی اختلافات بھی ماضی سے زبردست خونریز جنگوں کی بنیاد رہے ہیں، نہ جانے کتنی روحیں اور کتنا مال جنگوں کی نذر ہو چکا ہے؟ اور کس قدر باہمی چپقلشوں کو انہوں نے وجود بخشا ہے؟

تفریق کی جتنی بنیادیں انسان نے تراش رکھی ہیں ان سب کو قرآن مجید نے اپنے اس ارشاد سے باطل قرار دے دیا ہے کہ: ''**يا أيها الناس إنا خلقناكم من ذكر و أنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أكرمكم عندالله أتقاكم إن الله عليم خبير**'' (اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور قبائل میں صرف اس لئے تقسیم کیا ہے تا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو، تم میں سب سے زیادہ تقوے والا تم میں سب سے زیادہ معزز ہے، بلاشبہ اللہ بہت علم والا اور بہت باخبر ہے)۔

اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے میں اسلام کے نام پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میری جانب سے اچھا اور منصفانہ سلوک آپ کا حق ہے، اسی طرح آپ کو مجھ پر انسانی اخوت کے حقوق حاصل ہیں، میری آپ سے آخری درخواست یہ ہے کہ آپ مجھے میرے انتخاب پر رہنے دیں، اور اگر کوئی اور بھی میرا اتباع چاہے تو اسے آزادانہ ایسا کرنے دیں۔

ہم اللہ واحد اور اس کے بھیجے ہوئے تمام انسانوں پر ایمان رکھتے ہیں، اور ہم اس دینی اتحاد کے داعی ہیں جو انسانی اتحاد کا ضامن ہو، اور انسانیت کے لئے اس زندگی میں چراغِ راہ کا کام دے۔

جو ہماری اس بات کو صحیح سمجھتا ہو وہ ہمارا ہے، اور جو اس کو صحیح نہیں سمجھتا اسے چاہئے کہ وہ ہمیں ہماری رائے پر رہنے دے اور ہمیں اس بات پر مجبور نہ کرے کہ ہم اپنے دفاع میں اس سے

جنگ کریں۔

آیت قرآنی: ''**الذین یوفون بعهد الله ولا ینقضون المیثاق والذین یصلون ما أمر الله به أن یوصل**'' کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: ''**یصلون ما أمر الله به أن یوصل**'' میں تمام کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانا مراد ہے یعنی یہ کہ وہ تمام کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھتا ہو اور ان کے درمیان تفریق نہ کرتا ہو۔

یہ ہے وہ ایمان جو شیرازہ بندی کا سامان ہے، یہ انبیاء اور ان کے متبعین کے درمیان پائے جانے والے رشتوں کا حق ادا کرتا ہے۔

آج ہم بآسانی یہ مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ وطنیت وقومیت کے پس پردہ کس طرح انسانوں کی لالچ قطع رحمی اور خونریزی کررہی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**فهل عسیتم إن تولیتم أن تفسدوا في الأرض وتقطعوا أرحامکم أولائک الذین لعنهم الله فاصمهم وأعمیٰ أبصارهم**'' کیا اب تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کروگے اور آپس میں قطعی رحمی کروگے، یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرا بنادیا)۔

''**إن الله خلق الخلق، حتی إذا فرغ منهم قامت الرحم فقالت: هذا مقام العائذ بک من القطیعة! قال نعم! أما ترضین أن أصل من أصلک واقطع من قطعک؟ قالت بلیٰ! قال فذلک لک، وهو معنی آیه: فهل عسیتم......**'' (اللہ جب مخلوق کی پیدائش سے فارغ ہوا تو رحم نے عرض کیا کہ میں قطع کئے جانے سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ جو تم سے جوڑے میں اس سے جوڑوں اور جو تم سے توڑے میں اس سے توڑوں؟ اس نے عرض کیا: بالکل، اللہ نے فرمایا: پھر تمہیں یہ حاصل ہے، یہی آیت قرآنی: **فهل عسیتم** [مذکورہ بالا آیت] کا مطلب ہے۔)

اس حدیث کی تشریح کے وقت یہ لغوی بحث پائی جاتی ہے:

قاضی عیاض کہتے ہیں: وہ رحم جس کے بارے میں صلہ رحمی اور قطع رحمی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ علم، عدل اور رحمت جیسی وہ حقیقت ہے جس کا کوئی جسم نہیں ہے، اس سے مرادرشتہ داری اور نسبی تعلق ہے، ایک والد کا رشتہ اس کی اساس ہوتا ہے۔

اس طرح کی حقیقتیں جن کا کوئی جسم نہ ہو وہ نہ کھڑی ہوسکتی ہیں اور نہ گفتگو کرسکتی ہیں، تو پھر اس حدیث کی تشریح کیسے کی جائے؟

قاضی عیاض لکھتے ہیں: یہ بات عربوں کے معمول کے مطابق بس بطور مجاز واستعارہ کہی گئی ہے، اور اس سے مراد صلہ رحمی کی اہمیت اور قطع رحمی کا گناہ بیان کرنا ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے مراد عرش پر رہنے والا ایک فرشتہ ہے جس نے ''رحم'' کی جانب سے یہ درخواست کی تھی۔ حقیقت کچھ بھی ہو، بہر حال صلہ رحمی ایمان کا ایک نمایاں ترین حصہ اور ایک عظیم نیکی ہے۔

عمل نہ کہ تعداد

انسانی جغرافیہ (Human Geogrophy) کے ایک ماہر کا مضمون پڑھنے کا اتفاق ہو، جس میں اس نے پہلے انسان کی آفرینش سے لے اب تک کے، زمین کے کل انسانی باشندگان کے بارے میں گفتگو کی تھی، پھر آج کے انسانوں کی کل تعداد اوران کے مذاہب پر کلام کیا تھا، اس مضمون کے آخر میں اس نے مستقبل کی دینی حالت پر بھی گفتگو کی تھی۔

اس مضمون نگار کے نزدیک از آدم تا ایں دم اس مادر گیتی پر کل اسی ارب انسان رہے ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ کن بنیادوں پر انہوں نے یہ نتیجہ برآمد کیا تھا، ہمیں اس تعداد کو غلط ثابت کرنے اور اس میں کمی بیشی کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔

یہ مضمون پڑھ کر ہمارے ذہن میں تو یہ بات آئی کہ یہ اسی (۸۰) ارب انسان ابھی تک موجود ہیں، فنا نہیں ہوئے ہیں، اور ہم بھی یقیناً اس تعداد میں شامل ہو کر اس میں اضافہ کریں گے، بقول ایک شاعر:

لکل أناس مقبر بفنائهم　　　فهم ينقصون والقبور تزيد

(تمام انسانوں کے لئے ان کے میدانوں میں قبرستان ہیں، ان کی تعداد کم ہوتی رہتی ہے اور قبروں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے)۔

اور اگلے پچھلے تمام انسان ایک دن بیدار ہوں گے، تاکہ وہ مختلف درجات کے حامل مستقبل میں قدم رکھیں، جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے: ”**ربنا إنک جامع الناس ليوم لا ريب فيه إن الله لا يخلف الميعاد**“ (اے ہمارے رب آپ ایک دن یقیناً تمام لوگوں کو جمع کریں گے، بلاشبہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتے)۔

موت وحیات کے درمیان بہت معمولی فاصلہ ہے، ہر لحظہ ہمارے ایسے اقرباء اور اجنبی لوگ راہی آخرت ہوتے ہیں، جنہیں ہم اب تک سنتے اور دیکھتے رہے تھے، حیرت وافسوس کی بات یہ ہے کہ ہم اس پر تھوڑی دیر کے لئے تو توجہ دیتے ہیں، پھر کاروان حیات ہمیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

یہ بات تو بطور جملہ معترضہ آ گئی، آیئے Human Geogrophy کے ایک ماہر کے اس مضمون کی پھر بات کرتے ہیں، اس نے لکھا ہے کہ اس وقت زمین پر پانچ ارب انسان آباد ہیں، جو اسلام، عیسائیت، بت پرستی، کمیونزم اور یہودیت کے پیروکار ہیں۔

اس مضمون نگار کے مطابق عیسائیوں کی تعداد ایک ارب سے متجاوز ہے، اور مسلمان بھی ان سے قریب ہی ہیں، میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے اعداد وشمار میں بہت غلطیاں کی جاتی ہیں، لیکن اس کو اس وقت جانے دیجئے، میں تو اس وقت اس پیشین گوئی پر آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو اس مضمون نگار نے اس مضمون میں کی ہے، اور غالباً اس نے یہ مضمون اسی کے لئے لکھا بھی ہے، اس نے لکھا ہے: یورپ وامریکا میں تحدید نسل کی کوششیں ہورہی ہیں، اکثر مغربی ممالک میں انسانوں کی تعداد اپنی جگہ رکی ہوئی ہے، اس میں معمولی کمی بیشی ہوتی ہے، جب کہ عالم اسلام کے باشندگان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

خدا جانے اس مضمون نگار کی آنکھوں سے یہ بات اوجھل رہی یا اس نے دانستہ اس سے صرف نظر کیا کہ مسلمانوں کے یہاں جنسی تعلقات میں اب بھی پاکدامنی پائی جاتی ہے۔ جب کہ امریکہ ویورپ میں یہ سب قصۂ پارینہ ہوگیا ہے، وہاں لوگوں کی تعداد میں اضافہ رکا ہوا ہے، ساتھ ہی ایڈز جیسے گندے امراض پھیل رہے ہیں۔ ایڈز کے جرثومہ کی دریافت اور اس کے یقینی علاج کے لئے چل رہی کوششوں میں Space Invasion کا سہارا لیا جارہا ہے، یعنی سائنسی ترقی کا استعمال بدکاری کے برے اثرات کو روکنے کے لئے کیا جارہا ہے۔

کیا اس سے بہتر یہ نہ تھا کہ خداوندی احکام پر عمل کیا جاتا اور زبانی و عملی بدکاری کو حرام قرار دے دیا جاتا۔

آخر میں میں اپنے مسلمان بھائیوں سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ دو ارب تک ان کی تعداد جا پہنچنے سے مجھے کوئی خوشی نہیں ہو گی کہ اہمیت عمل کی ہے تعداد کی نہیں۔

ہماری طبیعتوں کے مسخ ہونے کی نوعیت

اپنی قوم کے حالات جاننے کے ساتھ ساتھ دیگر قوموں کے حالات کا بھی علم حاصل کرنے کے لئے میں غیر ملکی نشریات سنتا ہوں، جب میں دیکھتا ہوں کہ سامعین کس قدر موسیقی اور مغربی گانوں کے دلدادہ ہیں تو میری حیرت وافسوس کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

ہمارے شہروں اور گانووں کے خواتین وحضرات کسی فرانسیسی گلوکارہ یا انگریز گلوکار کے نغمے سننے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں، کوئی لڑکی اپنے محبوب کے لئے نغمے نذر کرتی ہے تو کوئی لڑکا اپنی محبوبہ کے لئے۔

آخری درجہ کے افسوس کا مقام تو اس وقت تھا جب اطالوی زبان کی ایک فلم اہرام جیزہ کے پاس دکھائی گئی، اسے دیکھنے ہزاروں لوگ گئے، حالانکہ الحمدللہ انہیں سوائے دھن کے زیر و بم کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

سفید فام گلوکار مائکل جیکسن عربوں سے سخت نفرت کرتا ہے، اس سے کسی نے کہا: عرب تمہارے نغمے بہت شوق سے سنتے ہیں، اس نے کہا: اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں کبھی بھی گلوکاری نہ کرتا، میں نے یہ بات سنی تو کہا کہ یہ گلوکار تو یہودیوں کا خادم ہے، اور یہ اس قابل ہے کہ عرب اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں، لیکن موسیقی کے دلدادوں کا نہ کوئی دین ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں غیرت سے کوئی حصہ ملتا ہے۔

ہماری امت کے مختلف طبقات کی فطرت کے اس طرز پر مسخ ہونے کی بابت میں نے بہت غور وخوض کیا، یہ مسخ ہونا ویسا ہی ہے جیسے یہود کو اللہ نے کو بندر اور خنزیر بنا دیا تھا!

فطرت کے مسخ ہونے کی اس نوعیت کا آغاز ہمارے یہاں کے ان تعلیم یافتگان سے

ہوا جو اپنی زبان کو حقیر جانتے ہیں، اپنے ادبی ذخیرہ کو بے وقعت سمجھتے ہیں، اور ان کے نزدیک غیروں کی زبان بولے بغیر اور غیروں کے طریق اپنائے بغیر ان کی کوئی عزت نہیں ہے۔

امت احساس کمتری کا شکار ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو اس سوختے جیسا سمجھنے لگی جو خالی ہونے کی وجہ سے گردو پیش کی ہر چیز کو جذب کر لیتا ہے۔

رعنائی ودانائی سے لبریز عربی اشعار روزمرہ کی گفتگو سے غائب ہو گئے، کل ہم زبان کی جنگ لڑتے تھے تو آج بچوں کے لئے ایسے اسکول بناتے ہیں جن میں عربی زبان کو مؤخر کر کے پہلے دوسری زبانیں پڑھائی جائیں۔

مختلف زبانوں کا علم رکھنے کے ہم مخالف نہیں ہیں، لیکن ہمیں افسوس اس وقت ہوتا ہے جب ہم عرب بچوں کو غلط سلط عربی بولتے ہوئے اور نہایت اچھی انگریزی یا فرنچ بولتے ہوئے سنتے ہیں، عربی کی کوئی عزت نہیں رہی، اس کا کوئی پاسبان نہیں ہے، اور کسی خاص وعام کو اس سے ناواقف ہونے پر ملال نہیں ہوتا۔

آج ریڈیو پر قاہرہ کے بولاق، بیروت کے باسطہ اور الجزائر کے قصبہ سے ایسے لوگوں کی آواز سننے کو ملتی ہے جو پوپ کے نغمے یا راک وال رول کی موسیقی خود سننا چاہتے ہیں یا اپنے محبوب کو سنانا چاہتے ہیں۔

اللہ ایسوں کے ناک کان کاٹ دے اور انہیں بہرہ کر دے۔

زبان، ادب اور آرٹ کے میدان میں ہماری امت زبردست زوال کا شکار ہے، اگر ہم نے ابھی فکر نہ کی تو ہم ایسے قعر ذلت میں ہوں گے جہاں سے نکلنا بہت مشکل ہوگا۔

دین کی بابت تھیچر اور ہمارے نظریات

اسکاٹ لینڈ میں ایک لیکچر دیتے ہوئے مارگریٹ تھیچر نے اپنے سیاسی نظریہ اور دینی عقیدہ کے درمیان گہرے تعلق کی وضاحت کی ہے۔ان کے مخالفین نے ان پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے دلوں میں خودغرضی اور لالچ کے جذبات بھڑکائے ہیں، اور اکثریت کو دام و درم کا اسیر بنادیا ہے۔

اس خاتون قائد کا کہنا ہے کہ وہ سب کو مالدار دیکھنا چاہتی ہیں، انہوں نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ وہ لوگوں کو دام و درم کا بندہ بنانا چاہتی ہیں، انہوں نے کہا کہ انکی خواہش یہ ہے کہ ہرفرد کو اپنی ضرورت اور راحت کے لئے کافی مال حاصل ہو، اور وہ معاشرہ کے لئے مفید بن کر اس کی ضرورتوں کی تکمیل کرے۔

ان کے اس لیکچر کا جو خلاصہ بی بی سی نے پیش کیا ہے اس کی روشنی میں مجھے ایسا لگا جیسے وہ ان احادیث نبویہ کی تشریح کررہی ہیں: ''**نعم المال الصالح للعبد الصالح**'' (نیک بندے کو ملنے والا پاکیزہ مال کتنا اچھا ہے) ''**إن اللّٰه يحب التقى الغنى**' (اللہ متقی مالدار کو پسند کرتا ہے) ظاہر ہے کہ انہیں ان اسلامی روایات کا کوئی علم نہیں ہے، یہ باتیں ان سے بس ان کی فطرت اور ذہانت نے کہلوائی ہیں۔

خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر سے دین بیزاری کے الزام کو مسترد کرتے ہوئے عیسائیت پر اپنے ایمان کا تذکرہ کیا۔

میں نے ایک عظیم ملک کی سربراہ حکومت کے اس بیان اور اپنے یہاں کے وزیر ثقافت کے بیان کے درمیان موازنہ کیا تو احساس ذلت نے آگھیرا، ہمارے وزیر ثقافت نے کہا تھا:

''انتہا پسندی سے مقابلے کا میرا طریقۂ کار یہ ہے کہ معاشرہ میں مقبول ایمان بالغیب کی جگہ نظریۂ مادیت کو دلائی جائے۔'' اس کے بعد موصوف نے کہا تھا: غیب پر عقیدہ شدت پسندی کا سبب ہے، اور نظریہ مادیت ثابت قدم بناتا ہے۔

یہ پوری گفتگو نہایت غلط ہے، غیب کا انکار پورے دین کا انکار ہے، اور یہ دعویٰ کہ دین شدت پسندی اور الحاد دفاع کا باعث ہے، نہایت غلط دعوی ہے، غیبی حقائق پر ایمان کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والے ان وزیر صاحب کے ذہن میں جو بات آئی ہے وہ نہایت قابل مذمت ہے، اور اس کا دینی احکام سے یا ان حالات سے کوئی واسطہ نہیں ہے جن کی وجہ سے پورا معرکہ وجود میں آیا ہے۔

ہم بعض نوجوانوں کے اس قول کو مسترد کرتے ہیں کہ ہر طرح کی تغنی حرام ہے، لیکن ہم اس سے زیادہ زوروں سے اس شخص کے کلام کو مسترد کرتے ہیں جو عقیدۂ غیب پر اس طرح کا کلام کرتا ہے۔

ایک ذمہ دار فرد کی جانب سے اس احمقانہ بات کے سامنے آنے پر ابھی میں حیرت میں ہی تھا کہ مشہور صاحب قلم مصطفیٰ امین کے یہ جملے پڑھنے کو ملے: ''جب ہم کوئی نیا وزیر بناتے ہیں تو ہم قوم کو بتانا چاہتے ہیں کہ یہ وزیر صاحب کون ہیں؟ عام طور پر لوگوں کو غیر معروف وزراء کی تعیین کا منظر دیکھنا پڑتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ وزیر صاحب زمین کا پردہ چاک کر کے بھی ابھی برآمد ہوئے ہیں۔ اگر یہ نئے وزیر صاحب ماضی میں ''حدتو'' نامی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہوتے ہیں تو ہم یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں تا کہ عوام کو معلوم ہو جائے کہ پاس ہونے والی تجویزوں اور بننے والے قوانین کا راز کیا ہے۔ اگر وزیر صاحب کا تعلق طلیعی تنظیم سے ہوتا ہے تو قوم کو بتایا جاتا ہے کہ یہ اس تنظیم کے رکن ہیں جس نے کبھی مصر پر حکومت کی تھی۔''

میں کہتا ہوں کہ اس تنظیم نے مصر پر منحوس دنوں میں حکومت کی تھی، کیا یہ بات حیرت

ناک نہیں ہے کہ انگلینڈ جیسا بڑا ملک تو غیبی عقائد سے اپنا تعلق جوڑے، اور اپنی ثقافتی وروحانی میراث کا خیال رکھے، لیکن وہ مصر جو "تن ہمہ داغ داغ شد" کا مصداق ہے اور قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہے اس کا وزیر ثقافت غیبی عقائد سے اظہار براءت کرتا ہے، سچ یہ ہے کہ ہم نے دنیوی اسباب ترقی اور آسمانی برکتوں کے ذرائع سے بیک وقت دشمنی مول لی ہے، پھر ان حالات سے نجات پائیں تو کیسے؟

ایڈز اور ہم جنسی پرستی کی آزادی

ایڈز کا دائرہ بڑھتا چلا جارہا ہے، اس کے خلاف چلائی جارہی مہم کے اخراجات میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے، اور یورپ وامریکہ کے غریب ممالک کے لئے اس مہم کے خرچے ناقابل تحمل ہوتے جارہے ہیں۔

کوسٹاریکا کے نمائندے لیونارڈماتا نے ایک طبی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: وسطی امریکا کے ممالک کی صحت سے متعلق وزارتیں اس مرض سے نپٹنے اور اس پر روک لگانے سے قاصر ہیں، انہوں نے اس بات پر پریشانی کا اظہار کیا کہ یہ ملعون مرض اب باہر سے آنے والا مرض نہ رکر خود ان ممالک کا مرض بن گیا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ ہم جنسی پرستی اور زنا سے پرہیز نہیں کررہے ہیں، اور اس خبیث مرض کے یہی دو بنیادی اسباب ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو بھی اس وبا کا سامنا ہے، اور وہ اس مرض کی دوا بھی ایجاد کرنا چاہتا ہے، اور اسے اس مرض کی بابت اتنی فکر ہے کہ اس کی ایک خلائی شٹل ایک متاثرہ خلیہ میں اس مرض کے جراثیم کو خلا میں لے گئی، تاکہ یہ جانا جاسکے کہ اس پر خلا کے کیا اثرات پڑتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہاں اس سے نپٹنے کا کوئی ذریعہ مل جائے۔

اگر سائنسدانوں نے اس مرض کی کوئی دوا ایجاد کر لی تو ہمیں بہت خوشی ہوگی، ہم ہر مبتلا شخص کے تئیں رحم کے جذبات رکھتے ہیں، اور ہماری کوشش ہے کہ ہم زخم خوردوں کو استقامت کی راہ دکھائیں تاکہ ان کے لئے ایک جائے پناہ وعافیت ہاتھ آسکے، ہماری دعا بھی یہی ہے کہ اللہ روحوں اور جسموں کے مریضوں کو عافیت دے تاکہ وہ تائب ہوکر اللہ کے حضور میں حاضر ہوں۔

ایڈز مادیت سے بھرپور اور روحانیت سے عاری تہذیب کا ایک عطیہ ہے۔ اس گندی

اور گھنونی مصیبت کا زیادہ اثر اسلامی ممالک میں نہیں ہے، اس لئے کہ ان ممالک میں کسی نہ کسی حد تک اسلامی احکام پر عمل ہے، نیز لواطت وزنا سے زبردست نفرت کی جاتی ہے، اور یہ دونوں جرم مغرب میں بہت پائے جاتے ہیں، وہاں اہل کتاب اپنے کم امکانات اور کمزور وراثت کی وجہ سے جنسی شہوت کی بے راہ روی کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں۔

ہم -داعیان اسلام- کو اس بات سے سخت قلق ہوتا ہے کہ ہمارے ممالک میں بھی ثقافتی جنگ کی آہٹ سنائی دینے لگی ہے، یہ جنگ ہمارے یہاں کے باقی ماندہ دین اور عفت کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔

مجھے اس وقت سخت تکلیف ہوئی جب میں نے ایک کثیر الاشاعت روزنامہ میں ایڈز کے بارے میں ایک مضمون کے اندر یہ جملہ پڑھا: ''یہ عالمی مسئلہ ہے جس کے شخصی آزادی، اور ممالک کی سلامتی واستحکام سے جڑے متعدد پہلو ہیں......''۔

کیا اس گندے مرض کے یہی خطرات ہیں؟ یہ کون سی شخصی آزادی ہے جس کا تذکرہ یہ مضمون نگار کر رہا ہے، کیا زنا، ہم جنسی پرستی اور مردوں کے لئے عورت بننے کی آزادی مراد ہے؟

اللہ، آخرت اور انسانی اخلاق کریمانہ سے بے زار قلموں کو یا تو ٹوٹ جانا چاہئے یا پھر کہیں کسی گوشہ میں خاموش رہنا چاہئے، کہ ایسے قلموں کا بقاء دنیا کے ہر خیر کے لئے قاتل ہے۔

نشہ کی وبا

عصر حاضر کے مفکرین نشہ کی مختلف قسموں کے بڑھتے استعمال پر فکر مند ہیں، ان کے نزدیک ان اشیاء کا استعمال ہماری قوم کے لئے نہایت خطرناک بلکہ اس کے حال و مستقبل کے لئے قاتل ہے۔

میں نے اس وبا کے بارے میں غور کیا تو اس نتیجہ تک پہنچا کہ اگر یہ برائی ہم میں نہ آئی ہوتی، تو اس جیسی کوئی اور برائی نے ضرور ہم کو آگھیرا ہوتا، اس لئے کہ جس طرح جسم قوت مدافعت سے محروم ہو جاتے ہیں اسی طرح قومیں اخلاقی قوت مدافعت سے بھی محروم ہو جایا کرتی ہیں، اور دونوں صورتوں میں انسانیت گردوپیش کی مصیبتوں کا نشانہ بن جاتی ہے۔

نفسیاتی یا اخلاقی قوت مدافعت سے محرومی کا اصل سبب غلط تربیت، اور بچے کا اس طرح پرورش پانا ہے کہ اس کا پاکیزہ اخلاق، عبادت، اور عقل وطرز زندگی کی حفاظت کرنے والی ان اقدار وروایات سے کوئی تعلق نہ ہو جو اس کے اندر تمیز خیر وشر، اور اس کی نگاہ میں قابل احترام اچھے شخص اور ناقابل التفات برے آدمی کے درمیان فرق پیدا کریں۔

اس اخلاقی تربیت کا پہلا منبع بلا شبہ خاندان ہے، خاندان کی ذمہ داری محض بچے پیدا کرنا نہیں ہے، اس لئے کہ چوپائے، پرندے اور کیڑے مکوڑے بھی یہ کام تو کرتے ہی ہیں، انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بچوں کی تربیت وتعلیم کی بھی فکر کرتا ہے، اگر خاندان بچپن کی حفاظت اور بچوں کو بلند اقدار کا حامل بنانے کی استطاعت نہ رکھے تو پھر اس کی اولاد بے قیمت ہے۔

ایک مرتبہ میرے ان خیالات کو سن کر ایک شخص نے کہا: آپ کا کہنا بجا ہے، لیکن جس قوم نے اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کر دیا ہو کیا آپ اس کے کسی خاندان سے یہ توقع کر سکتے ہیں

کہ وہ اپنی ذمہ داری نبھائے گا؟ پہلے امت کو اپنی زبان، اپنے متعلقات، اپنے دینی انتساب اور اپنی قومی خصوصیات کا احترام کرنا ہوگا، ہم نے اپنی زبان اور اپنی روایات کو فراموش کر دیا ہے، ہم اپنے تعارف میں اگر اسلام کا تذکرہ کرتے بھی ہیں تو بہت بعد میں، اور اس سے پہلے اپنے افریقی یا ایشیائی ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ میں نے جلدی سے ان کی گفتگو بیچ میں روک کر کہا: میں اس وقت اس مسئلہ میں الجھنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ پوری قوم کے بگاڑ کے اثرات گھر اور بچوں کی تربیت پر پڑتے ہیں۔

ہمیں حکومت کو اس کے فرائض یاد دلانے چاہییں، لیکن اس سے پہلے والدین کو اپنے گھر کے اندر کی ذمہ داریاں نبھانی ہوں گی، مثلاً اگر ٹیلی ویژن پر کوئی مخرب اخلاق قصہ یا بے حیا منظر آنے لگے تو انہیں اٹھ کر اسے بند کر دینا چاہئے، اور اس کی برائی بتانی چاہئے۔

سگریٹ نوشی کرنے والے باپ کی اولاد اگر سگریٹ نوشی کرنے لگے تو پھر باپ کو صرف اپنے آپ کو ہی کوسنا چاہئے، اسی طرح آپسی گفتگو میں اچھے اور معیاری الفاظ ہی استعمال کرنے چاہییں، اگر غیر معیاری الفاظ استعمال کئے جائیں تو پھر اولاد کی زبان سے بھی ایسے ہی الفاظ سن کر والدین کو حیرت نہ ہونی چاہئے۔

ہم آج تک مہنگے کپڑوں اور بڑی دعوتوں پر بے تحاشا پیسے خرچ کرتے ہیں، لیکن ذاتی ذخیرہ کتب کے قیام کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔

ہم اپنے بچوں کو سڑکوں اور گلیوں نیز برے دوستوں کے حوالے کر دیتے ہیں، گویا کہ ہمیں ان کے مستقبل کی کوئی فکر ہی نہ ہو، میں نے نشہ کے عادی نوجوانوں سے بات کی تو یہ حیرت ناک بات سامنے آئی کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے نشہ کا عادی ہونے کا سبب اپنے کسی دوست کو بتایا، جس نے پہلے تو اسے دھوکہ دے کر نشہ کرایا اور پھر نہایت خراب انجام تک پہنچایا۔

جائے افسوس ہے کہ یہودیوں کا طریق تربیت بالکل دوسرا ہے: اپنی تاریخ، عہد نامۂ

قدیم کے واقعات، دسیوں صدی قبل کے واقعات، اپنی زبان، دینی حمیت، زوجین کے درمیان کھیت، کارخانہ اور دفتر میں زبردست تعاون اور تفریح کے اوقات کی تعیین، تاکہ یہ تفریح مفید و پرمشقت کاموں کے طویل اوقات کے لئے مددگار ہو، یہودیوں کی گھریلو واسکولی تربیت کے یہ عناصر ہیں، عربوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لئے بنی اسرائیل کی یہ تیاریاں چل رہی ہیں۔

باب چهارم

قابل اصلاح غلط فہمیاں

قوامیت کا مطلب غلبہ واستبداد نہیں ہے

کیا مرد کی اپنے اہل خانہ پر قوامیت اسے ان پر استبداد وغلبہ کا حق دیتی ہے؟ بعض لوگ اسی غلط فہمی کے شکار ہیں، مسلم خاندان میں ایک چیز ''حدود الله'' نامی ہوتی ہے، میں نے قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھا کہ یہ لفظ دو آیات میں چھ مرتبہ آیا ہے۔

یہ دو آیات مسلم خانوادہ کو بکھرنے سے بچاتی ہیں، اور اس کے بکھر جانے کی صورت میں تلافی مافات کا سامان کرتی ہیں تاکہ وہ ختم نہ ہوجائے۔ یہ دو آیات یہ ہیں: ''**الطلاق مرتان فامساک بمعروف أو تسریح بإحسان ولا یحل لکم أن تأخذوا مما آتیتموهن شیئا إلا أن یخافا ألا یقیما حدود اللّٰه فإن خفتم ألا یقیما حدود اللّٰه فلا جناح علیهما فیما افتدت به تلک حدود اللّٰه فلا تعتدوها ومن یتعد حدود اللّٰه فأولئک هم الظالمون فإن طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره فإن طلقها فلا جناح علیهما أن یتراجعا إن ظنا أن یقیما حدود اللّٰه وتلک حدود اللّٰه یبینها لقوم یعلمون**'' (طلاق دو بار ہے، پھر یا تو صحیح طریقہ سے عورت کو روک لیا جائے یا اچھے طریقے سے اسے رخصت کردیا جائے، اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس لے لو، البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو، ایسی صورت میں اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے، تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہوجانے میں مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرلے، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں، پھر

اگر (دو بار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی، تو وہ عورت پھر اس کے لئے حلال نہ ہوگی، الا یہ کہ اسکا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے، تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود الٰہی پر قائم رہیں گے، تو ان کے لئے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جنہیں وہ ان لوگوں کی ہدایت کے لئے واضح کر رہا ہے، جو [اس کی حدود کو توڑنے کا انجام] جانتے ہیں)۔

چند سطروں کے اندر جن ''حدود'' کا تذکرہ چھ مرتبہ آیا ہے، یہ کون سی حدود ہیں؟ ان سے مراد وہ ضابطے ہیں جو گھر کو انتشار یا اس کے کسی ایک فرد کو حقیر و کمزور سمجھے جانے سے روکتے ہیں، یہ فطرت، عقل اور وحی سے ہم آہنگ وہ ضابطے ہیں جو لوگوں کے درمیان انصاف کے پیمانے قائم کرتے ہیں، ایک گھر بھیڑیوں کا بل یا جانوروں کا جنگل نہیں ہوتا ہے۔

مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد کی حیثیت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس مختصر سے جملے میں واضح کر دی ہے،: ''هن لباس لكم وأنتم لباس لهن'' (وہ عورتیں تم مردوں کا لباس ہیں، اور تم مردان عورتوں کا لباس ہو) ان دو صنفوں کے درمیان ایسا تعلق ہی ان دونوں کو دو قالب اور ایک جان بنا دیتا ہے، یہ کیفیت شہوانی جذبات سے حاصل نہیں ہوتی ہے، کہ ایسے جذبات پوری زندگی کے لئے رشتے تعمیر نہیں کرتے ہیں، مذکورہ بالا آیات میں جن ''حدود خداوندی'' کا تذکرہ بار بار آیا ہے ان کی تشریح کرتے ہوئے عظیم مفسرین نے مسلم گھرانے کے ماحول پر بہت گفتگو کی ہے، ان حضرات نے سب سے زیادہ ظلم سے خبردار کیا ہے، صاحب منارؒ لکھتے ہیں: ''......ظلم انسانیت کے لئے سب سے بڑی مصیبت اور قوموں کی ہلاکت کا سامان ہے، زوجین کا ایک دوسرے پر ظلم حکمراں کے ذریعہ رعایا پر کئے جانے والے ظلم سے کہیں زیادہ مفسدہ کا باعث اور جلد تباہی لانے والا عمل ہے، اس لئے کہ زوجین کا رشتہ ہی سب سے زیادہ مستحکم

اور فطرت انسانی سے سب سے زیادہ وابستہ رشتہ ہے، لہذا اگر یہ فطرت فاسد ہوئی تو یہ رشتہ بھی جاتا رہے گا، پھر امت کو اللہ کے غیض وغضب اور اس کی ناراضگی سے کیا چیز بچائے گی، حدود الٰہی سے یہ تجاوز انسانوں کے لئے دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی بھی تباہی لاتا ہے، آج رشتہ ازدواج جس قدر کمزور ہو گیا ہے اسلام کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، اس کی وجہ زوجین کی فطرت کا فساد اور دونوں کی جانب سے حدود الٰہی سے تجاوز ہے''۔

سچی بات یہ ہے کہ گھر کے اندر کا ماحول باہر کے ماحول سے متأثر ہوتا ہے، غیروں کی نقالی، جہالت اور اسراف کی آندھی اگر باہر چلے گی تو گھر کے اندر بھی اس کے اثرات ضرور آئیں گے، اور اگر اللہ نے حفاظت نہ کی تو پھر اس کے اثرات سے بچ پانا نہایت مشکل ہے۔

ہماری خواہش یہ ہے کہ مسلمان پہلے حدود الٰہی کو قرآن مجید کے بیان اور حدیث نبوی کی تشریح کے مطابق قائم کرنے کا عزم کرلیں، میرا خیال ہے کہ دونوں صنفوں میں فقہی، اخلاقی اور طرز عمل کی بہتری آنے سے گھر کے اندر اور باہر سلامتی کی راہیں کھلیں گی، مرد عورت کو اس کے دائرہ کار میں آزادی دے گا، اور عورت مرد کو سربراہ خانہ بنائے گی، کہ وہی زندگی کے مسائل کا مقابلہ کرنے کا اہل ہے۔

گھر چونکہ ایک تربیتی ادارہ یا اقتصادی کمپنی ہے اس لئے اس کا ایک سربراہ ہونا لازمی ہے، لیکن سربراہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مشورے، باہمی افہام وتفہیم، تبادلۂ خیال اور اچھے انجام کی تلاش کو ترک کردیا جائے۔

یہ قانون زندگی کے ہر پہلو میں قائم ہے، تو پھر گھر اس سے مستثنیٰ کیوں ہو؟

مسلمانوں کا ایک وصف قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ وہ آپس میں مشورے کرتے ہیں (وأمرهم شوریٰ بينهم) خیال رہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی تھی، اور وہاں مسلمانوں کو عسکری یا دستوری مسائل درپیش نہیں تھے، آیت کے عموم میں گھر یقیناً داخل ہے، محترم احمد موسیٰ

سالم لکھتے ہیں: مرد کی قوامیت کا مطلب اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ چونکہ اس کے اوپر متعدد ذمہ داریاں ہیں، خاندان کے مصالح کے حصول اور اس کی حفاظت کے لئے صرف وہی سرگرداں رہتا ہے اس لئے مشورہ کے بعد فیصلہ کن بات اسی کی ہوگی بشرطیکہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جو شریعت کے خلاف ہو، فطرت سے متصادم ہو، کسی کی حق تلفی کا سبب ہو یا بیوقوفی اور فضول خرچی پر مبنی ہو، بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر شوہر غلط بات کرے تو وہ اس کو سمجھائے، اس کی رائے پر عمل نہ کرے، اس پر اپنے صحیح اعتراض کو اپنے اور اس کے گھر والوں کے سامنے فیصلہ کے لئے پیش کرے یا پھر معاشرہ کی حکمراں جہت سے رابطہ قائم کرے، اور شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ حدود الٰہی کو قائم کرے"۔

یہ ایک اچھا کلام ہے، لیکن اس موقعہ پر میں چند باتوں کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:

۱- نفقہ کی تمام تر ذمہ داری مرد کی ہے، گھر پر عورت کے ذریعہ اپنا مال خرچ کیا جانا عارضی اور غیر لازمی ہے، اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے قیمتی اوقات اولاد کی تربیت اور ان کی علمی واخلاقی نگرانی میں صرف کرے۔

۲- بچوں کے لئے اصل تربیت گاہ گھر اور آغوشِ مادر ہی ہے، چائلڈ ہومس کا اس سلسلہ میں استعمال بس بوقت ضرورت ہی ہونا چاہئے۔

۳- اسلام نے محرمات کے ارد گرد نہایت بلند فصیلیں تعمیر کردی ہیں، جن سے ناواقف صرف نشہ میں مدہوش اور آخری درجہ کا بے دین ہی ہوسکتا ہے، وہ مغربی تہذیب جس نے ہر مرد کے لئے یہ موقعہ فراہم کیا ہے کہ وہ کسی بھی عورت کے ساتھ رقص وسرور کرتا پھرے، خواہ اس کے شوہر نے اجازت دی ہو یا نہیں، اس تہذیب کو ہمارا دین کلی طور پر مسترد کرتا ہے، کسی مرد یا عورت کو حدود اللہ سے تجاوز یا اللہ کے حرام کردہ امور کے ارتکاب کی اجازت نہیں ہے۔

۴- خاندان معلوم سرحدوں کی ایک مملکت ہے، ان سرحدوں کی حفاظت اسی طرح کی جانی چاہئے جس طرح ملکوں کی سرحدوں کی کی جاتی ہے، گھر موجوں بھرے سمندر پر تعمیر نہیں ہوتے ہیں، اور نہ ہی وہاں ہر متعلق وغیر متعلق شخص کے لئے اذن عام ہونا چاہئے۔

شادی کے متعدد فقہی، سماجی اور تربیتی پہلو ہیں، ہمیں ان پہلوؤں کا اور ان کے ساتھ ساتھ مرد کی قوامیت کا علم ہونا چاہئے۔

اگر ہم ایک ایسا اسلامی ''علم سماجیات'' تشکیل دیں جس میں گھر سے متعلق تمام مسائل اور مختلف لوگوں کے درمیان تعاون وتعلقات کی صورتیں زیر بحث آئیں تو پھر ہم شادی کے مذکورہ بالا پہلوؤں اور مرد کی قوامیت کو صحیح طریقہ پر سمجھا سکیں گے، لیکن اس میدان میں اب تک ہم غیروں کے تشکیل کردہ علم کے ترجمہ اور اس کی تقلید پر اکتفا کئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، حالانکہ انسانی علوم نے متعلق پہلوؤں سے گھر کو اپنا موضوع بنایا ہے، اور علم قانون سے پہلے علوم تربیت، اخلاق، اقتصادیات وسماجیات گھر کے معاملات سے بحث کرتے ہیں۔

بعض فقہاء کے ذریعہ شادی کی یہ تعریف کئے جانے پر کہ وہ ''ایک ایسا عقد ہے جو عورت سے ہم بستری کو جائز قرار دیتا ہے''، بعض غیر تمند عورتوں میں شدید ناراضگی پائی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ تعریف زوجین کے تعلقات کی وسعت بیان کرنے سے قاصر ہے، یہ تو بس قانونی پہلو بیان کرتی ہے، دیگر علوم انسانی سے متعلق شادی کے پہلوؤں پر بالکل بھی روشنی نہیں ڈالتی، شادی عورت کے جسم سے لذت اندوزی حاصل کرنے کے عقد سے کہیں زیادہ عظیم عقد ہے، ''**والله جعل لكم من أنفسكم أزواجا، وجعل لكم من أزواجكم بنين وحفدة ورزقكم من الطيبات أفبالباطل يؤمنون وبنعمة الله هم يكفرون**'' (اور اللہ نے تم میں سے ہی تمہارے لئے جوڑے بنائے، اور تمہارے جوڑوں سے بیٹے اور پوتے بنائے اور تمہیں پاکیزہ رزق دیا کیا پھر بھی یہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے

ہیں)۔

ایک عورت نے بہت غصہ میں مجھ سے کہا: ''کیا اگر مجھ میں اور میرے شوہر میں بحث ہو جائے، میں حق پر ہوں اور پھر بھی شوہر ناراض ہو جائے تو کیا اس صورت میں بھی میں رحمت خداوندی سے محروم ہوں گی، اور فرشتے مجھ پر لعنت بھیجیں گے اور ......''، میں نے اس کی بات جلدی سے کاٹتے ہوئے اسے سمجھایا کہ جس حدیث سے اسے غلط فہمی ہوئی ہے، اس کا کہیں سے بھی یہ مطلب نہیں ہے، حدیث میں تذکرہ اس عورت کا ہے جو شوہر کو اپنے آپ سے جنسی تقاضوں کی تکمیل نہ کرنے دے، حالانکہ عورت کو ان کی تکمیل کی ضرورت ہے، اور اس طرح یہ عورت اپنے شوہر کو گویا کہ گناہ کے دہانے تک پہنچا دے۔

اسلام کی بنیاد عقل وفطرت کی حقیقتوں پر ہے، اس لئے کہ اسلام وہی فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

عورت اپنے شوہر کے انتخاب میں آزاد ہے

اس وقت متعدد مذاہب کے درمیان اپنے آپ کو زیادہ بہتر ثابت کرنے کا ایک مقابلہ چل رہا ہے، لیکن بڑی حیرت کی بات ہے، بعض مسلمان اس صورت حال سے صرف نظر کرتے ہوئے ایسی حماقتیں کررہے ہیں، جن کا نقصان ان کے دین کو اٹھانا پڑتا ہے، یہ حماقتیں لوگوں کو دین سے روکتی ہیں۔ ایسے لوگ نفسیاتی طور پر یہ سوچ کر مطمئن رہتے ہیں کہ اسلامی عقائد وتعلیمات برحق ہیں، لہذا لوگوں کو ہر حال میں ان پر ایمان لے آنا چاہئے۔

یہ آخری درجہ کی نادانی اور خام خیالی ہے، بہترین مال بری طرح پیش کئے جانے اور اشتہار میں کمی کرنے کی وجہ سے بازار میں بے حیثیت وکم قیمت ہوجاتا ہے، اور دوسری وہ چیزیں بازار میں اس سے سبقت لے جاتی ہیں جن کے مالکوں نے ان کا اچھی طرح اشتہار کیا ہوتا ہے، اورانہیں جاذب نظر بنایا ہوتا ہے۔

عصر حاضر کی تہذیب نے انسانیت کو اپنا شعار اور حقوق انسانی کو بین الاقوامی تعلقات کی اساس قرار دیا ہے، اس نے اجتماعی انصاف اور اچھی صحت وثقافت کو نمایاں اہمیت دی ہے۔

یہ تہذیب اس سلسلہ میں دھوکہ باز یا کوتاہ عمل ہوسکتی ہے، لیکن ان باتوں کو کہنے سے ان چیزوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا جن پر اور جن کے احترام پر عالمی مجلسیں متفق ہیں۔

وہ حضرات جو اسلام کی بابت ایسی گفتگو کرتے ہیں جس سے اسلام فطرت کے اصولوں اور انسانی احساسات کی رعایت سے محروم معلوم ہوتا ہے، ان کی اس گفتگو سے کس کو فائدہ پہنچتا ہے؟

آخر کس کے کہنے پر ثانوی درجہ کے مسائل میں تو اسلام کی آواز بہت پر جوش انداز

میں سنائی پڑتی ہے، لیکن اساسی نوعیت کے مسائل میں اس کے سننے کو کان ترس جاتے ہیں؟

آخر کس کی خاطر بعض لوگ مختلف آراء میں سے ایک اختیار کر کے یا مختلف اقدار میں سے کسی ایک کا احترام کر کے وسیع اسلام کو اپنی تنگ رائے سے ہی عبارت بتاتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ان کے معاشرے کے رواج ہی خداوندی ہدایات اور آسمانی ہدایات ہیں۔

ایسے ہی ایک صاحب سے میں نے کہا: اسلام کا دامن بڑا حسین ہے، لیکن وہ تم لوگوں کی گفتگوؤں سے داغدار نظر آتا ہے، تمہارے لئے بہترین کارِعبادت یہ ہے کہ تم بالکل خاموش رہو، اور ایسے مسائل میں ایک حرف زبان سے نہ نکالو، ہر وہ گفتگو جس سے سیاسی استبداد کو مدد ملے یا جو سماجی ظلم، ثقافتی وتہذیبی پسماندگی کو مدد دے اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے اور اسلام نفسیاتی وعقلی صحت سے عبارت ہے۔

میں کنیڈا کے ایک شخص سے گفتگو کر رہا تھا، اس نے مجھ سے عورت کے تئیں اسلام کے ''تنگ موقف'' کی بابت سوال کیا تھا، اس گفتگو کے دوران میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ: اسلام نے عورت کو شوہر کے انتخاب کا حق دیا ہے، اسے کسی ایسے شخص کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جسے وہ ناپسند کرتی ہو، اسے نکاح کا عقد خود کرنے یا دوسرے کو اپنا وکیل بنانے کی اجازت ہے۔

ایک صاحب اس گفتگو کو سن رہے تھے، وہ میری اس بات پر ناراض ہوئے، لیکن الحمدللہ خاموش رہے، جب یہ گفتگو ختم ہوگئی تو وہ میرے پاس آئے اور بڑے سلیقہ سے بولے: عورت خود نکاح کا عقد نہیں کر سکتی ہے، اسلام اس کے خلاف ہے۔

میں نے ان صاحب سے کہا: آپ کی رائے اس کے خلاف ہے، آپ نے اس مسئلہ میں چند فقہی مسالک کا اتباع کیا ہے، اور میں نے دوسرے نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے، میرے نزدیک دوسرا نقطۂ نظر ہی ان امریکیوں ویورپیوں کے لئے زیادہ قابل قبول ہے، متعدد قابل احترام اسلامی حلقوں میں اس پر عمل چل رہا ہے، اور اسلام کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ یہ دائرہ مزید

وسیع ہو۔

اسلام کو اس وقت ایک بہت بڑی مصیبت یہ درپیش ہے کہ اس کے بعض متبعین چند فروعی اختلافی فقہی آراء سے چمٹے رہتے ہیں، اور ان کے اس رویہ سے اسلامی عقائد و عظیم اقدار کی تبلیغ کو نقصان پہنچتا ہے، ظاہر ہے جو شخص کسی ایک دوکان کو دوسری دوکان پر یا کسی ایک ایجنٹ کو دوسرے ایجنٹ پر ترجیح دینے کی وجہ سے پورا بازا کھو دے وہ تاجر نہیں کہلائے گا۔

عورت کا سفر

عورت کے تنہا سفر کرنے کی بابت شرعی حکم ایک محتاج غور وفکر موضوع ہے، اس سلسلے میں آغاز سفر سے لے کر منزل تک پہنچنے کے تمام مراحل کا تجزیہ لازمی ہے، یہ بدشگونی، تہمت اور گمانوں کے اتباع کا محل نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق اطمینان، ناموس اور احتیاط کے قبیل سے ہے، امام بخاری اور امام مسلم کی روایت کردہ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ میری بیوی حج کے لئے سفر کرنا چاہتی ہے، اور میں نے اپنا نام فلاں غزوہ کے لئے لکھا دیا ہے، آپ نے فرمایا بیوی کے ساتھ حج کے لئے جاؤ۔

ایک شخص کو اس لئے جہاد سے روک دینا کہ وہ حج کے سفر میں بیوی کے ساتھ رہے کچھ بتاتا ہے، معروف شرعی قاعدہ ہے: ''دفع مفاسد مصالح کے حصول پر مقدم ہے'' عورت کے تنہا دن اور رات میں سفر کرنے کی صورت میں اس بات کا ڈر ہے کہ شر پسند عناصر اور ڈاکو اس پر حملہ کر سکتے ہیں، اور دنیا میں ہمیشہ ایسے اوباش لوگ پائے جاتے رہے ہیں جو عورت کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اسے اغوا کرنے کا موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔

لیکن اگر کسی زمانہ میں امان عام ہو تو پھر عورت کے تنہا سفر کا کیا حکم ہے؟ بعض ائمہ نے ایسے ساتھیوں کے ساتھ عورت کے تنہا سفر کی اجازت دی ہے جن پر اطمینان ہو، اس لئے کہ ایسے قافلہ کے ساتھ ہونے سے خدشات دور ہو جاتے ہیں، ان حضرات کا استدلال غالباً حضرت عدی بن حاتم کی اس روایت سے ہوگا جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ: میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر تھا، آپ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے فاقہ کا شکوہ کیا، ایک دوسرا شخص آیا اس نے بتایا کہ اسے راستہ میں لوٹ لیا گیا ہے، یہ بات اسلامی حکومت کے استحکام اور پورے جزیرہ میں

امن عام ہونے سے پہلے کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عدی! کیا تم نے حیرہ دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا: دیکھا تو نہیں ہے، البتہ اس کی بابت سنا ہے، آپ نے فرمایا: اگر تمہاری زندگی نے وفا کی تو تم دیکھو گے کہ ایک عورت حیرہ سے چل کر خانہ کعبہ کے طواف کے لئے آئے گی اور اسے سوائے اللہ کے کسی کا خوف نہ ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا: اس وقت بنو طی کے ڈاکو کہاں چلے جائیں گے جنہوں نے پورے علاقہ میں طوفان بپا کیا ہوا ہے (یعنی حضرت عدی کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا خاتمہ ممکن نظر نہیں آتا تھا) پھر رسول اکرمؐ نے ان سے کہا: اگر عمر نے ساتھ دیا تو تم کسریٰ کے خزانہ فتح کروگے، میں نے عرض کیا کسریٰ بن ہرمز کے خزانے؟ آپ نے فرمایا ہاں! کسریٰ بن ہرمز کے خزانے۔ حضرت عدی کہتے ہیں کہ پھر میں نے دیکھا کہ ایک عورت حیرہ سے چل کر خانہ کعبہ طواف کرنے آتی اور اسے سوائے اللہ کے کسی کا خوف نہ ہوتا، اور کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کرنے والوں میں تو میں خود بھی شامل تھا''۔

یہ ایک طویل حدیث ہے، جس سے ہم نے وہ حصہ لے لیا ہے جس کا ہمارے موضوع سے تعلق تھا، اس موقعہ پر ایک بات عرض کرنا ضروری معلوم ہوتی ہے: ''مشرقی اور مغربی یورپ کی تہذیب خدانا آشنا ہے، اسے اللہ کے حضور حاضری کا خیال ہی نہیں ہے، اس کا مقصود بس دنیاوی مفادات اور جسمانی خواہشات ہیں جنسی شہوت کے سلسلے میں اسے حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں ہے، اور اس کی فکر خالص خودغرضانہ ہے۔

عالم اسلام نے اس فاتح تہذیب کے آگے گھٹنے ٹیک دیے ہیں، اور اس کے اچھے پہلوؤں سے تو اس نے کوئی سبق لیا نہیں ہے، ہاں اس کی برائیوں میں لت پت ہے، اور اسی وجہ سے دینی جماعتوں نے ان مخلوط سفروں کو غلط قرار دیا ہے جو یونیورسٹیز کی جانب سے طلبہ وطالبات کے لئے منظّم کئے جاتے ہیں۔

ہمارے نزدیک مگر طالبات کسی علمی وتربیتی سفر پر جائیں تو ان کے اوپر ذہین وبیدار مغز

نگراں خواتین کی سخت نگرانی ہونی چاہئے۔

ہم نے امریکی طالبات سے شکوہ سنا ہے کہ انسان نما درندوں نے ان کے ساتھ جنسی زیادتی کی کوشش کی، پھر ہمارے ذرائع ابلاغ نے جنسی شہوتوں کو بھڑکا رکھا ہے، انسان کے اندر کے حیوانی عنصر کو بہت طاقتور کر دیا ہے، ہمارے دین کے نزدیک آبرو کی حفاظت ایمان کے لازمی تقاضوں میں سے ہے، اس کے نزدیک اللہ کی ناراضگی اور اس کے دردناک عذاب کے لئے فحاشی، قتل اور شرک یکساں اسباب ہیں۔

چہرے کا پردہ واجب نہیں ہے

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، ان کی عمر چالیس سے متجاوز ہی رہی ہوگی، لیکن ملے تو ایسے جیسے ابھی جوانی کا آغاز ہو، بہت بپھرے ہوئے لہجہ میں مجھ سے بولے: کیا آپ ہی یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ عورت کے چہرے اور اس کی آواز کا پردہ ضروری نہیں ہے؟ میں نے بہت سکون کے ساتھ جواب دیا: جی ہاں! کہنے لگے: اللہ سے کچھ خوف ہے یا نہیں؟ میں نے کہا: میں آپ کو اور اپنے آپ کو تقوے کی نصیحت کرتا ہوں! اس کے بعد انہوں نے کہا: آپ جو لوگوں کو بتاتے پھرتے ہیں وہ غلط ہے اور آپ پر توبہ لازم ہے، میں نے ان سے کہا: اس جرم کا تنہا میں ہی تو گناہ گار نہیں ہوں، کہ اس غلطی کا ارتکاب مجھ سے پہلے عظیم ترین مفسرین نے بھی کیا ہے، صحیح حدیثوں کے دسیوں راویوں نے یہ خطا کی ہے، اور ہاں چاروں مسالک کے ائمہ اور نہ جانے کتنے دیگر علماء مذاہب بھی اس غلطی میں میرے ساتھ شریک ہیں۔

میں نے اپنی رائے ان سارے حضرات سے ہی اخذ کی ہے، یا بالفاظ دیگر اس غلطی میں میں ان کا ہی متبع ہوں، اور اگر ان سب کے ساتھ میں کسی تہمت کا نشانہ بنوں تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔

بڑی حیرت کے ساتھ محترم بولے: آپ کیا کہہ رہے ہیں، کیا یہ سب حضرات عورت کے چہرے اور آواز کا پردہ نہ ہونے کا قائل تھے، میں نے کہا: جی ہاں! لیکن آپ جیسے لوگ رائج معاشرتی رواجوں کو ترجیح دیتے ہیں اور مرجوح آراء کو اختیار کرتے ہیں، اور اگر بالفرض مان لیں کہ اس مسئلہ میں علماء کے دو اقوال ہیں، جن میں سے ایک میرا مختار ہے، تو اس میں اس قدر غصہ اور بپھرنے کی کیا بات ہے؟ آپ نے حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابو درداء کا ایک حدیث

میں مروی قصہ سنا ہے یا نہیں؟ انھوں نے کہا نہیں، میں نے کہا اچھا تو آج سن لیجئے:

امام بخاریؒ نے حضرت ابو جحیفہ سے روایت کیا ہے کہ: ’’رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمان اور حضرت ابودرداء کے درمیان مؤاخات کرادی، حضرت سلمان حضرت ابودرداء کے یہاں گئے تو انہوں نے ان کی اہلیہ حضرت ام درداء کو عجیب حلیہ میں پایا، یہ دیکھ کر حضرت سلمان نے ان سے کہا: یہ اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ یہ ہیئت کیوں بنا رکھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا آپ کے بھائی جناب ابودرداء کو تو کچھ عورت سے لینا دینا ہے نہیں۔

تھوڑی دیر بعد حضرت ابودرداء آئے، کھانے کا انتظام کیا اور حضرت سلمان سے بولے آپ کھا لیجئے میں تو روزہ سے ہوں، انہوں نے کہا جب تک تم نہیں کھاؤ گے میں بھی نہیں کھاؤں گا، یہ سن کر وہ بھی کھانے لگے (یعنی مہمان کے حق کی ادائیگی کے لئے انہوں نے روزہ توڑ دیا) جب رات ہوئی تو حضرت ابودرداء نوافل کے لئے کھڑے ہونے لگے، حضرت سلمان نے ان سے کہا ابھی سو جاؤ، وہ سو گئے، پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کھڑے ہوئے پھر انہوں نے کہا ابھی سوئے رہو، وہ پھر سو گئے، جب رات کا آخر حصہ آیا تو حضرت سلمان نے ان سے کہا اب اٹھو، اب ہم دونوں نماز پڑھیں گے، مزید یہ بھی کہا کہ تمہارے رب کا تم پر حق ہے، تمہارا اپنا تم پر حق ہے، تمہارے اہل خانہ کا تم پر حق ہے، لہذا ہر ایک کو اس کا حق دو۔

حضرت ابودرداء رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان سے یہ واقعہ ذکر کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سلمان نے سچ کہا، اس وقت اس حدیث کو ذکر کرنے سے اصل مقصود اس کا ابتدائی حصہ ہے، جس میں حضرت سلمان اور حضرت ام درداء کے درمیان ہونے والی گفتگو نقل کی گئی ہے، اگر یہ گفتگو ہمارے زمانہ میں کسی نامحرم مرد وعورت کے درمیان ہو جائے تو آنے والے مرد کی پٹائی ہوگی، اور بیچاری گھر والی قتل کردی جائے گی۔

مرد سے کہا جائے گا تم نے عورت کے کپڑوں پر نظر کیوں ڈالی؟ اور یہ گفتگو کیوں کی؟

اور عورت سے کہا جائے گا کہ تم نے ایک غیر مرد سے اپنے شوہر کی شکایت کیوں کی اسے کیوں بتایا کہ تمہارا شوہر تم سے رغبت نہیں رکھتا ہے۔

لیکن صحابہ کی سلیم فطرت میں ایسے شبہات وگمانوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی، پھر جب فطرتیں آلودہ ہوگئیں تو بقول شاعر:

إذا ساء فعل المرء ساءت ظنونه　　　وصدق ما يعتاده من توهم

(جب انسان بدعمل ہوتا ہے تو بدگمان بھی ہوجاتا ہے، اور وہ جن توہمات کا عادی ہوتا ہے انہیں سچ خیال کرتا ہے)۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں روگی دل چہرہ کھولنے کو گناہ وحرام بتاتے ہیں، اس لئے کہ اس سے ان کے مریض احساسات کے مطابق کبائر کا دروازہ کھل جاتا ہے، اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔

عورت کی آواز کا پردہ-ایک برخود غلط پروپیگنڈہ

ابن اسحاق نے ایک دلچسپ قصہ ذکر کیا ہے، ہم اس وقت اس میں سے بس اتنا حصہ ذکر کررہے ہیں جتنے کا تعلق عورت کی آواز کا پردہ بتانے کی بابت ایک برخود غلط پروپگنڈہ سے ہے، ابن اسحاق لکھتے ہیں: ''رسول اکرم ﷺ کے داماد حضرت ابوالعاص بن ربیع کو جب آنحضرت ﷺ نے بدر کے موقع پر بے فدیہ لئے چھوڑ دیا تو وہ مکہ ہی میں رہتے رہے۔

جب کہ حضرت زینب اپنے والد ماجد کے پاس مدینہ میں رہتی رہیں، فتح مکہ سے قبل ابوالعاص قریش کے ایک قافلۂ تجارت کے ساتھ شام کے لئے نکلے، واپسی میں ان کا سامنا مسلمانوں کے ایک سریہ سے ہوگیا، اس سریہ نے قریشی قافلۂ تجارت کو قید کرلیا، ابوالعاص رات کی تاریکی میں اپنی سابق اہلیہ حضرت زینب کے گھر ان سے پناہ طلب کرنے کے لئے پہنچ گئے، حضرت زینب نے ان کو پناہ دے دی۔

آں حضرت ﷺ فجر کی نماز کے لیے مسجد تشریف لائے تو جیسے ہی آپ نے اور آپ کے پیچھے مسلمانوں نے نماز کا آغاز کیا، عورتوں کی صف سے حضرت زینب نے پکار کر کہا: اے لوگو! میں نے ابوالعاص بن ربیع کو پناہ دے دی ہے۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد آں حضرت ﷺ نے لوگوں سے کہا: ''اے لوگو! جو میں نے سنا وہ تم نے بھی سن لیا ہے، لوگوں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: بخدا مجھے اس بات کا کچھ بھی علم اسی آواز کو سن کر ہوا جو تم نے سنی ہے، اور دیکھو اصول یہ ہے کہ مسلمانوں کے معمولی شخص کی پناہ دہندگی کا خیال تمام مسلمانوں کو رکھنا ہوتا ہے، پھر آں حضرت ﷺ حضرت زینبؓ کے پاس آئے اور ان سے فرمایا: ''اے بیٹی! ان کا اکرام کرو، اور دیکھو تم اب اس

کے لئے حلال نہیں ہو، لہذا وہ تم سے زن وشوہر والے تعلقات قائم نہ کریں''۔

اس قصہ کا اگلا حصہ کتب سیرت میں معروف ہے کہ پھر وہ اسلام لے آئے اور مکہ گئے تا کہ امانتوں کی ادائیگی کر دیں، اور پھر مدینہ آ کر مجاہدین میں سے ایک ہوئے۔

اس قصہ سے ہمارا استدلال مسجد میں حضرت زینب کی تمام مسلمانوں سے کی جانے والی گفتگو سے ہے، کیا کسی مسلمان نے ان سے کہا کہ تمہاری آواز کا تو پردہ تھا!! اس سے بھی پہلے جب مکہ مکرمہ میں آں حضرت ﷺ کی کمر پر بحالت سجدہ ایک غلام نے اوجھڑی ڈال دی تھی اور رؤساء قریش یہ منظر دیکھ کر کے ہنس رہے تھے تو حضرت فاطمہ نے ان کو برا بھلا کہتے ہوئے اپنے والد کی کمر سے گندگی ہٹائی تھی، کیا کسی مسلمان نے اس وقت ان سے یہ بات کہی تھی کہ تمہاری آواز کا پردہ ضروری ہے۔

حضرت موسیٰ نے مدین میں حضرت شعیبؑ کی دو بیٹیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''تمہارا کیا معاملہ ہے؟ ان دونوں نے کہا جب تک یہ چرواہے واپس نہ ہو جائیں ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاتے، اور ہمارے والد بہت عمر دراز ہیں'' تھوڑی دیر بعد ان دو میں سے ایک نے آ کر حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا: ''میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تا کہ آپ نے جو ہمارے جانوروں کو پانی پلایا ہے اس کا بدلہ آپ کو دیں'' کیا کسی مسلمان نے اس بابت بھی عورت کی آواز کا پردہ بتایا ہے؟

ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مہاجر خواتین کے امتحان کا حکم دیا تھا، اس امتحان کی ذمہ داری حضرت عمرؓ کے سپرد کی گئی تھی، یہ عورتیں جب اپنے سوالات کا جواب دیتی تھیں تو کیا کسی نے ان کی آواز مردوں کے لئے حرام قرار دی تھی، ہاں ہوسکتا ہے کہ کوئی مہربان یہ کہیں کہ یہ امتحان تحریری تھا زبانی نہیں۔

عہد نبوی کی خواتین حدیثیں روایت کرتی تھیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ

انجام دیتی تھیں، لیکن کبھی کسی نے ان سے یہ نہیں کہا کہ تمہاری آوازوں کا پردہ لازم ہے۔

عورتوں (اور مردوں کی بھی) ان آوازوں کا پردہ ہے جو غلط جذبات کو بھڑکائیں۔ کسی فقیہ نے آج تک یہ نہیں کہا کہ عورت کی آواز کا پردہ ہے، یہ ایک غلط پروپیگنڈہ ہے۔

دین داری کا مطلب رائی کو پہاڑ بنانا نہیں ہے

ایک دوست نے بتایا کہ ایک دینی رسالہ نے میرے اس خیال پر مجھے شدید اعتراض کا نشانہ بنایا ہے کہ: نغموں کا حکم بھی عام انسانی کلام جیسا ہی ہے، یعنی اس میں مستحسن وقبیح دونوں ہوتے ہیں، اس رسالہ کا خیال ہے ہر قسم کی نغمہ سنجی شر ہے، اس کی کوئی بھی قسم اس حکم سے مستثنیٰ نہیں ہے، جس دوست نے مجھے یہ خبر دی تھی میں نے اس سے کہا: ہوسکتا ہے کہ میری رائے غلط ہو، میں کوئی معصوم تو ہوں نہیں، اور ان حضرات کا عذر یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں رائج اکثر نغمے نہایت فحش اور پست معیار ہوتے ہیں۔

وہ میری یہ بات سن کر بولے: ایسا لگتا ہے کہ جیسے آپ ان سے قریب آرہے ہیں، میری خواہش ہے کہ میں آپ دونوں کی ایک جگہ ملاقات کرادوں تاکہ یہ اختلاف ختم ہوجائے، میں نے فوراً جواب دیا: میں ان حضرات سے ملاقات کرنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ ایک مغربی کہاوت کے مطابق: ''کم عقل لوگ اس خوردبین جیسے ہوتے ہیں جو چھوٹی چیز کو تو بہت بڑا کرکے دکھاتی ہے، لیکن بڑی چیزوں کو نہیں دیکھ پاتی''۔

ان حضرات کو چاہئے کہ عام مسلمانوں کو اس مسئلہ میں الجھانے کے بجائے مسلمانوں کے اہم مسائل پر توجہ دیں۔

ایک طویل زمانے سے سیاسی استبداد نے ہمارے ممالک کو جکڑ رکھا ہے، لیکن ہم نے اپنے ان مہربانوں کو کبھی آزادی یا نظام شوریٰ کا ماتم کرتے نہیں دیکھا، جن موضوعات پر بولنے کی ضرورت نہیں ہے ان پر تو آسمان سر پر اٹھالینا اور جن پر بولنے اور شور مچانے کی ضرورت ہے ان پر مکمل خاموشی برتنا ان حضرات کی ایسی روش ہے جس کی وجہ سے مجھے ان کو دیکھنے اور سننے کی کوئی

خواہش نہیں بچی ہے، اور میں تو یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ اسلام کو ان کے علم اور ان کے اس طرح کے دعووں سے محفوظ رکھے۔

گزشتہ چند مہینوں میں میرے پاس ایسے متعدد مرد اور عورت آئے جن کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کے اعصاب شکستہ ہیں، اور انہیں مادی و معنوی علاج کی ضرورت ہے۔

ان میں سے اکثر نے یہ بتایا کہ ان پر جن کے اثرات ہیں، میں نے ان کے اس خیال کی نکیر کی، اور انہیں ان کے مناسب حال مشورے دیے، لیکن انہیں اصرار تھا کہ ان پر جن آگئے ہیں، میں نے ان سے ایک جملہ کہا، جو بہت مشہور ہوا اور جسے میڈیا نے بھی بہت نقل کیا کہ: کیا جن صرف تم پر ہی سواری کرتے ہیں، مغربی ممالک میں کسی کو یہ شکایت کیوں نہیں ہوتی؟

ان کے سلسلے میں میں نے اپنی رائے کی مزید وضاحت بھی کی، دینی کتابوں کے ایک قاری نے مجھ سے نہایت غضب ناک لہجہ میں کہا: کیا آپ ابن تیمیہ کی رائے کے مخالف ہیں، میں نے اسے فوراً جواب دیا: نہیں، میں ان کی اس رائے کا سو فیصد مؤید ہوں جس میں انہوں نے ائمہ اربعہ سے اختلاف کر کے طلاق بدعی کو مسترد کرتے ہوئے صرف طلاق مسنون کو ہی معتبر مانا ہے۔

وہ صاحب کہنے لگے، میں آپ سے اس بابت نہیں بات کر رہا، وہ انسان کے جسم سے شیطان (جن) نکالا کرتے تھے، اور اس سے کہتے تھے اے اللہ کے دشمن نکل! اور وہ بھاگ جاتا تھا، میں نے ان سے کہا: آپ کی رائے صحیح ہو یا غلط لیکن یہ آپ تندرو اور نبرد آزمائی پر آمادہ کیوں نظر آتے ہیں، شیاطین الانس نے اسلامی ممالک پر فوجی وسیاسی قبضہ کر رکھا ہے، اس پر تو آپ کے چہرہ کی رنگت نہیں بدلتی، ان سے آپ جنگ پر آمادہ نہیں ہوتے، اور آپ یا آپ جیسوں کی زبان سے ہم نے اس پر ایک جملہ بھی نہیں سنا۔

ہمارے بعض دیندار برادران کم عقل واقع ہوئے ہیں، ان کا فہم نہایت کمزور اور ان کی

فکر نہایت غلط ہے۔

ان میں سے کچھ کی رسائی قانون ساز اداروں تک ہوگئی ہے، ان کی عقلی کمزوریوں اور بچکانہ حرکتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ہمیں جان توڑ محنت کرنی پڑتی ہے۔

دین ایمانی عقل و مضبوط فہم کا متقاضی ہے، دین رائی کو پہاڑ یا بے بات کا بتنگڑ نہیں بناتا ہے۔

ایک امام کی نغمہ سنجی

ہمارے علم کے مطابق کسی بھی فقیہ نے دینی نغمے گانے سے منع نہیں کیا ہے، اللہ سے محبت پیدا کرنے والے اور اس کی حمد وثنا بیان کرنے والے اشعار کو کون برا بھلا کہہ سکتا ہے، اور کون ہے جو اللہ سے تعلق قائم کرنے اور اس کے جناب میں ہونے والی کوتاہیوں پر گریہ زاری کو ناپسند کرے؟

فقہاء نے جس چیز کو ممنوع قرار دیا ہے وہ سماع کی وہ محفلیں ہیں جن میں شور وغوغا مچتا تھا، تالیاں پیٹی جاتی تھیں اور لوگ مٹکا کرتے تھے، یہ سماع کی محفلیں ذکر خداوندی کی نہیں اللہ سے غفلت والی مجلسیں ہوا کرتی تھیں، ان محفلوں میں بدعات وخرافات کا زور رہتا تھا، اور رقص ہوتا تھا، ظاہر ہے ایسی محفلوں کی اجازت کوئی عقل مند بھی نہیں دے سکتا۔

ہماری نہایت قابل احترام تاریخ میں ایسی بہت سی روایات ہیں جن کے احیاء کی ضرورت ہے، ابوالحسن قرافی صوفی حضرت حسن بصری سے نقل کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے آکر حضرت عمر بن خطاب سے یہ عرض کیا کہ امیر المؤمنین! ہمارے یہاں ایک امام صاحب جب نماز سے فارغ ہوتے ہیں کچھ اشعار گاتے ہیں (یہ قصہ امام شاطبی نے الاعتصام کی جلد اول میں ذکر کیا ہے) حضرت عمر نے دریافت فرمایا: یہ کون شخص ہے، ان لوگوں نے بتایا تو آپ نے فرمایا ہمیں وہاں لے چلو، اگر ہم نے وہاں کسی اور کو بھیجا تو اسے خیال ہوگا کہ ہم نے اس کے لئے جاسوسی کرائی ہے۔

کیسا انسانی حقوق ومقام کا خیال ہے، غرض حضرت عمر چند صحابہ کے ساتھ اس امام کے پاس گئے، وہ مسجد میں تھا، حضرت عمر پر اس کی نظر پڑی تو یہ کہتے ہوئے آگے آیا ارے

امیر المؤمنین آپ! آپ نے کیوں زحمت کی؟ اگر کوئی ہماری ضرورت تھی تو ہمیں حاضر ہونا چاہیئے تھا، اور اگر کوئی آپ کا کام تھا تو بھی ہمارے لئے سب سے زیادہ تعظیم کی مستحق ذات خلیفہ رسول اللہ کی ہے۔

حضرت عمرؓ نے اس سے کہا: تمہارے بارے میں ہمیں ایک غلط بات سننے کو ملی ہے، اس نے پوچھا: کیا یا امیر المؤمنین! آپ نے فرمایا: کیا تم نے عبادت کو کھلواڑ بنا رکھا ہے؟ اس نے کہا نہیں امیر المؤمنین! بلکہ اس کے ذریعہ میں اپنے آپ کو نصیحت کرتا ہوں، حضرت عمر نے کہا: اچھا سناؤ، اگر وہ اچھا کلام ہوگا تو میں بھی تمہارے ساتھ پڑھوں گا اور اگر برا ہوگا تو تمہیں روک دوں گا۔

اس پر اس نے سنایا:

وفؤاد كلما عاتبته　　في مدى الهجران يبغى تعبى
لا أراه الدهر إلا لاهيا　　في تماديه فقد برح بي
يا قرين السوء ما هذا الصبا　　فنى العمر كذا في اللعب
وشبابي بان عنى، فمضى　　قبل أن أقضى منه أربى
ما أرجى بعده إلا الفنا　　ضيق الشيب على مطلبى
ويح نفسي لا أراها أبدا　　في جميل، لا، ولا في أدب
نفسي! لا كنت ولا كان الهوى　　راقبى المولى! وخافى! وارهبى!

(جب کبھی بھی میں اپنے نفس کو سخت سست کہتا ہوں تو وہ مجھے ہرا دینا چاہتا ہے، اس میں نے ہمیشہ سرکش وغافل ہی پایا، اور اس طرح اس نے مجھے تباہ وبرباد کرڈالا، اے برے ساتھی! یہ کیسی بچپنی حرکتیں ہیں، پوری عمر اسی طرح لہو ولعب میں گزر گئی، جوانی مجھ سے رخصت بھی ہوگئی، اور میں اس سے اپنی مرادیں پوری نہ کرسکا، اب اس کے بعد تو بس موت کا انتظار ہے کہ بڑھاپے

نے میرے اہداف کے حصول کی امیدیں کم کردی ہیں، ہائے میرا نفس کہ میں نے اسے کبھی بھی اچھے حال میں نہ پایا۔ اے نفس اب اپنا اور اپنی خواہشات کا اتباع چھوڑو، اور ہر وقت اللہ کے خیال اور اس کی خشیت کو ملحوظ خاطر رکھو)۔

(حضرت عمر نے پہلے تو مذکورہ بالا اشعار میں سے یہ آخری شعر پڑھا۔

نفسي! لا كنت ولا كان الهوى　　　راقبى المولى! وخافى! وارهبى!

اور پھر فرمایا: ایسے اشعار جو چاہے گائے۔

میں اچھے احساسات اور اچھے جذبات پیدا کرنے والے نغموں کو پسند کرتا ہوں، جس کو یہ ناپسند ہوں، شوق سے ناپسند کرے، لیکن دوسرے کی رائے کو دین کے نام پر غلط نہ کہے۔

خواتین کی فوجی تربیت اور فوج میں ان کی شمولیت

ہر مسلمان کی طرح میں بھی اس بات کا سختی سے مخالف ہوں کہ یورپ کی طرز پر خاتون فوجیوں کی کمپنیاں بنائی جائیں، یہ کمپنیاں نہایت پست مقاصد کے لئے تشکیل دی جاتی ہیں، ہر خاص وعام کو یہ بات معلوم ہے کہ یورپینس جنسی شہوت کو بھی جسم کی دیگر ضرورتوں کی طرح ہی سمجھتے ہیں، اور اس کی تکمیل کو حدود کا پابند نہیں مانتے ہیں۔

جہاد اسلامی میں مومن خواتین کی پاکیزہ شرکت اس طور پر ممکن ہے ان کی ذمہ داری زخمیوں کی تیمارداری، ان کا علاج شہداء کو پچھلے ٹھکانوں میں منتقل کرنے، کھانے پینے کے انتظام، اہم خطوط کی نگارش اور انتظامی امور کی ادائیگی تک ہو۔

اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ یہ خواتین مسلح اور تربیت یافتہ ہوں، اس لئے کہ کبھی کبھار ضرورت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ یہ خواتین دشمن سے نبرد آزما ہوں، ایسے موقعہ پر ان کا آسان نوالہ ثابت ہونا مناسب نہیں ہوتا ہے۔ امام مسلم نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ غزوۂ حنین میں حضرت ام سلیم اپنے ساتھ مستقل خنجر رکھے ہوئے تھیں، حضرت ابوطلحہ نے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ دیکھئے، یہ ام سلیم خنجر اٹھائے ہوئے ہیں، آپ نے ان سے دریافت فرمایا: یہ کیسا خنجر ہے، انہوں نے عرض کیا: یہ میں نے اسلئے لیا ہوا ہے کہ اگر کوئی مشرک میرے قریب آئے تو میں اس کا پیٹ پھاڑ دوں، یہ سن کر آپ ؐ ہنس پڑے۔

امام طبرانی نے حضرت مہاجر سے روایت کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت یزید (جو بیعت عقبہ میں شریک تھیں) انہوں نے جنگ یرموک میں نو رومی فوجیوں کو اپنے خیمہ کے ستون سے مار ڈالا۔

امام بخاری نے حضرت ربیع بنت معوّذ سے روایت کیا ہے کہ: ہم رسول اکرم ﷺ

کے ساتھ غزوہ میں شریک ہوتے، لوگوں کو پانی پلاتے، ان کی خدمت کرتے، مقتولین اور زخمیوں کو مدینہ پہنچاتے۔

امام مسلم نے حضرت ام عطیہ انصاریہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی، مجاہدین میدان جہاد کو جاتے تو میں ان کی قیام گاہوں پر رہتی، ان کے لئے کھانا پکاتی، زخمیوں کا علاج اور مریضوں کی تیمارداری کرتی۔

ہلال احمر کے مختلف ادارے مسلم مجاہد خواتین کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک ایسا دقیق اسلامی نظام اختیار کرسکتے ہیں جس میں احکام خداوندی، اور دین کی تعلیم کردہ پاکدامنی اور تقوے کا خیال رکھا جائے۔

عورت تیمارداری کے سلسلے میں مردوں سے فائق ہوتی ہے، آج اسلام کو اپنے وجود اور اپنی تعلیمات کے لئے متعدد مقامات پر دفاعی جنگیں کرنی پڑ رہی ہیں، خدا جانے کتنے محاذوں پر امت کو خود اپنے علاقوں میں جنگیں لڑنی پڑ رہی ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے حضرت ام حرام کو سمندری غزوہ میں شرکت کی اجازت دی تھی، حضرت معاویہ کے عہد میں قسطنطینیہ پر حملہ ہوا تو وہ حضرت معاویہ کی اہلیہ کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئیں، قبرص میں ان کا انتقال ہوا، اور وہ وہیں مدفون ہیں۔

عسکری وسماجی جہاد میں خواتین کی شرکت سلف صالحین کے عہد میں ایک معروف چیز رہی ہے، لیکن بعض حضرات اس کے تذکرہ سے چیں بہ جبیں ہوجاتے ہیں، اسلام کی علمی قیادت جب تک ان کوتاہ بینوں کے ہاتھ میں رہے گی ہمیں دعوت اسلامی کے میدان میں شکست پے شکست ملتی چلی جائیں گی۔

ہم سنت نبوی کے پیروکار ہیں، ہماری خواہش ہے کہ اس کی اچھی طرح تطبیق کی ہم ہر ممکن ضمانت فراہم کریں، ہم اسلامی تعلیمات کو ان لوگوں سے کبھی حاصل نہیں کرسکتے جو مصادر اسلام سے ناآشنا اور معاشرے کے رواجوں کے اسیر ہیں۔

گھروں کی تباہی کے خواہاں

ایک روز ایک بہت ہی گھبرائے ہوئے شخص نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا، اس نے اپنے اہل وعیال کے سلسلے میں دکھڑا سنانا شروع کیا، مجھے لگا کہ وہ مجھ سے مدد کا طالب ہے، میں نے اس سے نہایت سکون کے ساتھ پوچھا: کیا ہوا؟ س نے بتایا: غصہ کی حالت میں میں قابو کھو بیٹھا اور میں نے اپنی بیوی سے کہدیا: تم مجھ پر حرام۔ علماء کا فتویٰ ہے کہ میں اب اسے کھو بیٹھا اور وہ میرے لئے کبھی بھی حلال نہ ہوگی۔

میں نے اس سے پوچھا پنج وقتہ نمازیں پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں، میں نے پوچھا: اور تمہاری بیوی؟ کبھی کبھی پڑھ لیتی ہے، جھجھکتے ہوئے اس نے جواب دیا، میں نے پوچھا: اور بچے؟ بولا: کچھ نماز پڑھتے ہیں اور کچھ کو نماز کی کوئی فکر نہیں۔

میں بہت دیر سر جھکائے ایسا ظاہر کرتا رہا جیسے میں اس کے لئے کوئی حل ڈھونڈ رہا ہوں، پھر میں نے اس سے کہا: میں ایک شرط کے ساتھ تمہاری بیوی تمہیں واپس دلوا سکتا ہوں، اس نے پوچھا: وہ کیا؟ میں نے کہا تم اور تمہاری اہلیہ دونوں نماز کی پابندی کروگے، اور اولاد پر پنج وقتہ نمازوں کی ادائیگی کی نگرانی رکھوگے، نیز تمہارے اوپر کفارۂ یمین لازم ہوگا، جس کی وجہ سے اگر تمہارے حالات ہوں تو تم دس مساکین کو کھانا کھلادو، ورنہ تین دن کے روزے رکھ لو، اس طرح تم اپنی بیوی کو گھر میں رکھ سکتے ہو۔

یہ سن کر یہ شخص چلا گیا، کچھ دنوں بعد میرے پاس وہ علماء آئے جنہوں نے اسے یہ فتویٰ دیا تھا کہ اس کی عورت پر طلاق بائنہ پڑ گئی ہے، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے بیوی حلال ہونے کا فتویٰ کیسے دے دیا؟ ہم مالکیہ کے یہاں تو یہ صورت بینونت کبریٰ کی ہے، میں نے کہا

اس سلسلے میں میری رائے دوسری ہے، میں کسی بھی حلال کو حرام بتانے کو یمین سمجھتا ہوں، یعنی ایسی صورت میں کفارہ یمین واجب ہوگا، صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: کسی مرد کا اپنی بیوی کو حرام قرار دینا یمین ہے، ایسے شخص پر کفارۂ یمین واجب ہوگا، ایک اور روایت کے مطابق ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس آیا اور عرض کیا: میں نے اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام بتایا، حضرت ابن عباس نے کہا یہ تم نے جھوٹ کہا، وہ تمہارے اوپر حرام نہیں ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''**يا أيها النبي لم تحرم ما أحل الله لک تبتغي مرضاة أزواجک والله غفور رحيم قد فرض الله لكم تحلة أيمانكم**'' (اے نبی تم نے اس چیز کو کیوں حرام قرار دیا جس کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا تھا، کیا تم اپنی ازواج کی خوشنودی کے طالب ہو؟ اور اللہ نہایت معاف فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے، اللہ نے تمہارے اوپر تمہاری قسموں کا توڑنا فرض قرار دیا ہے) اس کے بعد حضرت ابن عباس نے اس سے کہا تم پر کفارۂ یمین لازم ہے۔

مجھے لگا کہ یہ حضرات میری گفتگو سے مطمئن نہیں ہیں، تو میں نے ان سے کہا: تم لوگ ایک گھر برباد کرنے کے لئے ایسے پرجوش کیوں ہو؟ ایک عورت کو مطلقہ اور اولاد کو یتیم بنانے کے لئے ایسے آرزومند کیوں ہو؟ فقہی فروعیات میں مسالک مختلف ہوا کرتے ہیں، ہمیں ان آراء کو اختیار کرنا چاہئے جو خاندان کی مصلحت، اولاد کے مستقبل اور معاشرہ کے استحکام کے تقاضوں کا زیادہ خیال رکھیں۔ ہمیں اسلام کو دشمنوں کے الزامات سے بچانا چاہئے۔

اگر کوئی قابل احترام فقہی رائے ہمارے مسلک کے خلاف ہو تو ہمیں اپنے مسلک کے لئے تعصب کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے، بالخصوص ایسے وقت جب کہ دوسری رائے زیادہ بہتر اور لوگوں کے لئے زیادہ مفید ہو۔

یہ سن کر ایک صاحب بولے: کیا آپ کو امام مالک اور ان کے مسلک سے محبت نہیں

ہے، میں نے کہا: صالحین کی عدم محبت سے میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں، میں اپنی نماز میں امام مالک کا مقلد ہوں، جہری نمازوں میں قرأت خلف الامام نہیں کرتا، اور سری نمازوں میں کرتا ہوں، حالانکہ امام ابوحنیفہ کے مسلک میں ہمارے علم کے مطابق سری و جہری دونوں طرح کی نمازوں میں قرأت خلف الامام حرام ہے، اس سلسلے میں میں امام مالک کے مسلک کو زیادہ لائق اتباع سمجھتا ہوں۔

میں اس تعصب کو ناپسند کرتا ہوں جو اپنے اسیروں کو اندھا بہرہ بنا دیتا ہے، عائلی وسماجی مسائل میں میں ہر اس رائے کو ترجیح دیتا ہوں جس میں عام وخاص منفعت ہو، اور جو معاصر انسانیت کے تقاضوں (فطرت وحقوق انسانی کے احترام) سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔

میں اسلام کو اعتراضات کا نشانہ بنوانے کا خوگر نہیں ہوں۔

مسئلہ بیویوں کی پٹائی کا

مجھے اس وقت غصہ بھی آتا ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ بعض ایسے لوگ جنہیں حدیث سے اشتغال ہے اور قرآن مجید کی بس معمولی شد بد ہے وہ لوگوں کو حدیثیں یہ سوچے بغیر سناتے چلے جاتے ہیں کہ کہیں کوئی حدیث قرآنی آیات سے معارض تو نہیں ہے۔

تیسیر الوصول إلی جامع الأصول میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے: حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''انسان سے بیوی کی پٹائی کی بابت کوئی مواخذہ نہیں ہوگا'' (ابوداود)۔

شیخ محمد حامد فقی نے اس حدیث پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے: ''اسے نسائی نے بھی روایت کیا ہے''، یعنی شیخ موصوف نے اس کی سند کو قوی بتانا چاہا ہے، اور متن پر کوئی کلام نہیں کیا، گویا کہ اس پر کوئی اعتراض ہو ہی نہیں سکتا۔

حدیث کا ظاہری مفہوم یقیناً باطل ہے، اس لئے کہ اس میں روایت کردہ متن قرآن وسنت کے متعدد نصوص سے معارض ہے، مرد کا عورت پر ظلم عقل، شریعت اور انصاف کی عدالت میں اسی طرح غلط ہے جیسے عورت کا مرد پر ظلم، خدا جانے کہ اس کلام کی نسبت رسول اکرم ﷺ کی جانب کیسے ہوگئی، اور یہ بات کس پس منظر میں کس نے کہی۔

اخروی جزاء کا ایک اصول یہ ہے: **''فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره ومن يعمل مثقال ذرة شرا يره''** (جو کوئی ذرہ برابر بھلائی کرے گا اس کو بھی دیکھ لے گا، اور جو کوئی ذرہ برابر برائی کرے گا اس کو بھی دیکھ لے گا)۔

تو کیا صرف شوہر اس اصول سے مستثنیٰ ہے کہ اس سے بیوی کی پٹائی کی بابت کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، کیا اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی وجہ سے (یہاں تک کہ ظلم کی خواہش کی وجہ سے بھی) عورت کو مارے؟ اگر ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''**ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف**'' (عورتوں کو معروف کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسی ان پر ذمہ داری ہے) ''**امسكوهن بمعروف أو سرحوهن بمعروف**'' (یا تو انہیں صحیح طریقہ سے رکھو یا پھر صحیح طریقہ سے چھوڑ دو) اور حدیث نبوی ''**استوصوا بالنساء خيرا فانهن عوان عندكم**'' (بیویوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، کہ وہ تمہارے اوپر منحصر ہیں) کا کیا مفہوم ہے؟

بسا اوقات بیوی شوہر سے اپنے آپ کو برتر خیال کرتی ہے، اس کی اطاعت کو ذلت تصور کرتی ہے، اور اس کی وجہ سے شوہر کے ساتھ زن وشوہر کے تعلقات قائم کرنا نہیں چاہتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شوہر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی اسی وجہ سے پٹائی کر دیتا ہے۔

ایسا ہی بلکہ اس سے سنگین معاملہ کبھی کبھی یہ بھی پیش آتا ہے کہ عورت شوہر کے گھر میں کسی ایسے اجنبی شخص کو آنے دیتی ہے جس کو شوہر ناپسند کرتا ہے، ایسی صورت میں ازدواجی زندگی میں خلل بھی آتا ہے اور افواہوں کا بازار بھی گرم ہوتا ہے۔

دلائل شریعہ میں مجھے بس انہی اسباب کی صورت میں بیوی کی پٹائی کی اجازت ملتی ہے۔

اس کے باوجود بھی مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ تادیب بس مسواک جیسی چیزوں سے ہوگی، باقاعدہ پٹائی نہ ہوگی، اور نہ چہرہ پر دست درازی کی جائے گی، ارشاد نبوی ہے: ''......نہ چہرہ پر مارو اور نہ ہی اسے بدعا دینا''۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اللہ اور خاندان کے حقوق ادا کرنے والی بیویوں کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''**فان أطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا إن الله كان عليا كبيرا**'' (پھر

اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے تلاش نہ کرو، یقین رکھو کہ اللہ بہت بڑا اور بالاتر ہے)۔

آیت کے آخری الفاظ غور وفکر کے مستحق ہیں، کہ ان میں اللہ کی دو صفات بڑائی اور بالاتری کا تذکرہ ہے، یہ دو صفات بے جا تعدی، ضعیف پر زور دکھانے اور غیر مناسب طریقہ اختیار کرنے کے منافی ہیں، اس طرح مردوں کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اہل خانہ کے ساتھ ان کا برتاؤ بلند معیار، نرمی اور احسان کا ہونا چاہئے، ان تمام دلائل شرعیہ کے ساتھ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ مرد کو بیوی پر اپنی مرضی سے تعدی کا حق حاصل ہے، اور اس تعدی پر اس سے اللہ کے یہاں مواخذہ بھی نہ ہوگا۔

لہذا ابوداود اور نسائی کی یہ حدیث بے اصل ہے، خواہ یہ حضرات اس کی تاویل میں کتنی ہی محنت کیوں نہ کریں۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام خواتین کو فرشتہ اور تمام مردوں کو شیطان سمجھنا بھی غلط اور بے وقوفی ہے، ایسی جانب داری کے ساتھ انصاف ناممکن ہے۔

ہمیں خانگی تعلقات کا غیر جانبداری کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہئے، اس سلسلہ میں فطرتوں اور عارضی واقعات کے نتائج پر بھی نظر رکھنی چاہئے، نیز اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ہم کہیں کسی معمولی سبب سے ازدواجی زندگی کو ختم نہ کر دیں۔

کسی خانوادہ کا اختتام بڑی سنگین بات ہے، اسی لئے اسلام نے (طلاق کے بعد بھی) زوجین کو ایک دوسرے کا سامنا کرنے کی اجازت دی ہے، تا کہ ماضی کی شیریں یادیں تلخ یادوں پر غالب ہو جائیں، یا انس ومحبت کے جذبات علاحدگی کو اس طرح کر دیں جس طرح ابوطیب نے کہا ہے:

خلقت ألوفا، لو رجعت إلى الصبا   لفارقت شيبي موجع القلب باكيا

(میری فطرت میں انس ومحبت کا عنصر اس قدر ہے کہ اگر مجھے بچپن بھی دے دیا جائے تو میں بڑھاپے کو آخری درجہ کے غم کے ساتھ روتے بلکتے الوداع کہوں گا)۔

اسی لئے معاشرہ کو ان دونوں کے اختلافات ختم کرانے کی کوشش کرانی چاہئے، یہ کام سب سے زیادہ بہتر طریقہ پر زوجین کے اعزہ واقارب کر سکتے ہیں، اس لئے کہ وہی سب سے زیادہ ان دونوں کے درمیان صلح کے خواہاں، ان کے مصالح سے واقف اور اپنے فیصلوں کی تنفیذ پر قادر ہوتے ہیں، یہ بات اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس طرح ارشاد فرمائی ہے: ''**وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكماً من أهله وحكماً من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما إن الله كان عليا خبيرا**'' (اگر تمہیں ان دونوں کے درمیان اختلافات کا ڈر ہو تو ایک ایک حکم شوہر کے رشتہ داروں میں سے اور بیوی کے رشتہ داروں میں سے متعین کرو، اگر یہ دونوں حکم اصلاح کے خواہاں ہوں گے تو اللہ ان دونوں کے درمیان صلح کی توفیق دے دے گا، بلاشبہ اللہ بہت بالاتر اور واقف ہے)۔

امام شافعیؒ نے اپنی سند سے حضرت علیؓ بن ابی طالب کی بابت یہ روایت کیا ہے کہ ان کے پاس ایک جوڑا آیا، جن میں سے دونوں کے ساتھ بہت سے لوگ تھے، آپ نے دریافت فرمایا: ان دونوں کا کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ان دونوں کے درمیان اختلافات ہو گئے ہیں، حضرت علیؓ نے فرمایا پھر دونوں کے رشتہ داروں میں سے ایک ایک حکم متعین کردو۔

پھر آپ نے دونوں حکموں سے فرمایا: کیا تمہیں اپنی ذمہ داری معلوم ہے؟ اگر تمہارے نزدیک ان کا ایک ساتھ رہنا مناسب ہو تو صلح کرا دینا اور اگر ان کی علاحدگی بہتر ہو تو علاحدگی کرا دینا، ان دونوں میں سے بیوی نے کہا: میں اللہ کی شریعت پر راضی ہوں، خواہ مجھے فائدہ ہو یا نقصان۔

مرد نے کہا: نہیں، انہیں علاحدگی کرانے کا اختیار نہیں ہے، حضرت علی نے کہا: نہیں

تمہیں بھی اپنی بیوی جیسا ہی اختیار دینا ہوگا۔

شوہر کے اعتراض کا حاصل یہ تھا کہ وہ حکموں کو اپنے نام پر طلاق دینے کا اختیار نہیں دینا چاہتا تھا، یعنی وہ ان دونوں کو صلح کا اختیار دے رہا تھا، علاحدگی کا نہیں، لیکن حضرت علیؓ نے اس کو غلط قرار دیا، اور یہ واضح کیا کہ حکموں کو صلح یا طلاق وخلع کرانے کا حق حاصل ہوگا، اور یہی حکم شرعی ہے۔

ایسے دو حکموں کے اختیارات کی بابت فقہاء کا اختلاف ہے، لیکن اس مقام پر ہم اس موضوع میں پڑنا نہیں چاہتے ہیں، ہمیں حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہ مرد جس نے اپنی بیوی کے ساتھ اختلافات کو اس حد تک بڑھا دیا تھا وہ بھی رشتۂ ازدواج کے خاتمہ پر راضی نہ تھا، اور اس کو کسی بھی طرح بچائے رکھنا چاہتا تھا۔

ایک بات اور توجہ طلب ہے، اس واقعہ میں معاشرہ نے اللہ کے نام پر اس لئے داخل اندازی کی تھی کہ اختلافات کو ختم کرایا جاسکے اور عائلی تعلقات کو برقرار رکھا جاسکے، آج عورت کو اس ایک کلو گوشت کی خاطر طلاق دے دی جاتی ہے، جس کی خریداری پر اس نے رشتہ ازدواج کی برقراری کو معلق کیا ہوتا ہے۔

درحقیقت عورت سے متعلق مسائل کو عقلی، اخلاقی، سماجی اور اقتصادی بحران درپیش ہیں، نیز ان مسائل کی بابت وارد نصوص، علماء کے فتاویٰ اور غلط روایات کے تجزیہ کی بھی ضرورت ہے۔

ہمیں درپیش مسائل کا سنجیدہ مطالعہ کرنا چاہئے، وحی ربانی اور اس میں در آئی غلط باتوں کے درمیان فرق کرتے ہوئے صحیح چیزوں کو قبول اور غلط چیزوں کو مسترد کر دینا چاہئے۔

''خانۂ طاعت'' ایک غلط اجتہاد

[بعض عرب ممالک میں کچھ لوگ شوہر کے گھر کو 'بیت الطاعۃ' (خانۂ طاعت) کہتے ہیں، مترجم]

کتاب وسنت میں خلع کے ثبوت کے باوجود متعدد اصحاب افتاء اس سے تجاہل عارفانہ برتتے ہیں، اور اس کے ذریعہ اسے فسخ یا طلاق مانتے ہوئے رشتۂ ازدواج کو ختم نہیں کراتے، جب کہ بعض لوگ اسے طلاق ضرر کے قبیل سے مانتے ہیں، اور عورت کے جذبات نفرت کو درخور اعتنا نہیں جانتے ہیں۔

خود میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب ''شرعی'' عدالت بیوی کے گھر پولیس والوں کو بھیج کر اسے ''خانۂ طاعت'' جانے اور شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتی تھی، مجبوراً گھر والے اسے کہیں دور لے جاتے تھے تاکہ عدالت کا حکم نافذ نہ ہو سکے۔

میں یہ سب کچھ دیکھتا تو دل ہی دل میں سوچتا کہ کیا اس آیت قرآنی کا ہم نے یہی مطلب سمجھا ہے: ''**أمسكوهن بمعروف أو سرحوهن بمعروف ولا تمسكوهن ضراراً لتعدوا**'' (انہیں اچھی طریقہ سے رکھو، یا اچھی طریقہ سے علاحدگی کرلو، اور انہیں نقصان پہنچانے کے مقصد سے نہ روکے رکھو کہ ان پر ظلم کرو۔)

مجھے سب سے زیادہ نفرت غلط اجتہاد یا مسلکی تعصب کی بنیاد پر پورے اسلام کو ناقابل قبول بنانے کے رویے سے ہے۔

ہم آج ایک ایسے زمانے میں رہ رہے ہیں جس میں ہمارے دین کے عیوب ڈھونڈے جارہے ہیں، اور اس کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ اس نے عورت کی شخصیت کو کوئی

حیثیت نہیں دی ہے، اس کے مادی ومعنوی حقوق ختم کر دیے ہیں، تب بھی ہم کیوں اپنی شریعت کے حکم خلع کو چھوڑے ہوئے ہیں اور یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ عورتوں کو گرفتار کر کے اس گھر میں زبردستی لے جایا جائے گا جس کو وہ ناپسند کرتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ عورتوں کے احساسات کو بالکل لائق توجہ نہیں سمجھتے، ان کا بالکل خیال نہیں کرتے، کیا یہ لوگ وحی ربانی کے نمائندے ہیں؟ ارے! یہ تو نفسیاتی علاج کے قابل لوگ ہیں۔

انصاف پسند عدالت عورت کی خلع کی خواہش کو خاندان اور بچوں کی مصلحت کے پیش نظر کچھ دن کے لئے ٹال سکتی ہے، وہ دونوں کے اہل خانہ کو حکم بنا کر ان کے فیصلہ کا انتظار بھی کر سکتی ہے، لیکن اگر عورت کو علاحدگی پر اصرار ہو، اور اسے جو مال ملا ہوا سے وہ واپس کر دے تو پھر علاحدگی اور اس کے احساسات کا خیال رکھنا لازمی ہے، ہمیں اس کی خواہش کا مخفی سبب دریافت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

آں حضرت ﷺ کو جب حضرت بریرہ کے شوہر پر ترس آیا اور ان کی محبت کی قدر آئی اور آپ نے ان سے کہا کہ وہ اپنے شوہر کے پاس چلی جائیں، تو انھوں نے دریافت کیا آپ ان کے سفارشی بن کر تشریف لائے ہیں یا حکم دے رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں تو بس سفارشی بن کر آیا ہوں، حضرت بریرہؓ نے کہا پھر میں نہیں جاتی، یہ سن کر آں حضرت ﷺ نے نہ ان کو بددین کہا اور نہ ہی انہیں اللہ ورسول کی اطاعت نہ کرنے والا کہا۔

حضرت ثابت بن قیس کی بیوی نے جب خلع کی خواہش ظاہر کی تھی تو ان پر بدزبانی، دراز دستی یا بدسلوکی کا الزام نہیں لگایا تھا، بس یہ کہا تھا کہ وہ انہیں بہت ناپسند کرتی ہیں، اور یہ بھی وضاحت کی تھیں کہ انہیں ان سے کسی طرح کی اخلاقی یا دینی شکایت نہیں ہے، بس وہ انہیں ناپسند کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ازدواجی زندگی کیسے گزر سکتی ہے؟

پولیس والوں کا اس صورت میں کیا دخل؟ اسلام کیسے عورت کو اس گھر میں رہنے پر مجبور کرسکتا ہے جسے وہ اپنے لئے قید خانہ تصور کرتی ہو، اور اس کا باسی (شوہر) اس کے نزدیک نہایت مبغوض ہو۔

اور اگر عورت بطور فدیہ ملا ہوا مال بھی واپس کرنے پر آمادہ ہو تو پھر یہ مال اس سے لے کر آخر اس کی آزادی کا پاس کیوں نہ رکھا جائے گا؟ اور کیا کسی ایسے گھر میں اللہ کے احکام پر عمل ممکن ہے جہاں کی فضا ایسی اختلافات کی ہو؟ اور یہ بالا دستی شوہر کے لئے کیوں کر سامان عزت ہے؟

خلع سے صرف نظر کرنے والے لوگ اس آیت قرآنی کا فہم نہیں رکھتے ہیں: ''**فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به، تلك حدود الله فلا تعتدوها ومن يتعد حدود الله فأولئك هم الظالمون**'' (اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہو کہ یہ دونوں اللہ کی حدود کی پابندی نہ کرسکیں گے تو بیوی کے ذریعہ مال دینے کی صورت میں ان دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا، یہ اللہ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کریں گے تو وہ لوگ ظالم ہوں گے) عورت کے جذبات کو ناقابل اعتنا جاننا اور اسے زبردستی کسی بات پر مجبور کرنا نہ اسلام کا رویہ ہے، اور نہ ہی حقیقی فقہ اسلام کا۔

اسلام پیکر انصاف اور سراپا رحمت ہے، اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ اسلام نے بیوی کو غلام وذلیل بنانے کا حکم دیا ہے تو وہ اللہ ورسول پر افترا پردازی کا مرتکب ہے۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ بعض بدفطرت وکوتاہ نگاہ لوگ اسلام کی ترجمانی کرتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسے لوگ اصحاب علم وتفقہ پر دست تنقید بھی دراز کرتے ہیں، عصر حاضر میں اسلام کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہی لوگ ہیں۔

مرد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کو خلع کے مطالبہ پر مجبور کرے، یعنی بیوی کو

اتنا ستائے کہ وہ بہر قیمت اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے، شیخ سید سابق اپنی مایہ ناز کتاب ''فقہ السنة'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''مرد پر حرام ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس کے حقوق کی ادائیگی نہ کر کے اتنا ستائے کہ وہ عاجز آ کر خلع کر لے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو خلع باطل ہوگا، بدل خلع واپس کیا جائے گا، خواہ خلع عدالت کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہوا ہو۔

یہ حرمت اس لئے ہے تا کہ عورت پر شوہر کی جدائی کا غم اور مالی بوجھ دونوں نہ پڑیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**يا أيها الذين آمنوا لا يحل لكم أن ترثوا النساء كرها ولا تعضلوهن لتذهبوا ببعض ما آتيتموهن إلا أن يأتين بفاحشة مبينة**'' (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ انہیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انہیں دے چکے ہو، الا یہ کہ وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتب ہوں)۔

امام مالک کے نزدیک خلع بطور طلاق مانا جائے گا، اور شوہر پر لازمی ہوگا کہ وہ بیوی کو وہ بدل واپس کرے جو اس نے اپنی بیوی سے لیا ہے۔

لیکن عورت کو اعزاز واکرام سے نوازنے والا اسلام اس بات کو بھی نہایت ناپسند کرتا ہے کہ عورت اس کا استعمال بلا سبب محض بدسلوکی میں کرے، اس لئے کہ مسلم خانوادہ اپنا تربیتی اور سماجی کردار تبھی ادا کرسکتا ہے جب اس کے افراد کے درمیان باہم تعاون، رحم، اور حقوق وذمہ داریوں کی ادائیگی کا تعلق ہو۔

مرد چونکہ سارا دن اہل خانہ کے لئے پریشانی اٹھاتا ہے، اس لئے اس کے اہل خانہ پر لازم ہے کہ اس کے لئے نفسیاتی سکون کا سامان مہیا کر کے اس کے اعصاب کو راحت دیں اور اس پر سے تھکن کے اثرات کا ازالہ کریں۔

اگر عورت خلع کا مطالبہ بلا کسی معقول سبب کے صرف بداخلاقی اور خودغرضی میں کرتی

ہے تو یہ نہایت سنگین گناہ ہے، حدیث نبوی ہے: ’’ جو عورت اپنے شوہر سے بلا کسی سبب کے خلع کرے گی اسے جنت کی خوشبو بھی نہیں ملے گی‘‘، حضرت ابو ہریرہ کی ایک روایت میں ہے (بے سبب) خلع کرنے والیاں منافق خواتین ہیں۔

ہمیں شریعت کے روح ومزاج کو سمجھنا چاہئے، اوراس کے احکام کا علم حاصل کر کے اپنی ذاتی واجتماعی زندگی کی حفاظت کرنی چاہئے۔

طلاق کو بہت جلد واقع قرار دینے کا رویہ

ذاتی عبادتوں میں فقہاء کے اختلاف کی میں زیادہ پرواہ نہیں کرتا ہوں، مثلاً جس کا جی چاہے قرأت خلف الامام کرلے اور جس کا جی چاہے نہ کرے، خاموش رہے، انشاء اللہ دونوں عنداللہ ماجور ہوں گے، ہاں اگر چہ مجھے شوافع کی اس بات سے کوفت ہوتی ہے کہ جب امام سورۂ فاتحہ کے بعد اگلی سورت پڑھ رہا ہوتا ہے، تو وہ سورۂ فاتحہ پڑھنا شروع کرکے ایک شور مچاتے ہیں۔

لیکن ہمیں وہ اختلافات بہت سنگین لگتے ہیں جن کا نشانہ جان وعزت بنتے ہیں، ایسے اختلافات کو ختم کرنے کے لئے حکومت کو کوئی ایک متعین رائے اپناتے ہوئے دخل اندازی کرنی چاہئے۔

مثلاً بعض لوگ عربی خاتون اور عجمی مرد کے درمیان ہونے والی شادی کو فسخ کئے جانے کی رائے رکھتے ہیں (!) بعض حضرات مسلم وغیر مسلم کے درمیان قصاص نافذ کراتے ہیں، بلکہ بعض ایسے بین الاقوامی معاملات میں بھی فقہاء نے خوب تفصیلی کلام کیا ہے جن کا تعلق صلح وجنگ سے ہے۔

ہمارے نزدیک یہ مسائل اجتماعی اجتہاد کا موضوع ہیں، انفرادی اجتہاد کا نہیں، اسی طرح ان موضوعات پر اجتہاد متعدد نقطہ ہائے نظر کی روشنی میں کئے جانے کی گنجائش ہوتی ہے، ہمارے نزدیک ان اختلافات کے اسباب کبھی بھی ختم نہ ہوں گے۔

عائلی مسائل کو ہم اسی مؤخر الذکر قبیل سے مانتے ہیں، ہمارے نزدیک ان مسائل کے سلسلے میں سب سے صحیح اور امت کے لئے مفید ترین رویہ متعدد اجتہادی مسالک میں سے بلا قید

استفادہ ہے، چونکہ طلاق حلال کاموں میں سے اللہ کو سب سے زیادہ مبغوض ہے اس لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم ان آراء کا دائرہ محدود کردیں جو ادنیٰ شبہ پر طلاق کو وقوع پذیر بتاتی ہیں۔

بعض فقہاء کی بابت تو خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی طلاق کا لفظ منھ سے نکالے، یا کسی کی بابت ایسا لگے کہ وہ طلاق دینا چاہ رہا ہے، خواہ ایسا وہم کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو، اور بس وہ فوراً ازدواجی زندگی کے خاتمہ کا فیصلہ سنادیں، شاید یہ حضرات خاندان کے بکھراؤ کے متمنی رہتے ہیں۔

مجھے ابن تیمیہ کی یہ رائے بہت اچھی لگتی ہے کہ انہوں نے طلاق بدعت کو مسترد کرتے ہوئے نصوص شرعیہ اور ان کی حکمتوں پر اپنی گہری نظر کا ثبوت دیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ ان کے متبعین ان کی فقہ کے اس تابناک حصہ پر ان کی زبردست تنقید کرتے ہیں۔

ابن حزم کو روایات کا جو زبردست استحضار تھا اس کی وجہ سے انہوں نے ان بہت سی صورتوں میں طلاق کو واقع نہیں مانا ہے جن میں دیگر حضرات واقع مانتے ہیں، اگرچہ ان کی حد سے متجاوز ظاہریت نے ان سے بعض بڑے مضحکہ خیز فتوے دلوائے ہیں، ایسے ہی فتووں نے امت کو ان کے بے پناہ علم سے استفادہ نہیں کرنے دیا ہے۔

ایسا ہی ان کا فتوی یہ ہے کہ وہ حیض میں دی گئی ایک طلاق کو تو واقع نہیں مانتے ہیں، لیکن تین طلاقوں کو واقع مان لیتے ہیں، کیسا عجیب وغریب اور نصوص کے الفاظ ومعانی سے معارض فتوی ہے۔

یعنی وہ ایک اور دو واروں کو تو مسترد کردیتے ہیں لیکن تین واروں کو قبول کرلیتے ہیں، زوجین کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو حل کرنے کے سلسلے میں اسلام نرم روی چاہتا ہے تاکہ اگر ممکن ہو تو حالات صحیح رخ پر آجائیں، آیت طلاق کے آخری جملہ سے ہر عقل مند یہ سمجھ

سکتا ہے: ''**لا تدری لعل اللّٰہ یحدث بعد ذلک أمرا**'' (تمہیں نہیں معلوم، ہوسکتا ہے کہ اللہ اس کے بعد کوئی نئی صورت پیدا کرے)۔

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد ہے: ''**الطلاق مرتان فإمساک بمعروف أو تسریح بإحسان**'' (طلاق دو مرتبہ دی جائے پھر یا تو اچھے طریقے سے بیوی کو رکھا جائے یا اچھے طریقے سے علاحدگی اختیار کر لی جائے) تین مرتبہ اچھی طریقے سے رکھنے اور تین مرتبہ اچھی طریقے سے علاحدگی کا اختیار ہے، اور آخری علاحدگی ازدواجی زندگی کو ختم کر دیتی ہے، اسے ہی فقہاء بینونت کبریٰ کہتے ہیں۔

اس صورت میں طلاق ایک لمبے عرصے کے بعد یا ساتھ رہنے کی ناکام کوششوں کے بعد واقع ہوتی ہے، ایک ساتھ تین طلاقیں دینا اللہ کے دین کے ساتھ کھلواڑ ہے، جس کی قیمت مؤمنین نے اپنی خوش وخرم زندگی کی صورت میں بڑی قیمتی چکائی ہے۔

ابن حزم نے تین طلاقوں کو معتبر مانے جانے کی وکالت بڑے زور شور سے کی ہے، لیکن اس مسئلہ میں ابن تیمیہ کی رائے زیادہ صحیح اور امت کی مصلحت کا زیادہ خیال رکھنے والی ہے۔

مجھے تو یہ حدیث مرسل بہت پسند ہے، اگر چہ ابن حزم نے اسے غیر مقبول قرار دیا ہے:
''رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا کہ ایک شخص نے ایک ساتھ تین طلاقیں دی ہیں، آپ غصے میں کھڑے ہوگئے، اور فرمایا میرے جیتے جی اللہ کی شریعت کے ساتھ یہ کھلواڑ کیا جائے گا؟؟ ایک شخص نے کھڑے ہوکر عرض کیا: یا رسول اللہ کیا میں اسے قتل نہ کردوں؟ حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ حضرت عمر کو جب کوئی ایسا شخص مل جاتا جس نے تین طلاقیں دی ہوتی تھیں تو وہ اس کے سر پر پٹائی کرتے۔

لیکن ابن حزم نے جمہور فقہاء سے ان بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے جن میں وہ حضرات غیر واضح طریقوں سے طلاق کو واقع مانتے ہیں، اس سلسلہ میں ابن حزم لکھتے ہیں:

''کوئی مرد اپنی بیوی کو اختیار دے دے، تو چاہے وہ علاحدگی اور طلاق کا فیصلہ کرے یا شوہر کے ساتھ رہنے کا، یا کچھ بھی فیصلہ نہ کرے کسی بھی صورت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ اس کے لئے حرام نہیں ہوتی، خواہ وہ ایک ہزار مرتبہ ہی طلاق کا فیصلہ کیوں نہ کرے، یہ حکم اس صورت کا بھی ہے جب شوہر بیوی کو اس کی ذات کے سلسلے میں فیصلہ کا مالک بنا دے۔

ابن حزم یہ بھی لکھتے ہیں:......جس شخص نے اپنی بیوی سے یہ کہا کہ تم میرے اوپر حرام ہو، یا اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا کہ تم میرے لئے میتہ اور خنزیر جیسی ہو، یہ ساری باتیں لا حاصل ہیں، ان کی بنیاد پر بیوی شوہر پر حرام نہیں ہوتی، وہ اس کی بیوی ہی رہے گی، چاہے شوہر اپنے اس جملہ سے طلاق کی ہی نیت کیوں نہ کرے۔

اس موقعہ پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ابن حزم نے اپنی اس رائے کی بنیاد کیا بنائی ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ابن حزم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**یا أیها النبي لم تحرم ما أحل اللّٰه لک؟**'' (اے نبی! جو چیز تمہارے لئے اللہ نے حلال کی ہے اسے تم حرام کیوں قرار دیتے ہو) اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آں حضرت ﷺ کی جانب سے حلال کو حرام قرار دینے پر نکیر فرمائی ہے۔

تحریم کے کچھ طریقے ہیں، جو شارع نے مقرر کردیے ہیں، ان کے علاوہ اگر لوگ تحریم کے لئے کچھ اور طریقے اختیار کریں تو ہم انہیں معتبر نہیں مانیں گے، اس لئے کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اگر کسی نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات ایجاد کی تو وہ غیر مقبول ہے'' اور کسی حلال چیز کا حرام قرار دینا بھی اللہ کے دین میں ایک ایسی نئی چیز ایجاد کرنا ہے جو پہلے سے اس میں نہیں تھی، لہذا یہ عمل غیر مقبول ہوگا......''

آگے چل کر ابن حزم مزید لکھتے ہیں: '' طلاق صرف ان تین مصادر: ''طلاق''، ''سراح''، ''فراق'' یا ان کے مشتقات سے ہی واقع ہوگی۔''

یہ تحدید اچھی ہے، اور رشتہ ازدواج کی بقا کے لئے لگائی جانے والی ہر قید کا ہم استقبال کرتے ہیں، درحقیقت علماء نے رشتہ ازدواج کو ختم کرنے والے حقیقی ومجازی الفاظ کی بابت بہت توسع سے کام لیا ہے۔

یہ توسع شارع کے اس رویہ کے منافی ہے جو اس نے زوجین کے رشتوں میں ہر ممکنہ گنجائش تک اصلاح کے لئے اختیار کیا ہے، ہر ممکنہ لفظ کے ذریعہ خانوادہ کو بکھیر دینے کا رویہ کوئی مناسب رویہ نہیں ہے۔

یہ نہایت غم انگیز تضاد ہے کہ آج کا مسلمان پہلے تو منگنی، مہر، سامان، ہدایا اور شادی وغیرہ میں بہت مال اور وقت خرچ کرتا ہے، بسا اوقات ان سب چیزوں میں کئی برس اور لاکھوں کروڑوں روپئے صرف ہو جاتے ہیں۔

اور اس سب کے بعد اس طرح کی باتیں کرتا ہے کہ اگر اس نے سگریٹ پی تو طلاق، اور پھر سگریٹ پی بھی لیتا ہے، اسی طرح اس کی بیوی اب سگریٹ کی وجہ سے اس کی بیوی نہیں رہتی، اور جس گھر کی تعمیر پر اس نے بہت مال خرچ کیا ہوتا ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

ابن حزم نے طلاق معلق کی تمام قسموں کو غیر معتبر قرار دیا ہے، پچھلے ساٹھ برسوں میں مصر کا قانون ساز ادارہ اس بلا (طلاق معلق) کو روکنے پر مجبور ہو گیا، اور اس نے یہ دفعہ تشکیل دی کہ: ''کسی عمل کے کرنے یا چھوڑنے پر معلق کی گئی طلاق واقع نہیں ہوگی''۔

اس دفعہ کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ: '' قانون ساز ادارہ نے طلاق کے لئے یمین کو ملغیٰ قرار دینے میں بعض احناف، شوافع اور مالکیہ کی رائے کو اختیار کیا ہے، اسی طرح یمین جیسی طلاق معلق کو غیر معتبر قرار دینے میں حضرت علی، قاضی شریح داود ظاہری اور ان کے متبعین کی رائے اختیار کی ہے۔

میں اس میں مزید یہ اضافہ کرسکتا ہوں کہ وہ طلاق جس پر گواہ نہ ہو غیر معتبر ہے، نکاح،

طلاق اور رجوع وغیرہ میں گواہ یکساں طور پر لازم ہیں، ہم مسلمانوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے علمی ذخیرہ میں سے وہ آراء منتخب کریں جو ہمارے معاشرے کی حفاظت کرتے ہوئے اسے افراد کی لغزشوں سے بچائیں۔

اس تمام ذخیرہ سے بے اعتنائی کے رویہ نے ہی عائلی قوانین کو عیسائیت زدہ کرنے کی کوششوں کے دروازے کھولے ہیں۔

طلاق: رشتۂ ازدواج کا عارضی التوا

کبھی فقیہ نص کے ظاہر سے حکم مستنبط کرتا ہے، اور کبھی بعض ایسے دیگر دلائل کی وجہ سے جو اس کی نگاہ میں وزن رکھتے ہیں ظاہر نصوص سے صرف نظر کر لیتا ہے۔

لیکن ایسی فقہی رائے کو دیکھ کر ہم سراپا حیرت واستعجاب بن جاتے ہیں جو نص کے ظاہر ومتبادر کو بلا کسی راجح تر مصلحت یا قوی تر دلیل کے ترک کر کے اختیار کی جاتی ہے۔

عورتوں سے متعلق متعدد مسائل میں یہ بات نظر آتی ہے، اپنے مدعا کی وضاحت کے لئے ہم ذیل میں ایک مثال پیش کر رہے ہیں۔

ازدواجی زندگی کا اختتام باکسنگ کی اصطلاح میں کسی ناک آؤٹ (Knockout) کے ذریعہ نہیں ہو جاتا ہے، اسلام کی نگاہ میں طلاق کا لفظ ازدواجی تعلقات کا عارضی التوا ہے، جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہوتی ہے، یہ لفظ ان تعلقات کو ہمیشہ کے لئے ختم نہیں کر دیتا ہے۔

اسی وجہ سے اسلام ہر وقت اس کلمہ کو پسند نہیں کرتا ہے، بلکہ اس کے لئے اس نے کچھ مخصوص اوقات متعین کئے ہیں۔

پھر اسلامی قوانین کے مطابق اس لفظ کی ادائیگی کے بعد اسلام گھر کے اندر زوجین کو رکھتا ہے تاکہ کوئی صورت بن جائے، جذباتِ جفا ماند پڑیں اور محبت غالب آ جائے۔

اسلام نے زوجین کے اعزہ کو یہ ذمہ داری دی ہے کہ وہ آگے آ کر ان دونوں کے اختلافات ختم کرائیں اور ان دونوں کے درمیان صلح کرا دیں، قرآن مجید کی متعدد آیات اس جانب راہ نمائی کرتی ہیں، سر دست ہم سورۂ طلاق کی پہلی آیت نقل کر رہے ہیں: " **يا أيها النبي إذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتهن واحصو العدة واتقوا الله ربكم لا تخرجوهن**

من بيوتهن ولا يخرجن إلا أن ياتين بفاحشة مبينة وتلك حدود الله ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه لا تدری لعل الله يحدث بعد ذلک أمرا''(اے نبی! جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے لئے طلاق دیا کرو، اور عدت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے، [زمانۂ عدت میں] نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو، اور نہ وہ خود نکلیں، الا یہ کہ وہ کسی صریح برائی کی مرتکب ہوں، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، اور جو کوئی اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے اوپر خود ظلم کرے گا، تم نہیں جانتے، شاید اس کے بعد اللہ [موافقت کی] کوئی صورت بنا دے)۔

آیت مذکورہ بالا کا آخری جملہ عدت کے دنوں میں شوہر کے گھر میں مطلقہ خاتون کے قیام کی حکمت بتاتا ہے، طلاق کے بعد بھی وہ اس کا گھر رہے گا، اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کے لئے محدود وقت کی تخصیص کی کیا حکمت ہے، یعنی طلاق ایام حیض اور ایسے طہر میں کیوں جائز نہیں ہے جس میں زوجین کے درمیان زن وشوہر کے تعلقات قائم ہو چکے ہیں، اس کا ایک متعین وقت ہے جس میں وہ حلال ہوتی ہے، ان ہدایات کی پابندی لازم ہونے پر اس آیت کا یہ جملہ دلالت کرتا ہے: ''**تلک حدود الله**'' (یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔)

ازدواجی زندگی کو ختم کرنے کے طریقہ کی بابت اختیار کیا گیا یہ جملہ ویسا ہی جملہ ہے جس پر آیات میراث کا اختتام ہو رہا ہے: ''**تلک حدود الله ومن يطع الله ورسوله يدخله جنات تجری من تحتها الأنهار خالدين فيها وذلک الفوز العظيم ومن يعص الله ورسوله ويتعد حدوده يدخله نارا خالدا فيها**'' (یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور یہی بڑی کامیابی ہے، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے

گا اسے اللہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا)۔

مسلمانوں کا اجماع ہے کہ کوئی بھی شخص میراث کے حصوں میں سے کچھ بھی تبدیل نہیں کرسکتا، اور جو ایسا کرے گا ہم اس کے اس عمل کو باطل کہیں گے، اور نص کی بیان کردہ اس خداوندی تقسیم کو ہی جاری کریں گے جس کو ''حدوداللہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

احکام طلاق میں ''حدوداللہ'' کا ایک اور پہلو بھی ہے، علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ طلاق کی دو قسمیں ہیں: مسنون و بدعی، حدیث نبوی میں مذکور اور قرآن مجید کی تائید یافتہ مشروع طلاق یہ ہے کہ شوہر بیوی کو ایک طلاق ایسے طہر میں دے جس میں جنسی تعلق قائم نہ ہوا ہو، پھر عورت پوری عدت اسی گھر میں رہے۔ طلاق بدعت وہ طلاق ہے جو حیض میں یا ایسے طہر میں دی جائے جس میں جنسی تعلق قائم ہوا ہو، یا پھر ایک ہی طہر میں ایک سے زائد طلاقیں دی جائیں۔

مؤخر الذکر طریقہ بالاتفاق حرام ہے، یہ بدعت ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس طرح کی طلاق بالکل بے اعتبار قرار دے دی جاتی، اور اس کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کیا جاتا جو نظام میراث میں تبدیلی کرنے والے کے ساتھ کیا جاتا ہے، کہ یہ دونوں حدود اللہ ہیں، اور ان سے تجاوز کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔

لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا، اکثر فقہاء نے طلاق بدعی کو نافذ قرار دیا ہے، اس مسئلہ میں راہ حق اہل سنت میں سے ابن تیمیہ، ابن قیم اور کسی حد تک ابن حزم نیز کچھ متأخر علماء نے اختیار کی ہے، ان حضرات نے اس غلط روش کو غلط قرار دیا ہے۔

طلاق بدعی کو معتبر ماننے سے بے شمار خاندانوں کا شیرازہ منتشر ہوگیا ہے، اور نہایت قابل افسوس واقعات سامنے آئے ہیں، ایک شخص بیوی حاصل کرنے کے لئے لاکھوں روپے صرف کرتا ہے، اور پھر بازار میں کھڑے ہو کر چند روپیوں کے گوشت پر طلاق کی قسم کھالیتا ہے، اور اس طرح خاندان بکھر جاتا ہے۔

ایک فقیہ طلبہ علوم دینیہ کی نصابی کتاب میں لکھتے ہیں: جس نے اپنی بیوی سے کہا تم پر آدھی طلاق تو ایک طلاق ہوگی۔ یہ کیسا کھلواڑ مچا رکھا ہے۔

ابن حزم نے المحلی میں روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام قرار دیا، اس نے اس بابت حمید بن عبدالرحمٰن حمیری سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ نے اپنے نبی سے فرمایا تھا: ''**فإذا فرغت فانصب وإلى ربك فارغب**'' (لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشق میں لگ جاؤ، اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو) اور تم کھلواڑ کرنے والے ہو، جاؤ کھیلو۔

تحلیل وتحریم کا دارومدار لوگوں کی خواہشات یا ان کے فتاویٰ پر نہیں ہے: ''**ولا تقولوا لما تصف ألسنتكم الكذب هذا حلال وهذا حرام لتفتروا على الله الكذب**'' (اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو)۔

میں مسلم خانوادے کے لئے رشد واستقامت کا خواہاں ہوں، ہمیں احکام طلاق پر غور وخوض کرنا چاہئے، کوئی بات اپنی جانب سے نہیں کہنی چاہئے، فقہاء کے اقوال میں سے کتاب وسنت سے قریب تر اور والدین، اولاد اور ان کے مستقبل کی مصلحت کا سب سے زیادہ خیال رکھنے والا قول اختیار کرنا چاہئے۔

مجھے اندازہ ہے کہ کچھ لوگ میری یہ باتیں سن کر آستین چڑھالیں گے تاکہ طلاق بدعی کا علمی مقام باقی رہے۔ ایسے لوگوں کی رضامندی وناراضگی میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مجھے سب سے زیادہ عزیز اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی مصلحتیں ہیں۔

چند رسمیں جن کو چھوڑنا لازمی ہے

اکثر گھروں میں رمضان کا استقبال نہایت پریشانی کے ساتھ کیا جارہا ہے، اس لئے کہ تجارت کساد بازاری کا شکار ہے، کھیتی کو سوکھے نے تباہ کررکھا ہے، قیمتیں بڑھتی چلی جارہی ہیں، اور مسلمانوں کی رسموں نے روزوں کے مہینے کو کھانے پینے کا مہینہ بنادیا ہے، اور اس کے اخراجات دیگر مہینوں سے کہیں زیادہ بڑھا دیے ہیں۔

اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اس سوال کا جواب ہم نہایت واضح الفاظ میں یہ دینا چاہتے ہیں کہ: مسلمانوں کو بے جا اسراف کی اپنی رسموں کو ترک کردینا چاہئے، ماہ عبادت کو عبادت کے رنگ میں رنگ دینا چاہئے، اور ہمارے روزوں میں خواہشات نفس کے خلاف ہمارے جہاد اور استقامت کا عنصر نظر آنا چاہئے۔

جو لوگ سگریٹ نوشی کے عادی ہیں انہیں موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس عادت کو ترک کردینا چاہئے، اگر کرسکیں تو عزم مصمم کے ذریعہ یک لخت اسے چھوڑ دینا چاہئے، ورنہ رفتہ رفتہ چھوڑے کے پکے عزم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہئے۔

جو لوگ پڑھنے میں یا اپنے کاموں میں کمزور ہیں انہیں پڑھنے، غور وفکر کرنے اور ہر کام کو نہایت مفید طرز پر انجام دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔

مسلم گھرانہ اپنے اہل خانہ کے لئے کھانے کی تیاری کی فکر کرتا ہے، لیکن اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ کھانے پینے کی عادت کو فروغ دے یا زیادہ سے زیادہ مزیدار اور مہنگے مہنگے کھانوں کے سلسلے میں احمقانہ مقابلہ کرے۔

جن سیاسی وعسکری حالات کا ہمیں سامنا ہے ان کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ ہم تقشّف کی

عادتیں اپنائیں لذت اندوزی کی نہیں۔

اسلامی تاریخ کے آغاز میں مسلم گھرانے پاکیزہ اخلاق وعبادات کوفروغ دیتے تھے، اوراچھی عادات کواس طرح فروغ دیتے تھے جیسے زمین اچھے بیجوں کوترقی دے کر غلے اور پھل پیدا کرتی ہے۔

نوجوان مردوزن نماز، زکاۃ، حق بات کہنے، وعدوں کا پاس کرنے اورامانت داری کے عادی ہوتے تھے، اس طرح گھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل پیرا پاکیزہ معاشرہ کے لئے پہلی اینٹ کا کردارادا کرتا تھا۔

بچہ ہوش سنبھالتا تو اپنے گھر والوں کو دیکھ کر نماز سیکھ لیتا، اور بڑا ہوتا تو روزے رکھنے لگتا، اورعمر کا بتدائی مرحلہ ہی بعد کے مراحل کی بنیاد ہوتا ہے، اسی لئے ایک شاعر کا کہنا ہے:

إذا المرء أعيته المروءة ناشئا　　　فمطلبها كهلا عليه شديد

(اگرانسان کونوعمری میں اچھے اخلاق نصیب نہ ہوں تو بڑے ہوکران کا حاصل کرنا اس کے لئے نہایت مشکل ہوتا ہے)۔

علم اخلاق کے مطابق انسان کے اندر اچھی صفات اچانک نہیں پیدا ہوتی ہیں، اور نہ ہی عام انسان تمام اچھی صفات سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

وہ گھر جوافرادخانہ کے چارے پانی کا انتظام کرنے ہی میں دن رات لگا تارہے وہاں سے جانور پیدا ہوتے ہیں، اوراخلاق، اطاعت شعاری اور بڑوں کے ادب کا خیال رکھنے والا گھر اچھا انسان پیدا کرتا ہے۔

اگر چہرے حیاء کے آئینہ دار ہوں، زبانیں ادب کی پاسبان ہوں، نشست وبرخاست میں خدا کا خوف اوراس کے احکام پر عمل آوری نمایاں ہو، اور خصائل ذمیمہ سے مکمل دوری برتی جائے تو کیا حسین منظر نامہ ہوتا ہے، بقول شاعر:

وأعرض عن مطاعم قد أراها　　　فأتركها، وفي بطني انطواء
فلا وأبيک ما في العيش خير　　　ولا الدنيا إذا ذهب الحياء
يعيش المرء ما استحيى بخير　　　ويبقى العود ما بقى اللحاء

(بسا اوقات میں بھوکا ہوتا ہوں اور اشیاء خورد ونوش سامنے ہوتی ہیں لیکن میں انہیں چھوتا نہیں، اس لئے کہ وہ زندگی جس میں حیا نہ ہو بے فائدہ ہے۔ انسان جب تک باحیا رہتا ہے اچھی زندگی گزارتا ہے، گویا کہ انسان کے لیے حیا لکڑی کی اس چھال کا کردار ادا کرتی ہے جس کے بغیر لکڑی بھی نہیں رہتی ہے)۔

اس مہینہ میں جو روحانیت، جہادِ نفس اور تلاوت قرآن کا مہینہ ہے، میں رات کے نوافل کی بابت چند احادیث ذکر کرنا چاہتا ہوں، لیکن ان احادیث سے پہلے تمہیدی گفتگو ضروری ہے۔

جب ہم مکتب وثانوی درجات کے طلبہ تھے تو اپنے درسوں کا مذاکرہ بڑی محنت اور دلی رغبت کے ساتھ کرتے تھے، اس کا لازمی تقاضہ یہ تھا کہ ہم رات کا ایک حصہ جاگ کر گزاریں، جس میں ہم وہ چیزیں دوہرالیں، جن کے بھول جانے کا ہمیں ڈر ہو، ہمارے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ ایسا فیل ہونے کے ڈر سے کرتے تھے اور کچھ اعلیٰ نمبرات حاصل کرنے کے لئے۔

لیکن ہم پر بار بار نیند حملہ کرتی تھی، اور ہم اونگنے لگتے تھے، ایسی صورت میں بہت سے طلبہ ٹھنڈے پانی کے نل کے نیچے جا کر کھڑے ہوجاتے تاکہ آنکھوں سے نیند دور ہوجائے اور چستی آجائے۔

ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اگر اس وقت ماہر راہ نما مربی نصیب ہوئے ہوتے تو نہ جانے کتنی کتابیں اور کس کس کے دیوان یاد کر ڈالے ہوتے، نوعمری میں انسان جو کچھ پڑھ لیتا ہے پوری عمر کام آتا ہے۔

اللہ کے نہ جانے کتنے بندے ہیں جو اللہ کے حضور میں حاضری کے لئے بے شمار اعمال

صالحہ کی تیاری کرتے ہیں، یہ اعمال قیامت کے دن ان کو ہر چہار جانب سے نور بن کر گھیر لیں گے شاید راتوں کے نوافل میں قرآن مجید کی تلاوت ان اعمال میں سرفہرست ہوگی۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی ایک حدیث میں آں حضرت کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: ''راتوں کی نفل نمازوں کی پابندی کرو، کہ یہ پچھلی امتوں کے صالحین کی سنت رہی ہے، رب تعالیٰ کے تقرب کا سامان ہے، گناہوں کا ازالہ کرتی ہے، برے اعمال سے روکتی ہے اور جسم کو صحت دیتی ہے''۔

لیکن اس کے لئے زوجین کے باہم تعاون کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے نہیں کہ وہ باری باری نمازیں پڑھیں، بلکہ اس لئے تا کہ ایک ساتھ پڑھیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب کوئی مرد اپنی بیوی کو رات میں اٹھاتا ہے اور پھر وہ دونوں دو رکعت نماز پڑھتے ہیں تو ان کا شمار اللہ کا ذکر کرنے والے بندوں میں کرلیا جاتا ہے''۔

یہ طرز عمل کسی سچے مومن گھرانے کا ہی ہوسکتا ہے، جس کے افراد کے دل یقین وخشوع کی کیفیت سے لبریز ہوں، اور جو اہل خانہ کو شب بیداری پر آمادہ کرے۔

یہ چند رکعتیں اولاد کے حسین مستقبل کی ضامن ہوتی ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں مروی ہے کہ وہ تہجد پڑھ رہے تھے، اور ان کے کم سن صاحب زادے پاس میں سو رہے تھے، آپؓ نے صاحب زادے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا: اے بیٹے یہ نماز تمہاری خاطر ہے، پھر آپ روتے ہوئے یہ آیت تلاوت کرنے لگے، ''**وكان أبوهما صالحا**......'' (اور ان دونوں کے والد نیک تھے۔)

قرآن مجید نے ان شب بیدار تہجد گزاروں اور جنت میں ان کے لئے تیار کئے گئے انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے: ''**تتجافى جنوبهم عن المضاجع يدعون ربهم**

خوفا وطمعا ومما رزقناهم ينفقون فلا تعلم نفس ما أخفى لهم من قرة أعين جزاء بما كانوا يعملون"(ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں، اور کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لئے چھپا کر رکھا گیا ہے اس کی کسی کو خبر نہیں ہے)۔

پھر اس شب بیداری میں پریشانیاں بھی پیش آتی ہیں، بعض دنوں میں سستی اور کاہلی بھی ہونے لگتی ہے، آں حضرت ﷺ نے بتایا کہ ایسی صورت میں زوجین نیند کی لذت کو پانی سے بھگا سکتے ہیں۔

اس حدیث کو ذکر کرنے سے پہلے میں یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ صورت ہر گھر کے لئے مناسب نہیں ہے، اور نہ ہی ہر میاں بیوی کے لئے ممکن ہے، اس عمل کی بنیاد شب بیداری کی رغبت اور دن میں اس پر آپسی اتفاق پر ہے، اسی طرح زوجین کو یہ اطمینان ہونا بھی ضروری ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور میں تضرع وانابت کے لئے اٹھ کر دوسرے کو خوشی ہی ہوگی۔

اس وضاحت کے بعد حدیث ذکر کی جا سکتی ہے، لیکن مجھے نیند کے ماروں کی ناراضگی کا ڈر ہے، آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھ کر خود تہجد پڑھے اور اپنی بیوی کو بھی جگائے، اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرہ پر پانی ڈال دے، اور اللہ اس عورت پر مہربان ہو جو رات کو بیدار ہو کر خود تہجد پڑھے اور اپنے شوہر کو بھی جگائے، اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرہ پر پانی ڈال دے"۔

ایک دوسری روایت میں ہے: "جو شخص رات کو بیدار ہو کر اپنی بیوی کو بھی بیدار کرتا ہے، اور اگر وہ انکار کرتی ہے تو اس کے چہرے پر پانی ڈال دیتا ہے، پھر وہ دونوں رات میں

اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان دونوں کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

آں حضرت ختمی مرتبت ﷺ کے تربیت یافتہ ایسے ہی گھروں نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا تھا، اور اسے زوال کی وادیوں سے نکال کر بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔ ان عظیم ومبارک گھروں سے ان گھروں کو کیا نسبت جو رات میں ٹیلی ویژن پر کھیل تماشے دیکھا کرتے ہیں، اور پھر بستروں پر بے حرکت لاشوں کی طرح پڑ جاتے ہیں، اور جب بیدار ہوتے ہیں تو صرف کھانے پینے یا دنیاوی دوڑ بھاگ کے لئے ہی بیدار ہوتے ہیں۔

آج جب رمضان آتا ہے تو لمبی چوڑی دعوتوں، تفریح کی محفلوں اور گناہوں سے لبریز جدید تمدن کے مظاہر پر ہونے والے خرچوں کی فکریں ساتھ لاتا ہے۔

ہماری امت کو علمی، اخلاقی، صنعتی اور تجارتی شکست کا سامنا ہے، کیا ہم اس خواب غفلت سے بیدار ہوں گے جس نے ہماری فکری وعملی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے ہمیں دیگر امتوں سے پیچھے کر دیا ہے؟

عورتوں کے کپڑے

انسان مرد ہو یا عورت، اس کے لئے کپڑے لازمی ہیں، کپڑے صحت کے لئے ضروری ہیں، انسان اپنے جسم کے جن حصوں کو دوسروں کو دکھانے سے شرماتا ہے یہ ان حصوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں، اس کے علاوہ یہ کپڑے وہ زینت بھی ہوتے ہیں، جس کا تقاضہ فطرت کرتی ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**یا بني آدم قد أنزلنا علیکم لباسا یواری سوآتکم وریشا ولباس التقویٰ ذلک خیر**'' (اے بنو آدم! ہم نے تمہارے اوپر وہ لباس نازل کیا ہے، جو تمہاری ستر پوشی اور زینت کا سامان کرے اور تقوے کا لباس ہی سب سے بہتر ہے) زینت سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کو خوبصورت بنائے، کپڑے دونوں صنفوں (مرد وزن) کے لئے باعث راحت ہیں، لیکن اخلاق ذمیمہ کے پیکر پر پہنے گئے اچھے کپڑوں کی کیا حیثیت؟ انسان باطن کا برا اور ظاہر کا خوبصورت ہو تو اس سے کیا حاصل؟ اسی لئے قرآن مجید نے اس موقع پر تقوے کو بہترین اور پاکیزہ ترین لباس قرار دیتے ہوئے اس کی نصیحت فرمائی۔

آں حضرت ﷺ نے ایک مسلمان کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا (یہ ارشاد گوش شنوا سے سننے کا ہے): ''جو چاہو کھاؤ، جو چاہو پہنو، بس دو باتیں نہ پائی جائیں، ایک اسراف اور دوسرا تکبر''۔ یعنی فضول خرچی اور تکبر سے بچتے ہوئے حلال اشیاء میں سے جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو۔

ڈاکٹرس اکثر امراض کا سبب اشیاء خورد ونوش میں اسراف اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کے استعمال کو قرار دیتے ہیں، درحقیقت اعتدال سراپا خیر ہے، یہ تو کھانے کی بات تھی، لباس کے مسئلہ میں ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ اسراف وتکبر بے پناہ خرچوں کا باعث اور نہ جانے کتنے اخلاق

ذمیمہ اور برے طرز عمل کا سبب بنتے ہیں۔

فوجیوں کے کپڑے شب وروز کے لئے یکساں ہی ہوتے ہیں، ان میں تبدیلی رینکس کی بنیاد پر ہوتی ہے، اس کے برخلاف سول کپڑوں میں زبردست گونا گونی پائی جاتی ہے، بالخصوص عورتوں کے کپڑوں کے ڈیزائن اور رنگوں کی کوئی حد ہی نہیں ہے، کچھ چھوٹے ہیں تو کچھ لمبے، کچھ تنگ ہوتے ہیں تو کچھ کشادہ، اور پھر چاروں موسموں کے طرح طرح کے کپڑے ہوتے ہیں، مزید برآں رات کے الگ لباس ہوتے ہیں، لباس کی دکانوں میں عورتوں کے جذبات اور خواہشات کے موافق نئے نئے طرح کے کپڑے سامنے لانے کا ایک زبردست مقابلہ ہمہ وقت جاری ہے، اس صورت حال پر غور کریے تو اس کے پیچھے یہی دو صفات نظر آئیں گی: اسراف اور تکبر۔

عورت اگر ذی شعور اور پاکیزہ اخلاق کی حامل ہو تو پھر اسے یہ حق ہے کہ وہ خوش رو وخوش لباس نظر آئے، لیکن کیا ہندوستان کی اس ساڑی سے یہ خوش لباسی وجود میں آتی ہے جس میں پیٹ اور کمر کا ایک حصہ بے لباس رہتا ہے، کیا وہ یورپی بکنی جورانوں کے حصے کو بھی نہیں چھپاتی، اور جس میں بیٹھنے کی صورت میں آدھی رانیں برہنہ ہوتی ہیں کیا وہ عورت کے لئے اس زینت کا سامان ہے،؟ سچی بات یہ ہے کہ ان لباسوں کے بنانے والے عورت کے شرف کا خیال نہیں رکھتے، اس کے وقار کو نقصان پہنچاتے ہیں، ان کپڑوں کے ذریعہ بس وہ عورتوں کے خلاف شہوانی جذبات بھڑکاتے ہیں۔

عہد نو کی تہذیب ایسے ہی لباسوں کی دلدادہ ہے، ایک ساحل پر چہل قدمی کرتے ہوئے مجھے ایک جوڑا نظر آیا، مرد تو پوری لمبی پینٹ پہنے ہوا تھا، جب کہ محترمہ وہ ''شارٹ'' زیب تن کئے ہوئے تھیں جس میں سے آدھی رانیں بھی برہنہ تھیں، لباسوں کا یہ فرق کیوں کر ہے؟ کیا اس سے عورت کی بھلائی مقصود ہے؟

کبھی عورت کو بے لباس رکھنا، اور کبھی اسے تنگ و چست لباس پہنانا علماء اخلاق کا کام نہیں ہوسکتا، یہ تو بس جسم فروشوں کا کام ہوسکتا ہے، دونوں صنفوں کی اچھی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ ہم بے لباسی کے یہ لباس زیب تن کرنے والیوں پر نکیر کریں۔

ہمارا کہنا ہے کہ عورت کو اسباب زینت اختیار کرنے کا حق ہے، لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بے حیائی کرتی پھرے، رات کے کپڑے پہن کر دوسروں کی نگاہوں کا مرکز بنے، اسلام اس کی اجازت نہ مردوں کو دیتا ہے اور نہ عورتوں کو، آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''قیامت کے دن اللہ اس شخص کی جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا جو تکبر میں اپنے کپڑوں کو گھسیٹتے پھرے گا،'' انسان اگر خوبصورت جوتوں اور نقش ونگار کئے ہوئے کپڑوں کو اپنے مقام کا معیار قرار دے تو اسے سوائے بچکانہ عقل کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

انسان کو اگر علم واخلاق سے حظ وافر نہ ملا ہو تو خوش لباسی اس کے لئے چنداں مفید نہیں ہے، کپڑوں کا اپنا ایک کردار ہے، انہیں جنسی شہوت بھڑکانے یا مصنوعی مقام حاصل کرنے کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ ان کی بہن حضرت اسماء رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، ان کے کپڑے باریک تھے، آپ نے منہ پھیر لیا اور چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اے اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو بس اس کے جسم میں سے یہ اور یہ دکھنا ہی جائز ہے، صحیح اور حسن احادیث میں اس حدیث کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔

آں حضرت ﷺ نے ایک نوجوان، جن کا نام ضمرہ بن ثعلب تھا، کو دیکھا کہ وہ نہایت اعلیٰ قسم کی دو شاندار چادریں پہنے ہوئے تکبر کے ساتھ چل رہے ہیں، یہ دیکھ کر آپ کو سخت کوفت ہوئی، اور آپ نے فرمایا: اے ضمرہ! کیا یہ کپڑے تمہیں جنت میں لے جائیں گے؟ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا، اور فوراً انہوں نے عرض کیا کہ اگر آپ میرے لئے استغفار کردیں

تو میں انہیں اتارے بغیر بیٹھوں گا نہیں، آپ نے فوراً ان کے لئے اللہ سے معافی کی دعا کر دی، وہ فوراً گئے اور کپڑے اتار دئے''۔

ہم اس زینت کو حرام قرار نہیں دے رہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عنایت کی ہے، ہر انسان کا یہ حق ہے کہ اس کے کپڑے اور چپل خوبصورت نیز اس کی ہیئت کے محافظ ہوں، یہ بالکل ایک الگ چیز ہے، جس کا تکلفات، اسراف، فتنہ انگیزی اور کپڑوں کی بنیاد پر مقابلہ آرائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ بعض عورتوں کے پاس ستر جوڑے کپڑے ہوتے ہیں، بعض لوگوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کچھ خواتین محفل کے درمیان میں جا کر دوسرے کپڑے بدل آتی ہیں، تا کہ اپنے جسم کی طرح طرح سے نمائش کریں، ایسی خواتین لوگوں کو اس بے حیائی کے بجائے اپنے اخلاق اور اپنی شرافت سے کیوں متأثر نہیں کرتی ہیں۔

فضول خرچی کے اس رجحان نے مغربی ممالک میں نہ جانے کتنی صنعتوں کو جلا بخشی ہے، اور بے پناہ مال دیا ہے، اور ہمارے ممالک تہذیبی پسماندگی کے رسوا کن حد تک شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

تہذیب نو کی برتری کے ساتھ ایک ایسی چیز بھی آئی جسے اسلام کسی طرح قبول نہیں کر سکتا ہے، اور وہ یہ کہ عورتیں مردوں کے کپڑے پہنتی ہیں، یہاں تک کہ بسا اوقات تو دونوں صنفوں کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے، یہ وہ مرض ہے جس سے عظیم خواتین ہی محفوظ ہیں۔

انگلینڈ کی وزیر اعظم عالمی قائدین کے درمیان اپنے نسوانی کپڑوں میں اپنا پرس لٹکائے نہایت پر اعتماد نظر آتی ہے، اس کے لئے اس کی صلاحیتیں ہی کافی ہیں۔ دونوں جنسوں کے درمیان فطری فرقوں کو مٹانے کا عمل ایک بے جا کھلواڑ ہے، علم، صلاحیتوں اور اقدار کا فرق وہ فرق ہے جس کو مٹانا ناممکن ہے، اس میدان میں اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر کبھی عورتیں اور کبھی مرد

بازی مارلے جاتے ہیں، اوراس میں کپڑوں کا کوئی کردار نہیں ہے۔

ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ: ''اللہ کی لعنت ہو ان مردوں پر جو عورتوں جیسے کپڑے پہنتے ہیں اوران عورتوں پر جو مردوں جیسی بنتی ہیں''۔

یہ نامناسب طرز عمل ہے، بلکہ شاید یہ ایک قابل علاج نفسیاتی مرض ہے۔ اس کے برخلاف ایمان وعمل صالح کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ رضائے خداوندی کے حصول میں مقابلہ آرائی کا میدان مردوں اور عورتوں کے لئے کھلا ہوا ہے، جس میں زیادہ متقی اور پاکباز فائق ہوتا ہے: ''**من عمل صالحا من ذكر أو أنثى وهو مؤمن فلنحيينه حياة طيبة ولنجزينهم أجرهم بأحسن ما كانوا يعملون**'' (جوکوئی بھی، مرد ہو کہ عورت، اعمال صالحہ کرے گا اور مومن ہوگا ہم اسے پاکیزہ حیات دیں گے اور ایسے لوگوں کو ان کے اعمال سے اچھی جزا ہم ضرور دیں گے)۔

تہذیب نو نے بے حیائی کے اڈے تعمیر کئے ہیں، جن میں شہوت پرست جمع ہوتے ہیں اور جن کے کارناموں سے سیاحوں کا استقبال کرنے والی حکومتیں صرف نظر کرتی ہیں، اس مضمون کے آخر میں تہذیب نو کی اس روش کے حوالے سے ایک سائنسی نکتہ پیش خدمت ہے:

بایولوجی کے ایک ماہر نے مجھے بتایا کہ نباتات وحیوانات میں اعضاء تناسل وتولید بالکل جداگانہ طرز پر ہیں، میں نے پوچھا اس کی تفصیل کیا ہے؟ انہوں نے بتایا: کھیتوں اور باغات میں یہ کام پیڑوں کی بلند شاخوں اور پھولوں کی پتیوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے، آپ کو وہ منظر بڑا دیدہ زیب معلوم ہوتا ہے جب ہوائیں حیات وبقاء کے عناصر ادھر سے ادھر منتقل کرتی ہیں۔ جب کہ حیوانات (بالخصوص انسان) کے اعضاء تناسل وتولید پوشیدہ اور ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں، جن سے نگاہ حیا کرتی ہے۔

میں نے کہا شاید اسی وجہ سے بابا آدم اور دادی حوا اپنے آپ کو پتوں سے ڈھکنے لگے

تھے:’’**فلما ذاقا الشجرة بدت لهما سوآتهما وطفقا يخصفان عليهما من ورق الجنة**‘‘ (پھر جب ان دونوں نے پیڑ میں سے کھالیا تو انکے قابل ستر حصے ظاہر ہوگئے، اووہ دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے ڈھانکنے لگے)۔

یہ سن کر مجھے یہ بھی خیال ہوا کہ آج کے بےحیا نوجوان، انسان سے زیادہ حیوان سے قریب تر ہیں۔

غلط طرز فکر

ہجرت کے بعد مسجد نبوی کے قیام سے لے کر آں حضرتؐ کے انتقال تک عورتیں مسجد میں نماز پڑھتی رہیں، اور ان کے لئے مخصوص دروازہ کبھی بھی بند نہیں کیا گیا، آپؐ کی حیات میں مسجد نبوی کے اندر عورتوں نے تقریباً سترہ اٹھارہ ہزار نمازیں پڑھیں، یہ وہ یقینی و قطعی متواتر ہے جس کی بنیاد پر اخبار آحاد کا اعتبار نہیں رہ جاتا۔

بعض حضرات کا کہنا ہے: اُم المؤمنین حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ: آں حضرتؐ کے بعد عورتوں کا جو حال ہوا اگر وہ آں حضرتؐ کے سامنے ہوا ہوتا تو آپ انہیں مساجد سے روک دیتے، جیسے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا''۔ لہذا اس اور اس جیسی دیگر احادیث کی بنیاد پر عورتوں کو مسجد جانے سے روک دینا لازمی ہے۔

اس کے جواب میں ہمارا کہنا ہے کہ عورتوں کو جو اجازت عہد نبوی میں حاصل تھی وہ خلافت راشدہ میں بھی حاصل رہی، مسجد نبوی میں وہ بکثرت آتی رہیں، اور ان پر نکیر نہیں کی گئی، بلکہ حضرت عمر بن خطاب نے تو رمضان میں حضرت سلیمان بن ابی حثمہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ مسجد کے پچھلے حصہ میں عورتوں کو نماز پڑھائیں، ابن حزم نے حضرت علیؓ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ لوگوں کو رمضان میں تراویح پڑھنے کا حکم دیتے تھے، مردوں کا ایک الگ امام بناتے اور عورتوں کا الگ، حدیث کے راوی عرفجہ کہتے ہیں کہ آپؓ کے حکم پر میں نے عورتوں کی امامت کی تھی۔

امام زہری نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی اہلیہ عاتکہ بنت زید مسجد میں نماز پڑھنے جاتی تھیں، حضرت عمرؓ ان سے کہا کرتے تھے: بخدا تمہیں معلوم ہے کہ مجھے تمہارا مسجد جانا پسند نہیں

ہے، انہوں نے کہا: میں تو تبھی رکوں گی جب آپ روکیں گے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں تو تمہیں نہیں روکوں گا، اور جس دن حضرت عمر پر حملہ ہوا اس دن وہ بھی مسجد میں تھیں۔

مسجد میں عورتوں کی نماز کے خلاف حضرت عائشہؓ کا جو قول نقل کیا گیا ہے، اس پر عمل اوہام کی بنیاد پر اسلامی شعائر کو ملغیٰ قرار دینے کا سلسلہ شروع کردے گا، اور کیا خبر کہ کوئی انسان یہ بھی کہہ دے کہ: اگر آں حضرت ﷺ کو معلوم ہوتا کہ اقامت حدود سے اسلام پر کیسی تہمتیں لگیں گی تو آپ حدود کو ملغیٰ کردیتے۔

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اسلام کے کچھ احکام عہد نبوی کے ساتھ مخصوص تھے، حالات کی تبدیلی سے وہ ملغیٰ ہوجائیں گے، اس لئے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کو اپنی زندگی میں ان کا علم نہیں تھا، اور اسی لئے آپ نے ان حالات کی بابت کوئی حکم نہیں دیا۔

یہ سراپا غلط طرز فکر ہے، اس لئے کہ اللہ کو تو ماضی و مستقبل کا علم حاصل ہے، اور عورتوں کو با جماعت نماز کی اجازت درحقیقت اسی نے دی تھی، اس نے عورتوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ مسجد باوقار اور دل کی اچھی کیفیت کے ساتھ محض عبادت خداوندی کی نیت سے آئیں، کہ وہ کسی مقابلۂ حسن یا فیشن شو میں نہیں جارہی ہیں۔

اور جو عورت حیاء کے تقاضوں کا خیال نہیں رکھے گی اسے مسجد میں داخلہ کی اجازت نہیں ملے گی، یہ اس کے لئے ایک سزا ہوگی، لیکن تمام عورتوں سے اس بنیاد پر مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت سلب کرلینا کہ ان میں سے کوئی بے حیا ہے نہایت ناقابل قبول رویہ ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ عورتوں پر پابندی صرف مسجد کے لئے ہے، ورنہ بازار کی آمد و رفت اور سڑکوں پر چلنے میں کوئی کچھ نہیں کہتا۔

ہماری امت کو جس اخلاقی و تربیتی بحران کا سامنا ہے اس کا سبب متعدد اسلامی معاشروں کا عورتوں کے لئے مسجدوں کو حرام قرار دینا ہے۔

خواتین کو مسجد آنے سے نہ روکیے

ایک سچے مسلمان کا مسجد سے بہت گہرا قلبی رشتہ ہوتا ہے، مسجد اس کا مرکز شوق ہوتی ہے، جہاں وہ صبح وشام کے حسین لمحات گزارتا ہے، وہاں کے پاکیزہ ماحول میں وہ اپنے رب کے حضور عرض ومناجات کرتا ہے، اور اللہ کی تکبیر وحمد کی شعاعیں اس کی روح کو روشن کرتی ہیں، وہاں وہ اپنے جیسے ان لوگوں سے بھی ملتا ہے، جن کے ساتھ وہ ایمانی اخوت اور اطاعت خداوندی کی ڈور میں بندھا ہوا ہوتا ہے۔

مسجدوں کا رشتہ رکھنے والے لوگ اس روئے زمین پر حق وخیر کے جزیرے اور ایسی جائے پناہ ہیں جہاں مؤمنین خود غرضی، شہوت اور دنیاوی مفادات کی مقابلہ آرائی کی فضا سے پناہ لینے، اللہ سے تعلق قائم کرنے اور اخروی فلاح کے لئے آتے ہیں۔

لہذا اگر ان سات طرح کے لوگوں میں جن کو اللہ قیامت کے دن اپنے سایہ میں جگہ دے گا وہ شخص بھی شامل ہو جس کا دل مسجدوں ہی میں لگا رہتا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ زندگی کی دوڑ دھوپ بسا اوقات انسانوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ مسجدوں سے الگ کسی اور مقام پر یا جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ مثلاً چرواہے کو میدان میں، کسانوں کو کھیت میں اور ملازمت پیشوں کو کارخانوں اور دفتروں میں نماز پڑھنی پڑتی ہے۔

ایسی صورت میں جو لوگ مسجد نہیں آپاتے ان کے لئے کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اس لئے کہ یہ لوگ دوسرے فرائض ادا کر رہے ہیں، جن سے فراغت پر مسجد سے ان کا تعلق پھر قائم ہو جائے گا۔

مسجد سے تعلق اور صبح وشام، روز وشب اللہ کی رحمتوں کے حصول میں مرد وزن یکساں

ہیں، لیکن ان دونوں کے درمیان ایک فرق ہے جس کی وضاحت میں کوئی حرج نہیں ہے، اور وہ یہ ہے کہ عورت کی اولین ذمہ داری گھر سے متعلق ہے اور وہ اللہ کے حضور میں گھر کی جواب دہ ہے۔

یہ گھریلو ذمہ داری اس کے لئے فرض ہے، اور جماعت کے ساتھ نماز سنت ہے، اس سنت کی ادائیگی کے لئے گھریلو ذمہ داری سے صرف نظر کر کے شوہر اور بچوں کے مصالح پر آنچ نہیں آنے دینی چاہئے، اسی لئے شارع نے خاندان کی نگہبانی کو جماعت پر ترجیح دی ہے، عورت اپنے شوہر اور اپنی اولاد کے تئیں اپنے واجبات کی تکمیل کر دے تو پھر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا اور زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کی کوشش کرنا اس کا حق ہے، اور اگر وہ اہل خانہ کے حقوق ادا کر دیتی ہے تو پھر مرد کو اسے روکنے کا حق حاصل نہیں ہے، آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد سے نہ روکو''۔

بلاشبہ اگر عورت اپنی گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے مسجد حاضر نہیں ہو پاتی ہے تو اللہ اسے حاضر ہوئے بغیر جماعت کا ثواب دے گا، کہ اس کے اس عذر کی وجہ سے اسے حاضری کا ثواب ملے گا۔

بعض اہل علم کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ جماعت صرف مردوں کے لئے مشروع ہے، عورتوں کے لئے نہیں۔ یہ لوگ عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں مساجد میں عورتوں کی بکثرت حاضری سے چشم پوشی کرتے ہیں، حالانکہ یہ تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔

امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ: میں نے آں حضرت کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اگر تمہاری عورتیں مسجد جانے کی اجازت چاہیں تو انہیں اس سے نہ روکنا''، ان کے صاحب زادے بلال نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم تو اپنی عورتوں کو ضرور روکیں گے، یہ سن کر حضرت عبداللہ بن عمر نے ان کو اتنا سخت سست کہنا شروع کیا جتنا آپ نے کبھی کسی کو نہیں کہا تھا۔ اور کہا میں تم سے رسول اکرمؐ کا ارشاد ذکر کر رہا ہوں اور تم کہتے ہو کہ ہم انہیں ضرور

رکیں گے۔

امام مسلم ہی کی ایک اور روایت میں ہے: رات میں عورتوں کو مساجد جانے سے نہ روکو۔

ظاہر ہے کہ راستوں کو محفوظ بنائے رکھنا اور عبادت کو ہر شبہ سے بالاتر رکھنا معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

اس موقع پر ہم ایک پہلو کی مزید وضاحت کرنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ کہ مساجد کی حاضری کسی فیشن شو یا مقابلۂ حسن کی شرکت نہیں ہے، مسجد کے لئے اٹھنے والے قدم اللہ کو راضی کرنے، آخرت کی کامیابی، شیطان سے پناہ حاصل کرنے اور تقوے کے حصول کے لئے ہی اٹھتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی اہلیہ حضرت زینب کی صحیح روایت میں آں حضرتؐ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے: ''جب تم میں سے کوئی مسجد حاضر ہو تو خوشبو نہ لگائے''۔

خوشبو دو طرح کی ہوتی ہے، ایک وہ جو جراثیم اور بدبو کو ختم کرتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، دوسری قسم کی خوشبو وہ ہوتی ہے جو خوشبو بکھیرتی ہے، اور نگاہوں اور خیالات کو اپنی جاجب متوجہ کرتی ہے، اور یہ ناقابل قبول ہے۔

پھر مساجد عبادت گاہیں ہیں نہ کہ غلط قسم کی ملاقات کے مراکز، اس لئے مسجد جانے والی کسی عورت کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ آگے تک جا کر مردوں کو دیکھے اور انہیں اپنے آپ کو دکھائے، یہ طریقہ مردوں کے لئے بھی حرام ہے، اس معنی کی متعدد احادیث مروی ہیں:'' مردوں کے لئے بہترین صفیں اگلی صفیں اور بدترین صفیں پچھلی صفیں ہیں، اور عورتوں کے لیے لیے بہترین صفیں پچھلی صفیں اور بدترین صفیں اگلی صفیں ہیں۔''

اللہ اپنے بندوں کے لئے تقویٰ، شرافت نیز بدگمانی کے موقعوں سے اجتناب کو پسند

فرماتا ہے، غالبًا اسی بنیاد پر عورتوں کے آنے جانے کے لئے ایک الگ دروازہ خاص کردیا جاتا تھا، حضرت عمر کے بارے میں آتا ہے کہ وہ مردوں کو عورتوں کے دروازے سے آنے سے روکتے تھے۔

ابن حزم نے ان روایات پر کلام کیا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی نماز گھروں میں بہتر ہے، انہوں نے نہایت مضبوط دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ موضوع احادیث ہیں، انہوں نے ان روایات پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ: اگر گھروں میں عورتوں کی نماز بہتر تھی تو آپ ﷺ نے انہیں سردی، گرمی، اور روز وشب میں مسجد آنے کی زحمت کیوں برداشت کرنے دی، آپ ﷺ کا اپنی امت کے ساتھ جو خیر خواہی کا معاملہ تھا کیا وہ اس کی اجازت دیتا تھا؟ اور آپ ﷺ نے آخر کیوں کر عورتوں کو مسجد آنے کے لئے یہ حکم دیا تھا کہ زینت والے کپڑے پہن کر نہ آئیں، کیا آپ انہیں مسجد آنے سے روک نہیں سکتے تھے؟

پھر آں حضرت ﷺ نے عورتوں یہاں تک کہ حائضہ خواتین کو بھی عید کی نماز کے لئے عید گاہ لے جانے کا حکم دیا تھا، اور یہ فرمایا کہ جس کے پاس ''جلباب'' (اوڑھنی) نہ ہو وہ پڑوس سے لے کر جائے۔

اس حکم کی بابت بعض لوگ کہتے ہیں کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے عید کے دن عورتوں کو نکلنے کا حکم اس لئے دیا تھا کہ دشمنوں کو ڈرایا جاسکے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی، تو آپ دوسروں کو ان کی تعداد زیادہ دکھانا چاہتے تھے۔

ابن حزم حدیث کی اس تاویل کی بابت کہتے ہیں کہ یہ بہت سنگین بات ہے، یہ آپ ﷺ پر افتراء اور بے علم کے کہی گئی بات ہے، آں حضرت نے تو اسی حدیث میں اس حکم کی وجہ یہ بتائی ہے: ''تاکہ وہ نیکی کے کام اور مسلمانوں کی دعا میں شریک ہوں''۔ ان لوگوں پر افسوس ہے جو آں حضرت ﷺ کے اس ارشاد کو جھٹلاتے ہیں، اور اپنی رائے سے افترا پردازی کرتے

ہیں، یہ قول غلط ہونے کے علاوہ نہایت ہی بے حیثیت بھی ہے، کہ آں حضرت ﷺ کے سامنے اس وقت کوئی لشکر نہیں تھا جسے آپ ڈراتے، آپ کے دشمن وہاں منافقین اور یہود مدینہ ہی تھے، جو جانتے تھے کہ یہ عورتیں عیدگاہ حاضر ہورہی ہیں۔

درحقیقت مسلم خواتین کو مسجد سے روکنا ایک بدعت سیئہ اور اسلامی معاشرہ کے لئے نہایت بڑی مصیبت ہے، جو جہالت، سوء تربیت اور برے رواجوں کی دین ہے۔

اس صورت حال سے نجات کے لئے آں حضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کے اسوہ کا اختیار کرنا لازمی ہے۔

کیا یہ لوگ جاہلی شریعت کے خواہاں ہیں؟

پیرس کی سڑکوں پر ہونے والے ایک بڑے مظاہرے کی تصویر دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس میں مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی، یہ سب لوگ سزائے قتل کا قانون دوبارہ بنانے کا مطالبہ کررہے تھے، ان کے ہاتھوں میں پلے کارڈ (Placard) تھے جن پر قاتلوں اور شرپسند عناصر کو زندہ رہنے دینے کی مخالفت کا اظہار کیا گیا تھا۔

اس تصویر میں سب سے آگے آگے غصہ سے بھری ہوئی ایک عورت نظر آرہی تھی، میں نے کہا: غالباً یہ عورت اس کم سن بچی کی ماں ہوگی جسے کسی انسان نما درندہ نے اپنی شہوت کا شکار بنا کر قتل کردیا ہوگا۔

اور آج کل وہ جیل میں مزے کررہا ہوگا، عدالت نے اسے دس پندرہ سال کے لئے سزائے قید دے دی ہوگی۔

ایک اور شخص ہاتھ اٹھائے نظر آرہا تھا، مجھے لگا کہ شاید یہ اس پولیس والے کا والد ہوگا جو چور کا پیچھا کرتے ہوئے قتل کردیا گیا ہوگا۔ اور قاتل چور اب اپنے ساتھی کے ساتھ عیش کررہا ہوگا۔

انسانوں نے اپنے لئے جو قوانین وضع کئے ہیں، جنہوں نے سزائے قتل کو ختم کردیا ہے، اور مجرمین کے ساتھ ہمدردی کا ثبوت دیا ہے اب ان کے خراب نتائج نظر آنا شروع ہوگئے ہیں، اس لئے کہ انسانی پہلو سے تو ان قوانین میں خیر وشر اور ظلم وانصاف کی تمیز نہیں ہے اور دینی پہلو سے دیکھئے تو یہ اللہ سے تعلق توڑنے اور بندوں کے فیصلے میں اس کا حق تسلیم نہ کرنے کے مجرم ہیں۔

اگر کوئی غصہ سے بے قابو ہو کر کسی کو قتل کر دے تو ایسے قاتل کے لئے سزائے قتل نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس نے یہ قتل کسی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت نہیں کیا ہے، یہ قانون ہم نے یورپ سے لیا ہے، اب یورپ مزید تنزل کا شکار ہوا اور اس نے سزائے قتل کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اور بعض شکست خوردہ محرومان فکر عربوں کی زبانی آج کل یہی مطالبہ سننے کو مل رہا ہے، ان بیماروں کے پاس نہ ایمان ہے نہ عقل۔

انگلینڈ کی وزیر اعظم نے قاتلوں کے لئے سزائے موت کا قانون دوبارہ بنانا چاہا تھا، لیکن ایوان زیریں نے اسے ناکام کر دیا، یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ایوان زیریں اور ایوان بالا نے تو رضامندی کے ساتھ کی گئی ہم جنسی کی اجازت دے رکھی ہے۔

فطرت جس درجہ فاسد ہو چکی ہے، وحی سے جیسی محرومی ہے اور خواہشات نفس کا جیسا اتباع ہے اس کی وجہ سے ابھی نہ جانے کیسے کیسے عجوبے دیکھنے کو ملیں گے۔

میرے نزدیک یورپ وامریکہ میں یہودیت وعیسائیت کے مذہبی پیشوا اس خطرناک ردعمل کے اصل ذمہ دار ہیں، وہ ہدایت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور وحی الٰہی سے ان کا تعلق مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہو گیا ہے۔

اب 'دس نصیحتوں' اور اس قانون کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے جس کے بارے میں حضرت عیسیٰ نے بتایا تھا کہ وہ اس کو ختم کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں، قصاص ورجم لازمی قرار دینے والا اور فساد وشر کا مخالف یہ قانون اب قصۂ پارینہ ہے۔

اسی لئے قرآن مجید نے اہل کتاب کے بارے میں کہا ہے: "**لا ينها هم الربانيون والأحبار عن قولهم الإثم وأكلهم السحت لبئس ماكانوا يصنعون**" (کیوں ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے؟ یقیناً وہ بہت برابر

کررہے ہیں)

بجائے اس کے کہ یہ لوگ فراموش کردہ شریعت خدواندی کو از سرنو اختیار کرتے مسلمانوں سے بھی یہ مطالبہ کررہے ہیں کہ وہ اس جرم میں ان کے ساتھ شریک ہوجائیں تاکہ کہیں بھی آسمانی شریعت کا فیصلہ نافذ نہ ہو۔

شرعی احکام کو دوبارہ اختیار کرنے کا مطالبہ جب بھی کوئی کرتا ہے یورپ برانگیختہ ہوجاتا ہے، اور یہ دھمکی دیتا ہے کہ رجعت پسندی کی سزا تباہی و بربادی سے دی جائے گی۔

تو کیا یہ جاہلی شریعت کے خواہاں ہیں؟

ہاں! یہ بس جاہلی شریعت کے ہی خواہاں ہیں۔

مغربی خواتین سے شادی

جب اس نے بیرون ملک ہجرت کر جانے کا پکا ارادہ کرلیا تو میں نے اس سے کہا کہ اسے اس سفر سے پہلے ایک مسلم خاتون سے شادی ضرور کر لینی چاہئے، میں نے اس سے کہا: اس طرح تم اپنے دین اور اپنی شرافت کی حفاظت کرلو گے اور ان فتنوں سے بچ جاؤ گے جن کی یورپ وامریکہ کے ہر شہر میں برسات ہے، اور جن سے شاذونادر لوگ ہی محفوظ رہ پاتے ہیں۔

اس نے بہت بے مروتی کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا: اس میں کوئی حرج تو ہے نہیں کہ میں وہاں بے شادی شدہ جاؤں، اور وہاں اپنے لئے مناسب بیوی ڈھونڈ لوں، نہ جانے کتنے مسلمان وہاں کی خواتین سے شادی کر کے سکون کی زندگی گزار رہے ہیں، بعض جانے والوں نے امریکی خاتون سے شادی حاصل کر کے اس شادی کی بنیاد پر ہی وہاں کی شہریت حاصل کر لی، اور اب وہ اس کے فائدے اٹھا رہے ہیں۔

میں نے کہا: ایسے لوگوں نے سود انفع کا نہیں کیا ہے، بلکہ میرے نزدیک تو انہوں نے دین ودنیا دونوں کا خسارہ اٹھایا ہے، مجھے تم جیسوں پر اسی کا خوف ہے، روزی کی طلب میں ہجرت کرنے والے اکثر عرب بلکہ مسلمان احساس کمتری کے شکار ہوتے ہیں، وہ انگریزوں کو بہت اعلیٰ سمجھتے ہیں، اپنی زبان چھوڑ کر ان کی زبان اختیار کرتے ہیں، اپنے طریقے اور اپنے طرز زندگی کو خیر باد کہہ کر ان کے طریقوں اور طرز زندگی کو اپناتے ہیں، اور اس میں اسلام، اس کے شعائر اور اس کے احکام سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے، کچھ ہی دن گزرتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے عقیدہ سے بھی دست بردار ہو جاتے ہیں اور اس سے ان کا برائے نام تعلق رہ جاتا ہے۔

اس نے کہا: بعض مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس سے محفوظ رکھا ہے...... لہذا آپ جو

بات کہہ رہے ہیں اس کا کوئی بھی معقول سبب نہیں ہے۔

میں نے کہا: اسلام نے کتابی خواتین سے شادی کرنے کی اجازت اس مسلمان کو دی ہے جو اپنے دین کو جانتا ہو اس پر عمل پیرا ہو، اور ایسی شرطوں کے ساتھ یہ اجازت مشروط ہے جو آج کل کی اکثر یورپی وامریکی لڑکیوں میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

تم وہاں رزق کے جویا اور غریب الدیار ہوگے، اگر کوئی عورت تم سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگئی تو مجھے ڈر ہے کہ تمہاری اولاد نماز روزہ سے بھی بے بہرہ رہے گی، بلکہ مجھے تو ڈر ہے کہ ایمان سے بھی محروم ہوگی، تمہاری بیوی تمہارے مقابلے میں مضبوط پوزیشن میں ہوگی، اور وہ بچوں کو تمہارے دین سے دور رکھنے کے لئے گردوپیش سے بھی ہر ممکن مدد لے گی۔

پھر یورپ وامریکا کے مردوں کا جو حال ہے اس کی وجہ سے شاید ان کو اہل کتاب کہا بھی نہیں جاسکتا، تورات وانجیل کا لوگوں پر کوئی اثر نہیں رہا ہے، دین کا عملی مظہر صرف اتوار کی چھٹی، کرسمس کی تقریبات، اسلام سے نفرت اور محمد ﷺ کے خلاف زبان درازی کی حد تک رہ گیا ہے۔

شراب نوشی کی تمام حدیں ختم ہوچکی ہیں، جنسی بے راہ روی نے معاشرے پر تسلط قائم رکھا ہے، زنا میں رغبت نہ رکھنے والوں کے لئے ہم جنسی کا دروازہ کھلا ہوا ہے، کہیں ایسا نہ ہو تم ایڈز کے مریض ہو کر واپس آؤ۔

پاک دامن کتابی خواتین سے شادی اس مسلمان کے لئے جائز ہے جو اپنے گھر کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنے اور اپنے بچوں کی تربیت اپنے دین کی تعلیمات کے مطابق کرنے پر قادر ہو، کیا آج وہاں یہ سب ممکن ہے؟؟

بیٹے! میں ہجرت کے جذبات کی قدر کرتا ہوں، اچھے مستقبل کی تمہاری خواہش کا احترام کرتا ہوں، بقول شاعر:

يقيم الرجال المكثرون بأرضهم وترمی النوی بالمقترين المراميا

(مالدار لوگ اپنے وطن میں ہی رہتے ہیں، جب کہ غریبوں کو در در کی خاک چھاننی پڑتی ہے)

لیکن میاں! اس زندگی کے تقاضوں کی خاطر دین فراموش نہ کر دینا، یاد رکھنا کہ تمہاری اسلامیت ہی تمہاری اول و آخر عزت ہے۔

کمزوروں کے بچے برائے فروخت

تہذیب نو نے اپنے مذہبی مخالفوں اور اکثر کمزروں کے ساتھ جس سنگ دلی کا رویہ اختیار کیا ہے اس پر نہایت دیدہ زیب پردہ ڈال رکھا ہے، اسی لئے جب مجھے پچھلے دنوں بعض بڑے ممالک میں بچوں کی تجارت کے بارے میں خبر سننے کو ملی تو بالکل بھی حیرت نہ ہوئی۔

''تیسری دنیا کے بچے برائے فروخت'' کے زیر عنوان ''صحیفة الشعب الجزائرية'' میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق ''فرینکفورٹ'' کی میونسپلٹی ان تنظیموں اور اداروں کی سرگرمیوں پر پابندی لگانے کا ارادہ رکھتی ہے جو تیسری دنیا سے بچے خرید کر انہیں مغربی جرمنی کے خاندانوں کو بیچتی ہیں، غریب ملک سے لے جائے جانے والے بچے کی اوسط قیمت ۱۰۰۷/ڈالر ہے، جب کہ مشرق اقصیٰ سے لے جائے جانے والے بچے کی قیمت ۸۹۰۰/ڈالر ہوتی ہے، مشرق قریب کے بچوں کی قیمت اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور جرمن بچے کی خریداری بھی ۲۶۵۰۰۰/ڈالر میں ہوسکتی ہے، بچوں کی قیمتوں میں فرق ماؤں کے ذریعہ مانگے جانے والے معاوضوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔

خاندانوں کی آبادکاری (!) کے لئے قائم ایسے ہی ایک ادارے نے وضاحت کی ہے کہ وہ اب تک آٹھ بچوں کی خریداری کر چکا ہے، اس ادارے کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ ان کا ادارہ لازمی سنجیدہ کام کرے گا، اس لئے کہ اگر اس کی سرگرمیاں جاری نہ رہ سکیں تو ان بچوں کا مستقبل سوائے ضیاع کے اور کچھ نہیں ہوگا، اس لئے میونسپلٹی کی دھمکی سے وہ اپنے کام سے نہیں رکیں گے، اس بیان کے مطابق ہر بچے کی خریداری پر ڈائریکٹر صرف ۲۰۰ ڈالر لیتا ہے، بقیہ رقم ماں اور ایجنٹ میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ پچھلی صدی تک انگریزی قانون بیویوں کوفروخت کرنے کی اجازت دیتا تھا(!) ہاں، اس نے اس کی قیمت طے کررکھی تھی تاکہ قیمتیں زیادہ نہ ہوجائیں۔

کیا خرید وفروخت کے ان نہایت غم انگیز عقود کا سبب غربت ہے؟ یا مصائب کی تجارت یہاں تک جاپہنچی ہے؟ حدیث نبوی (علی صاحبہ الف الف صلاۃ وسلام) میں ہمیں اس جیسی تمام باتوں پر نکیر ملتی ہے، حضرت ابوایوب انصاری سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ''جس نے ماں اور بچے کو جدا کیا اللہ قیامت کے روز اسے اس کے محبوبوں سے دور کردے گا'' حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ: ''رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی جو ماں اور بیٹے یا بھائیوں کے درمیان جدائی کرائے''، اسلام نے اپنی آمد کے وقت غلامی کو معاشروں میں موجود پایا تھا، اس وقت ہندوستانی، یونانی اور رومن تہذیبیں اس کے لئے باقاعدہ نظام رکھتی تھیں، اور یہودیت وعیسائیت نے اس کو سند جواز دی ہوئی تھی...... اس نے اس کے امکانات کم کرنے اور اس کی برائیوں کوختم کرنے کے لئے نہایت اہم قدم اٹھائے، لیکن یورپی ممالک اب بھی اس کو باقی رکھنے، اس کی تجارت کوفروغ دینے اور افریقہ کے ساحلی علاقوں سے لاکھوں بچوں کو یورپ وامریکہ لے جانے کے لئے بیڑوں کی ترسیل پر مصر ہیں۔

اس کے بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ اپنے گناہوں پر پردہ ڈال کر ہمیں برا بھلا کہتا ہے: لوئس برٹران لکھتا ہے: ''مشرق؟ آپ کو اس کی حقیقت نہیں معلوم! وہ سراپا گندگی، چوری، انحطاط، حیلہ بازی، سخت دلی، تعصب اور حماقت سے عبارت ہے...... جی ہاں مجھے مشرق سے نفرت ہے، ان لوگوں سے نفرت ہے جو سرڈھانکے اور تسبیح پڑھتے رہتے ہیں''۔ (**السراب الشرقی: ۲۸**)

روبردوٹراز لکھتا ہے: ''عصر حاضر میں اسلام کی مثال خشک چشمے کی سی ہے، لہذا اب

مسلمان ہمیں کیا سکھا سکتے ہیں؟ اگر ہم مریض ہیں تو وہ حالت نزع میں ہیں، وہ ایک ناکام تہذیب کے علمبردار ہیں، ان کا دین اور ان کی زبان بانجھ ہیں، مسلمانوں سے بس ہمیں ایک سبق لینا ہے اور وہ یہ کہ ہم ان کے جیسے زوال سے اپنے آپ کو کیسے بچا سکتے ہیں (غربة الشرق: ۸۷)

یہ ہے اہل مغرب کی ہمارے بارے میں رائے، اور یہ ہے ہمارے ساتھ ان کا رویہ، اب ہم ان کا جواب کیسے دیں؟

ہم اپنے آپ کو اور دنیا کو اس سرکشی سے کیسے بچائیں؟

مسلم یتیم بچے

اس روئے زمین کی کوئی آبادی یتیموں سے خالی نہیں ہے، اس لئے کہ موت کا سلسلہ ہمہ دم قائم ہے۔

بعض لوگوں کی وفات باپ بننے سے پہلے ہو جاتی ہے، اور کچھ اپنے پیچھے بے سہارا بچوں کو چھوڑ جاتے ہیں، جنہیں رحم دل کفیل کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔

پہلے میں سمجھا کرتا تھا کہ سب سے زیادہ یتیم مسلمانوں میں ہیں، اس لئے کہ مذہبی جنگوں میں ان کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے، اور انہیں اپنے دین ومذہب سے بے تعلق کرنے کی سازش رچنے والے باز آنے کا نام نہیں لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم إن استطاعوا**'' (اور وہ تم سے مسلسل جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں)۔

پھر مجھے معلوم ہوا کہ ظالمانہ جنگوں کی برکتیں کم نہیں ہیں، دوسری عالمی جنگ میں بچاس ملین افراد قتل کئے گئے تھے، اور علاقائی جنگوں میں مقتولین کا سلسلہ ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتا، اور یتیموں کی تعداد مسلسل بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔

پھر زلزلوں اور سیلابوں نے بھی کھیتیاں تباہ کی ہیں، اور نہ جانے کتنوں کو بیوا اور یتیم بنایا ہے! لہذا اگر دین کمزور حالوں کی نگہبانی، یتیموں کی کفالت، ان کے ساتھ اچھے سلوک اور ان کی مدد کے لئے مال خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے: ''کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرنے والا میرے ساتھ جنت میں یوں ہوگا، اور یہ کہتے ہوئے آپ نے شہادت والی

اور درمیانی انگلی سے اشارہ کیا''۔

ایک دوسری روایت میں ہے: ''جس نے کسی مسلم یتیم کی کھانے پینے کی ذمہ داری لی، اور یہ سلسلہ اس وقت تک رہا جب تک یہ یتیم خود کفیل نہیں ہوگیا تو اس کے لئے جنت یقینی ہوگئی''۔

حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے یتیم کے سر پر محض اللہ کی خاطر ہاتھ پھیرا تو جتنے بالوں پر ہاتھ پھیرا ہر بال کے بدلے میں اسے نیکیاں ملیں گی۔''

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آں حضرت ﷺ سے اپنی سخت دلی کی شکایت کی، آپ نے اس سے فرمایا: ''یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو''، پریشان حالوں کی پریشانیوں میں شریک ہونا اور ان سے قربت بنانے سے ان لوگوں میں توازن آجاتا ہے، جو دنیوی لذتوں اور نعمتوں میں سرمست ہوجاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی خیال رکھنے کی ہے کہ انفرادی کاوشیں اگر چہ بسا اوقات مفید ہوتی ہیں، لیکن اکثر اوقات بالخصوص اس وقت جب محتاجوں کی تعداد بہت بڑھ جائے بے فائدہ رہتی ہیں۔

قحط کی مار جھیل رہے ملکوں میں لاکھوں لوگ بے سہارا ہوگئے، اور بے شمار لوگ موت کے شکار ہوگئے، ایران وعراق کی ایک جنگ میں ہی بے شمار لوگ مارے گئے، لبنان میں جاری خونریزی حبشہ وایرٹیریا کے درمیان ہونے والی جنگ، اور وسط افریقہ کے متعدد ممالک میں جاری جنگوں نے لاکھوں کروڑوں کو یتیم بنادیا ہے؟ ان کا کیا ہوا اور کیا ہوگا؟

مجھے معلوم ہے کہ مشنریز فوراً سامنے آگئے، اور انہوں نے ان کے لئے اسکول اور یتیم خانے قائم کئے، اور خاموشی کے ساتھ وہ کام بھی کئے جس کے لئے وہ ہیں۔

ایک اطالوی مالدار نے تو ایک ہزار سے زیادہ بچوں کو گود لیا، ان بچوں کو اس نے مال

بھی دیا اور اپنا نام بھی۔

مسلمانوں نے کیا کیا؟ کیا محض آیات واحادیث کی تلاوت کرتے رہنے سے کام بن جائے گا، بھوکے کو کھانا اور خوف زدہ کو امن مل جائے گا؟ پریشاں حالوں کی مدد، ان کی زندگی کو مامون بنانے اور ان کے عقائد کی حفاظت کے لئے اجتماعی کاوشوں کی ضرورت ہے۔

فرسودہ فکر اور بے رحم دل ضیاع، بے عزتی اور جہنم کا سب سے مختصر راستہ ہے:

''**ولیخش الذین لو ترکوا من خلفهم ذریة ضعافا خافوا علیهم فلیتقوا الله ولیقولوا قولا سدیدا**'' (لوگوں کو اس بات کا خیال کرکے ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑ دیتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے) پس چاہئے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔

بھائی چارگی نہ کہ گود لینا

عام طور پر لوگ سڑک پر پڑے ہوئے بچے کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ مستقبل میں کوئی اچھا آدمی نہیں بنے گا، یہ نہایت ظالمانہ فیصلہ ہے، اور عقل وشریعت میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

دین نے تمام لوگوں کی طبیعتوں کے بارے میں یہ کہہ کر حقیقت واضح کردی ہے کہ: ''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے''، یہ سڑک پر پڑا ہوا بچہ بھی تمام دیگر لوگوں کی طرح ہی نفسیات لے کر دنیا میں آتا ہے، اور اس میں دوسروں کے مقابلے کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔

اصل چیز وہ ماحول ہے جس میں بچہ پرورش اور مناسب ومفید تربیت پائے، نہ جانے کتنے بے سہارا بچوں کو دیکھا کہ وہ بلند عہدوں پر پہنچے، اور اچھے یا برے حکمراں ہوئے۔

کیا گود لینا ان بچوں کے اچھے مستقبل کی ضمانت ہے جن کو حقیقی ماں باپ چھوڑ گئے، مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنوعی ماں باپ کا فائدہ قائم نہیں رہتا۔

عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف کو اس وقت گود لیا تھا جب انہیں بطور غلام بیچ دیا گیا تھا اور ان کے اہل خانہ کا علم نہیں تھا، پھر جب آپ جوان ہو گئے تو اسی عورت کے اندر اس کی نسوانیت حرکت میں آئی اور مصنوعی مامتا جاتی رہی، اور اس نے چاہا کہ وہ اس نوجوان کی معشوقہ ہو جس کی شکل اور جس کے اخلاق نے اسے فریفتہ کر رکھا تھا۔

کیا گود لئے ہوئے بچے کے اپنے مصنوعی بہن بھائیوں کے ساتھ رہنے سے اچھے نتائج ہوں گے؟

ایسا ہونا مشکل ہے، بلکہ دیگر نئے تعلقات وجود پذیر ہوں گے۔

یہ بات لازمی ہے کہ ایسے بے سہارا بچے کو ایسی نگہداشت ملے جو مادی ومعنوی طور پر اس کے لئے محافظ ہو، لیکن مصنوعی رشتہ پر مبنی اختلاط کے نتیجے میں نا قابل قبول باتیں وجود میں نہیں آنی چاہییں۔

جنسی معاملات میں اہل یورپ کے طرز عمل ہمارے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتے ہیں، مدت دراز سے ڈینمارک نے ہم جنسوں کی آپسی شادی کو صحیح قرار دیا ہوا ہے، اور ان کے درمیان گھریلو معاملات اور نفقہ وغیرہ کا باقاعدہ ایک نظام بنایا ہے، انہیں دین وآخرت کا پاس ہے نہ ناموس وروایات کا خیال۔

اسلام خاندان کو پاکیزہ اور شکوک وشبہات سے محفوظ دیکھنا چاہتا ہے، وہ نسب کو سلامت رکھنا چاہتا ہے، گود لینے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**وما جعل أدعياء كم أبناء كم ذلكم قولكم بأفواهكم والله يقول الحق وهو يهدي السبيل أدعوهم لآبائهم هو أقسط عندالله فإن لم تعلموا آباء هم فإخوانكم في الدين ومواليكم**'' (اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے، یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی برحقیقت ہے، اور وہی صحیح طریقے کی طرف رہنمائی کرتا ہے، منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے، اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں)۔

یہ الگ نظام ہے جس کا نام ہے دینی اخوت وبھائی چارگی اور رفاقت۔

ہم اس نظام کو قائم کرنے، اس کا تعارف کرانے، اس کے نتائج کا اندازہ کرنے اور اس کے راستے سے رکاوٹوں کو دور کرنے میں کیوں ناکام ہیں؟ بے فائدہ بحث ومباحثہ اور کم اہمیت کے حامل فروعی مسائل پر توجہ مبذول کرنے نے ہمیں بہت سے مثبت کاموں سے بے توجہ

کرر کھا ہے۔

غیر معلوم الجنس بے سہارا بچوں کی تعداد ماضی بعید میں یقیناً بہت معمولی تھی، لیکن عصر حاضر میں تو بعض ممالک میں ان کا تناسب قانونی بچوں کے برابر ہوگیا ہے، یہ کثرت ہماری بے عملی کے لئے عذر نہیں ہے، زیادہ بڑی مصیبت کے لئے تیاری کی ضرورت ہے، تا آں کہ اسلام اپنی پاکیزہ تہذیب اور آسمانی تعلیمات کو پھر رائج کر سکے، اس لئے کہ حضرت محمد ﷺ ''رحمۃ اللعالمین'' بنا کر ہی بھیجے گئے تھے۔

مسئلہ جنین کی جنس تبدیل کرنے کا

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہمیں اولاد دیتا ہے، یہ کام وہ اپنے علم وقدرت کے ذریعہ کرتا ہے، قرآن مجید میں اس کا ارشاد ہے: ''...... **يخلق ما يشاء يهب لمن يشاء إناثا ويهب لمن يشاء الذكور أو يزوجهم ذكرانا وإناثا ويجعل من يشاء عقيما إنه عليم قدير**'' (جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے، وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے)۔

اللہ کے بتائے ہوئے جن قوانین پر یہ کائنات چل رہی ہے اور مخلوقات کے معلوم ونامعلوم معاملات جن کے ذریعہ کنٹرول ہوتے ہیں ان قوانین کو دین کی اصطلاح میں اللہ کی مشیئت کہا جاتا ہے۔

عصر حاضر کے سائنس دانوں نے نظام ولادت سے متعلق ایسے کچھ قوانین کا پتہ پالیا ہے، جن سے بچے کی جنس طے ہوتی ہے، یہ سائنس داں اس نظام میں تھوڑی بہت دخل اندازی پر بھی قادر ہو گئے ہیں، اس پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم ایک اخلاقی کمزوری پر گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس اخلاقی کمزوری کے شکار لوگ ماضی میں بھی تھے اور اب بھی ہیں۔

ماضی میں لوگ لڑکی کو ناپسند کرتے تھے، اس کی پیدائش پر تنگ دل ہوتے تھے، جس بیوی کے یہاں لڑکیاں ہی پیدا ہوتی تھیں اس کو ناپسند کرتے تھے، بچپن میں یاد کئے ہوئے وہ اشعار ابھی تک مجھے یاد ہیں جن میں ایک بیوی نے یہ شکوہ کیا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے صرف اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ اللہ نے اسے صرف بیٹیاں دی ہیں، اس بیچاری کا کہنا تھا:

ما لأبي حمزة لا يأتينا　　　يذهب للبيت الذي يلينا

غضبان الا نلد البنينا　　　وليس ذلک في أيدينا

وإنما نأخذ ما أعطينا

(ابوحمزہ میرے پاس کیوں نہیں آتا، اور پڑوس کے گھر میں کیوں جاتا ہے، وہ اس بات پر غصہ ہے کہ میں نے لڑکے پیدا نہیں کئے، یہ ہمارے ہاتھ میں تو نہیں ہے، ہم تو وہ لیتے ہیں جو ہمیں دیا جاتا ہے۔)

لوگ صنف نازک کو اس کے کمزور ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتے ہیں، حالانکہ اس کو کمزور انہوں نے ہی بنایا ہے، انہوں نے ہی اس کے اندر صلاحیتیں پروان نہیں چڑھنے دیں اور اسے مفید نہیں بننے دیا۔

خود میری آنکھوں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب عورت کی تعلیم جرم تھی، اس کا مسجد جانا گناہ تھا، اور دین پسند لوگ اس کے مادی ومعنوی حقوق میں کھلے عام آڑے آرہے تھے۔

ان نادان دینداروں میں سے کچھ آج بھی اسلام کے بارے میں اپنی غلط فہمی اور اپنے غلط انداز پیش کش سے اس پر ظلم ڈھا رہے ہیں اور مجھے برا بھلا کہتے ہیں۔

افسوس کہ آج بھی بہت سے لوگ لڑکی پر لڑکے کو ترجیح دیتے ہیں، جینٹک انجینیر نگ Genetic engineering نامی علم کی وجہ وجود بھی یہی ہے۔

سائنس دانوں کو یقین ہے کہ مرد میں ہی نر و مادہ Sperm (خلیے) ہوتے ہیں، اور اس سلسلے میں عورت کا کوئی کردار نہیں ہوتا ہے، ہاں البتہ بعض زمانی ومکانی حالات (جن کی وضاحت ہم نہیں کرسکتے) ایک جنس کے دوسری جنس پر غالب آنے میں دخل رکھتے ہیں۔

مرد کی منی میں مؤنث خلیوں کو کم کرنے کے تجربے ہو چکے ہیں، اسی طرح کچھ تجربے عورت سے متعلق امور ولادت کی بابت ایسے بھی ہو چکے ہیں جو کسی ایک جنس کے امکانات بڑھا دیتے ہیں، لیکن ابھی تک سائنس داں یقینی نتائج تک نہیں پہنچے ہیں، ان کی کوششیں جاری ہیں۔

اس موقعہ پر جانوروں اور انسانوں کے جنین کی جنس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے موضوع پر عالمی ادارہ صحت میں ہونے والے مباحثہ کی رپورٹ نقل کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا ہے۔

Zoology (علم حیوانات) میں ہونے والے تجربوں میں سائنس دانوں نے متعدد نروں کے مادۂ منویہ کو بہت بڑی تعداد میں جمع کیا اور پھر اس مادہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک میں نر بنانے والے خلیے زیادہ تھے، اور دوسرے میں مادہ بنانے والے خلیوں کی کثرت تھی۔

مصنوعی طریقۂ ولادت Artificial inseminalion میں ان دونوں قسموں کو استعمال کر کے مطلوبہ جنس کا تناسب ۷۰% کیا جاسکتا ہے، حالانکہ دونوں جنسوں کا فطری تناسب تقریباً ۵۰% ہوتا ہے، متعدد پیچیدہ اسباب کی وجہ سے سائنس ابھی تک دونوں طرح کے خلیوں کو مکمل طریقہ پر ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں کر سکی ہے۔

اس حوالہ سے سوال یہ اٹھتا ہے کہ: انسان پر اس تکنیک کے استعمال کی بابت شریعت اسلامی کا موقف کیا ہے؟ اور کیا زوجین کی خواہش پر مذکر یا مؤنث جنین کی پیدا وار کے امکانات بڑھائے جاسکتے ہیں؟ کیا انسانوں کی ایک جماعت میں کسی ایک صنف کو بڑھاوا دیا جاسکتا ہے؟

اگرچہ انسانوں پر اس تجربہ کی تطبیق میں بہت سی پریشانیاں درپیش ہیں، سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ شوہر کے منوی مادہ کو بڑی مقدار میں کیسے جمع کر کے ڈاکٹر کے ذریعہ مصنوعی طریقۂ ولادت انجام پائے گا، اور کس طرح یہ نظام اس فطری مباشرت کے نظام کا قائم مقام ہو جائے گا جس میں مودت، رحمت، سکون اور الفت جیسے ازدواجی زندگی سے مقصود امور پائے جاتے ہیں، لیکن ان پریشانیوں کے باوجود اس طریقہ کی انسانوں پر تطبیق کو ناممکن نہیں کہا جاسکتا ہے۔

کانفرنس کے شرکاء نے اس موضوع پر مباحثہ کیا، اور بعض سوالات رکھے، مثلاً: جنین کی صنف میں چھیڑ چھاڑ کو کیا مشیئت الٰہی میں دخل اندازی مانا جائے گا، اور کیا انسان کو اس بات

کا حق ہے کہ وہ مرد وزن کے تناسب میں فرق لائے، اور کیا یہ بات دین کے خلاف ہے؟

سچی بات یہ ہے کہ اس حوالہ سے جو کچھ بھی کیا جاتا ہے وہ اللہ کی قدرت ومشیئت سے ہی سے تکمیل پذیر ہوتا ہے، اور اس کائنات کے لئے بنائے گئے اللہ کے اسباب وقوانین کی حدود میں ہی ہوتا ہے: ''وما تشاءون إلا أن يشاء الله إن الله كان عليما حكيما'' (اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے، یقیناً اللہ بڑا علیم وحکیم ہے)۔

اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اس کانفرنس میں مباحثے ہوئے، اور آخر میں مندرجہ ذیل تجویز پاس ہوئی:

جنین کی صنف کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اگر امت کے پیمانے پر ہو تو شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہے، لیکن اگر ایسا فرد کے پیمانہ پر ہو تو زوجین کی جنین مذکر یا مؤنث ہونے کی بابت مشروع خواہش کو دستیاب طبی ذرائع کے ذریعہ تکمیل تک پہنچانے کو کانفرنس میں شریک اکثر فقہاء جائز خیال کرتے ہیں، جب کہ دیگر حضرات اس کو ناجائز کہتے ہیں کہ کہیں اس کی وجہ سے صنفوں کا تناسب بگڑ نہ جائے۔

اس سلسلے میں ہمارا کہنا ہے کہ: اگر ہم نے طب کو اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بناتے ہوئے لوگوں کی لڑکے کے تئیں خواہش کی تکمیل شروع کردی تو نتیجہ دنیا کے فوری یا کچھ مدت بعد خاتمہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا، جینٹیک انجینئرنگ میں مہارت حاصل کرنے کے بجائے ہمیں اخلاق ووضع داری کو اختیار کرنا چاہئے، اور اس ارشاد ربانی کو سمجھنا چاہئے کہ ''ولو اتبع الحق أهواءهم لفسدت السماوات والأرض ومن فيهن'' (اور اگر حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو آسمان وزمین اور ان میں پائی جانے والی مخلوقات فاسد ہو جائیں گی)۔

پڑوسی کے حقوق کا خیال رکھئے!

اگر یہ خبر اخبارات نے شائع نہ کی ہوتی اور خبر شائع ہونے کے بعد اس کی بابت تفصیلات منظر عام پر نہ آئی ہوتیں تو میں کبھی بھی اس خبر کو سچ نہ مانتا، ایک عورت کا انتقال ہوا، اور اس کی لاش بستر پر کئی برس تک پڑی رہی اور بڑی عمارت کے رہائش پذیروں میں سے کسی کو بھی اس کے نہ دکھنے کا خیال تک نہیں آیا، اس کی وفات کا علم اس طرح ہوا کہ اس عمارت میں آگ لگ گئی اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں نے لوگوں کو نکالنا شروع کیا۔

تب اس کی بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھیر ملا، یہ بھری پری زندگی کا انجام تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ برسوں تک کسی نے بھی اس عورت کی بابت دریافت تک نہیں کیا، قریب یا دور کے کسی پڑوسی کو اس کے نہ دکھائی دینے کا احساس تک نہیں ہوا، یہ تہذیب جدید کی دین ہے، اب کوئی کسی کو نہیں جانتا، کسی کو کسی کی کوئی فکر نہیں ہے، کوئی ڈیوٹی پر جا کر گھر واپس آتا ہے یا نہیں، پڑوسی کو اس کی بالکل پرواہ نہیں ہوتی ہے۔

اگر ہم عرب ہیں تو عربیت اس طرز زندگی سے شناسا نہیں ہے، اور اگر ہم مسلمان ہیں تو اسلام اسے کسی بھی طرح قبول نہیں کرتا ہے، اس امت کو اس گندی تہذیب نے انسان کے بجائے حیوانات سے قریب تر کر دیا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں انسان اپنے پڑوسی کی عزت اور حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا، بلکہ وہ فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا:

وما ضرنا أنا قليل وجارنا   عزيز وجار الأكثرين ذليل

(یہ بات ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتی کہ ہم کم تعداد ہیں اس لئے کہ ہمارے پڑوسی

مقام ومرتبہ والے ہیں، اور زیادہ تعداد رکھنے والوں کے پڑوسی ذلیل ہیں)۔

ہماری اسلامی روایات کے مطابق پڑوسی اولاد، والدین، اپنے اور سسرالی رشتہ داروں کی طرح ہی ہوتے ہیں، ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے: ''مجھے جبرئیل مستقل پڑوسی کی بابت نصیحت کرتے تھے یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ شاید یہ پڑوسی کو وارث بھی بنادیں گے''۔

اگر ہمارے یہاں بھی یہ حال ہوگیا کہ ایک گھر خوش وخرم ہو اور پڑوس کے گھر میں آفت آئی ہوئی ہو، پہلے گھر والے مست ہوں اور دوسرے گھر والے آہ وبکا کررہے ہوں تو پھر کیا ہوگا؟

قدیم مدنی معاشرہ میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان اختلافات تھے، لیکن پڑوسی کے حق کا خیال تفریق مذہب وملت سے بالاتر تھا، حضرت مجاہدؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے یہاں ایک بکری ذبح کی گئی، وہ گھر تشریف لائے تو انہوں نے دریافت فرمایا: کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کے یہاں گوشت ہدیہ میں بھیجا؟ کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کے یہاں گوشت ہدیہ میں بھیجا؟ میں نے آں حضرت ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''حضرت جبرئیل مجھے مسلسل پڑوس کی بابت ہدایت کرتے تھے، یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ یہ پڑوسی کو وارث بھی بنادیں گے''، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس کی قسم، کوئی بندہ اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے پڑوسی کے لئے (یا آپ نے فرمایا: اپنے بھائی کے لئے) وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ معاشرہ کے باہم مربوط ہونے کا سب سے آسان طریقہ یہ کہ ہر انسان اپنے پڑوسی سے گہرا تعلق رکھے، اس لئے کہ اگر ہر کڑی پاس کی کڑی سے جڑی رہے تو

شیرازہ منتشر نہیں ہوتا ہے، اور امت پڑوسیوں کے مجموعوں کا نام ہی تو ہے؟ اگر ہر پڑوسی اپنے پڑوسی سے وابستہ ہو اور اس کا خیال رکھے تو پھر روئے زمین پر کوئی بھی شخص ضائع نہیں ہوسکتا، ان ہی کڑیوں کو آپس میں اچھی طرح مربوط کرنے کے لئے ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے: ''جو خود تو شکم سیر سوئے اور اس کے علم میں ہو کہ پڑوسی بھوکا ہے تو وہ مجھ پر سچا ایمان نہیں لایا ہے''۔ ایک اور روایت میں ہے: ''وہ سچا مؤمن نہیں ہے جو خود تو شکم سیر ہو جائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔''

اب بتائیے کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کی موت پر برسوں گزر جائیں اور پڑوسی کو علم نہ ہو تو ایسے پڑوسی کا کیا حکم ہوگا؟ اسے آپ کیا کہیں گے، سماجی برائیاں دنیا میں بے شمار ہیں، ان کے خاتمہ کے لئے مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے، ایسی آزمائشوں کے ہی بارے میں ایک حدیث میں کیا خوب کہا گیا ہے: تین لوگ بڑی مصیبت ہیں: ۱- وہ حاکم جو تمہارے اچھے کاموں کی قدر نہ کرے اور برے کاموں کو معاف نہ کرے، ۲- وہ پڑوسی کہ اگر تم میں کوئی خوبی دیکھے تو کسی سے تذکرہ نہ کرے اور اگر برائی دیکھے تو شہرہ کردے، ۳- وہ بیوی جس کے پاس تم ہو تو وہ تمہیں تکلیف پہنچائے اور تم نہ ہو تو تمہارے ساتھ خیانت کرے۔

اللہ ان آزمائشوں سے ہمیں محفوظ رکھے۔

گمراہ فن کار

جب کوئی مشہور گلوکار فحش کلمات کو کسی نغمے میں گا دیتا ہے تو برائی کا ایک بڑا دروازہ کھول دیتا ہے، کافی عرصہ پہلے عبدالوہاب نے ''سیجارۃ وکاس'' (سگریٹ اور جام) کے نغمے گائے تو ان کا لوگوں پر بہت برا اثر پڑا، بعد میں ان نغموں کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔

لیکن شراب کی بابت غزلیہ اشعار ابھی بھی سننے کو ملتے ہیں، مثلاً کیلوباٹرہ کے نغموں میں گلوکار نشہ کی حالت میں گاتا ہے: '' **ليلنا خمر** '' (ہماری رات شراب سے عبارت ہے)

اپنے معشوق کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ: '' **اسمر الجبهة كالخمرة في النور المذاب** '' (یعنی وہ گندمی پیشانی کا ہے بالکل ویسے جیسے بجھی ہوئی لائٹ)

کامال الشناوی نے اپنی موت سے پہلے عبدالوہاب کو اپنا ایک نغمہ لکھ کر دیا تھا جس میں اس نے کہا تھا: ''**قدر أحمق الخطا**''۔ اسی طرح ایمان کی ایک دلیل مہجری شاعر کے ان اشعار کا گانا بھی ہے: ''**جئت ولا أعرف من أين أتيت؟ ووجدت قدامى طريقا فمضيت**'' (میں آیا تو ہوں لیکن کہاں سے یہ مجھے نہیں معلوم؟ میں نے اپنے سامنے راستہ پایا تو میں چلتا گیا) یا جیسے کہ ایک اور گمراہ شاعر نے عامی زبان میں وہی بات کہی ہے جو عبدالوہاب نے آخری نغمہ میں، باربار دہرائی تھی: ''**جايين الدنيا...... مانعرف ليه؟...... ولا رايحين فين...... ولا عاوزين ايه؟**'' (ہم دنیا میں ہم آئے ہیں، لیکن نہیں معلوم کہ کیوں آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ اور ہمارا کیا مقصد ہے؟)

مصری فن کار کو جہاں یہ بات معلوم نہیں ہے کہ وہ اس دنیا میں کیوں آیا ہے، اور اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ وہیں یہودی فن کاروں کو ان سوالوں کا جواب بخوبی معلوم ہے، وہ عربوں کی

آزاد و باعزت زندگی کی آرزوؤں کو قدموں تلے روندتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرتے چلے جارہے ہیں، اور زوردار اہل قلم ان کی ہمت افزائی کررہے ہیں۔ جب کہ عربوں سے ثقافتی جنگ کے ایجنٹس نہایت بے شرمی کے ساتھ فحش فن کی ہمت افزائی کرتے ہوئے پریشان حال امت کو گمراہ کررہے ہیں۔

اگر اسلام کا دفاع تہمت کا سبب ہے، تو تہمت کا دائرہ اتنا وسیع ہونا چاہئے کہ اس کے گھیرے میں شرافت، سنجیدگی اور حق کا ہر داعی آجائے، سیکولر عربوں کی یہی خواہش ہے۔

ایک دن میں نے کہا کہ: کیا یہ ناممکن ہے کہ ہمارے یہاں کا فن کوئی ایک نمونہ بھی ایسا پیش کرے جس سے انتفاضہ کے بہادروں کی مدد ہو، افغانستان کے کامیاب جہاد کے سورماؤں کا تذکرہ زندہ ہو؟ میں نے جدید عربی شعر کا مطالعہ کیا تو ایک پہاڑی بدو کا ایک قصیدہ ملا جس سے ہم یہ کام لے سکتے ہیں، اس میں شاعر کہتا ہے:

قد استرد السبايا كل منهزم   لم تبق في أسرها الاسبايانا

وما رأيت سياط الظلم دامية   الا رأيت عليها لحم أسرانا

ولا نموت على حد الظبا أنفا   حتى لقد خجلت منا منايانا

(ہر شکست خوردہ قوم نے اپنے اسیروں کو چھڑالیا ہے، اب اس کے قید میں صرف ہمارے ہی اسیر ہیں، میں نے جہاں بھی ظلم کے پنجوں کو خون آلود پایا اپنے خاندانوں کا گوشت ان پر ضرور دیکھا، ہمیں باعزت موت نصیب نہیں، یہاں تک کہ موتیں بھی ہم سے شرم کرنے لگی ہیں)۔

ان اشعار کو ایک مرد مغنی کی ضرورت ہے، مرد سے یہاں مراد مذکر نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ہے اخلاق وشرافت کا پیکر اور آخری سانس تک سخت جانی سے مقابلہ کرنے والا مرد۔

کیا ہمارے یہاں کوئی ایسا فن کار ہے؟

کیا ہمیں کوئی ایک ایسی عورت مل سکے گی، جو اپنی قوم کا ماتم چھلنی کلیجہ اور سنجیدگی کے ساتھ نغمہ سنجی کر کے کرے، یا ہمیں بس عاشق کے طویل فراق پر آہ وفغاں کرنے والی عورتیں ہی دستیاب ہیں۔

عالم عرب کی فنی دنیا بدشرست اور گندی ہے، شاید ہی کوئی شاذ ونادر اس حال سے مستثنی ہو۔

افسوس کہ عالم اسلام میں گمراہی کے راستہ پر لے جانے والے ایسے اہل قلم موجود ہیں جو اسلام کے خلاف جنگ، اللہ سے غفلت اور ہر قدیم وجدید پاکیزہ چیز کی مخالفت میں شیطان کے حلیف ہیں، اس لئے کہ وہ سیکولرزم کے پرچم تلے اُس امت کے خاتمہ کی سازشیں کر رہے ہیں جو الحاد وبے حیائی سے دور رہتے ہوئے ایمان وتقوے کے سایہ میں زندگی گزارنا چاہتی ہے۔